1112

تاریخی مقالات

محمد اسلم

فاضل جامعات

پنجاب، ڈرہم، مانچسٹر، کیمبرج

اُستاذ شعبہ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی

باہتمام

ناظم ندوۃ المصنفین سمن آباد، لاہور

Marfat.com

58903

حقوق طباعت بحق مصنف محفوظ

طبع اوّل ـــــ مارچ ۱۹۷۰ء

ناشر ـــــ ناظم ندوۃ المصنفین، لاہور

طابع ـــــ محمد طفیل، مالک نقوش پریس، اردو بازار، لاہور

قیمت ـــــ سات روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ

۱۔ ندوۃ المصنفین، ۹۵۰ این، سمن آباد، لاہور

۲۔ آئینۂ ادب، چوک مینار، انارکلی، لاہور

Marfat.com

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ
کیا سلطان بلبن کی کوئی بیٹی حضرت بابا فرید الدین گنجشکرؒ سے منسوب تھی	۹
فضل اللہ بن روزبہان اصفہانی اور ان کا ایک نادر رسالہ	۳۲
مبلغ الرجال	۶۱
پیر محمد شاہ اور ان کا نادر کتب خانہ	۸۳
شاہانِ مغلیہ کا ذوقِ موسیقی	۹۴
مسلمانوں کی جغرافیائی خدمات	۱۵۰
خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ	۱۶۲
فتوحات فیروز شاہی	۱۷۷
اسلامی ہندوستان میں سکوں پہ شاعری	۲۰۳
اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی میں علماء و مشائخ کا کردار	۲۲۶
مسجد قبا سے تاج محل تک	۲۴۳
مسلمانوں کی طبی خدمات	۲۵۷
داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد	۲۷۸

Marfat.com

عرضِ مصنف

گذشتہ کئی برسوں سے برِّ صغیر پاک و ہند کے علمی و ادبی رسائل میں میرے تحقیقی اور ادبی مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ میرے علم دوست احباب میں سے جناب محمد عبداللہ قریشی اور جناب حکیم محمد موسیٰ امرتسری نے مجھے بارہا مشورہ دیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو ان مقالات کو کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ میری اپنی بھی خواہش تھی کہ ان متفرق مضامین کو نظرِ ثانی کے بعد کتابی صورت میں محفوظ کر لوں لیکن علم کی ناقدری اور علمی کتابوں کی کساد بازاری کے اس دور میں کسی ناشر کو ان مقالات کی اشاعت کے لئے رضامند کرنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ جب سے علمی، ادبی اور دینی کتابوں کی اشاعت کے لئے ہم نے لاہور میں محض توکلاً علی اللہ ندوۃ المصنفین قائم کیا ہے ٹھوس علمی کتابوں کی اشاعت ممکن ہی نہیں بلکہ آسان ہو گئی ہے۔ اس ادارے کی پہلی کتاب "دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر" تھی۔ پانچ ہفتوں کے وقفہ کے بعد دوسری کتاب حاضر ہے۔ اس کتاب میں جو مقالات شامل ہیں ان کو پڑھنے کے بعد ہی ان کی افادیت اور اہمیت کا صحیح اندازہ ہو گا۔

اس کتاب کی طباعت کے دوران جناب شیخ عبدالسلام صاحب اور جناب محمد عبداللہ قریشی نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی ہے۔ میں ان دونوں بزرگوں کا صمیمِ قلب سے ممنون ہوں۔ میں جناب پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب، سابق صدر شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کا خاص طور پہ سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے اپنی علالت اور مصروفیت کے باوجود میرے مقالات کا مطالعہ کیا اور اس کتاب کے لئے ایک عالمانہ تقریظ تحریر فرمائی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ندوۃ المصنفین: لاہور — احقر العباد: محمد اسلم

Marfat.com

انتساب

میں اپنی اس تالیف کو

تاریخ کے شہرۂ آفاق اُستاد

پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب

کے نام

محبت اور عقیدت کے جذبات کے ساتھ

معنون کرتا ہوں

Marfat.com

پیش لفظ

شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے جواں سال استاذ اور تاریخ کے ہونہار طالب علم مسٹر محمد اسلم پاکستان، بھارت اور بیرونی ممالک کے علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ جامعات پنجاب، ڈرہم، مانچسٹر اور کیمبرج کے فارغ التحصیل ہیں۔ ان کی اوّلین تصنیف۔ دینِ الٰہی کے موضوع پر دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ حال ہی میں اس کتاب کا جدید ایڈیشن طویل اضافوں کے ساتھ لاہور سے ندوۃ المصنفین کی اوّلین پیشکش کے طور پر۔ دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر۔ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ دینِ الٰہی ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے اور اس کے متعلق عوام میں خاصی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ دینِ الٰہی کے موضوع پر مسٹر محمد اسلم کی کتاب سے زیادہ مستند کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ فاضل مصنف نے اس کی تالیف کے دوران ایسے بہت سے مخطوطات سے استفادہ کیا ہے جو اب تک مستشرقینِ یورپ اور خود ہمارے تاریخ دانوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں۔ فاضل مصنف کے بعض نظریات سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک مآخذ سے استنباط کا تعلق ہے وہ شک و شبہ سے بالا ہے۔ مصنف نے جس محنت، تجسس اور ذوق و شوق کے ساتھ اس کتاب کے لئے مواد اکٹھا کیا ہے، اور

Marfat.com

پھر اسے جس قرینے کے ساتھ ترتیب دیا ہے وہ اسی کا حصّہ ہے۔

مسٹر اسلم کی تازہ تصنیف "تاریخی مقالات" حال ہی میں قائم ہونے والے ادارے ندوۃ المصنفین کی دوسری پیشکش ہے۔ زیبِ عنوان کتاب عزیز موصوف کے ان مقالات پر مشتمل ہے جو پاکستان اور بھارت کے بلند پایہ علمی و ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مقالات، جن کا بظاہر ایک دوسرے سے کوئی ربط نہیں، اپنے اندر وسیع معلومات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے جہاں مصنف کے تبحر علمی اور وسیع معلومات کا پتہ چلتا ہے وہیں اس صبر آزما محنت اور لگن کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس کے ساتھ عزیز گرامی نے ہمارے گمشدہ علمی اور ثقافتی ورثے کا کھوج لگا کر اپنے قارئین کو نامور مسلم فضلاء اور ان کے علمی کارناموں سے متعارف کرایا ہے۔

مسٹر اسلم تاریخ کے متبحر عالم ہیں اور انہوں نے تاریخ کے مطالعہ کے بعد خود کو مسلمانوں کی اعلیٰ علمی روایات اور تاریخ نگاری کے حقیقی معیار تک پہنچا دیا ہے۔ وہ اپنے نتائجِ فکر کو نہ تو دوسروں پر ٹھونسنے کے عادی ہیں اور نہ ہی وہ اپنے قاری کو اپنا ہم خیال بنانے کی خواہ مخواہ کوشش کرتے ہیں ان کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ نئے حقائق تلاش کریں اور منصفانہ طریقے سے ہماری علمی و ادبی تاریخ کے تاریک گوشوں کو اجاگر کرتے چلے جائیں۔ وہ اس بات کا فیصلہ اپنے قاری پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ خود ان کی ذوق و تجسس کے ساتھ جمع کردہ معلومات اور متوازن تحریروں کی روشنی میں کسی شخص کا علمی مقام متعین کریں۔ اُنھوں نے یہ مقالات بڑے علمی ذوق اور خلوصِ نیت کے ساتھ لکھے ہیں، اس پر طرہ یہ کہ ان کی تحریروں میں شگفتگی بھی پائی جاتی ہے۔

ان مقالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ایک قاری دوگونہ اثر لیتا ہے

Marfat.com

جہاں ایک طرف وہ ان بلند پایہ علمی مقالات سے شاد کام ہوتا ہے وہیں اُسے یہ حسرت رہ جاتی ہے کہ ان موضوعات پر اور زیادہ کیوں نہیں لکھا گیا، حالانکہ یہ موضوع ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پر ایک جامع کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے ان مقالات کے مطالعہ کے بعد جہاں ایک قاری ایک کیف سا محسوس کرتا ہے وہیں وہ تشنگی بھی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس سے کتاب کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے بلکہ یہاں یہ بات مدنظر رکھنی چاہیئے کہ جن رسائل میں یہ مقالات شائع ہوئے ہیں ان میں ہر مضمون کے لئے پتی تلی ہوئی جگہ ہوتی ہے۔ اس لئے ایسے مقالات میں مصنف کے لئے زیادہ تفصیل میں جانے یا اپنی قابلیت کے جوہر دکھلانے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

یہ کتاب جو تیرہ مقالات پر مشتمل ہے، تاریخ، موسیقی، فنِ تعمیر، طب، شاعری، سوانح اور جغرافیہ جیسے موضوعات کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اس اعتبار سے اس کتاب میں ہر شخص کے ذوق کا سامان موجود ہے۔ اس کتاب کا ہر مقالہ اپنی جگہ پر منفرد ہے اور ان کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فاضل مصنف ہر موضوع پر عالمانہ انداز میں لکھ سکتا ہے۔ اس کتاب میں چند مقالات ایسے بھی آئے ہیں جہاں مصنف کے نقطۂ نظر سے اختلاف کی گنجائش ہے، تاہم اس کتاب کا مطالعہ تاریخ کے اساتذہ اور طلباء کے لئے سود مند ہونے کے علاوہ ان میں تحقیق کا ذوق پیدا کرنے میں ممد و معاون ہوگا۔ آخر میں میں فاضل مصنف کو اس کتاب کی اشاعت پر خلوصِ دل سے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

سمن آباد
لاہور

شیخ عبدالرشید

Marfat.com

کیا سُلطان بلبن کی کوئی بیٹی
حضرت بابا فرید الدین گنجشکرؒ سے منسوب تھی؟

سُلطان غیاث الدین بلبن کی بیٹی کے ساتھ بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے عقد کا واقعہ زبان زدِ خلائق ہے۔ اس موضوع پہ راقم السطور نے جو تحقیق کی ہے وہ ہدیۂ قارئین ہے، اس سوال کے جواب کے لئے سب سے پہلے ہم حضرت باباصاحبؒ کے محرمِ راز، سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

فوائد الفواد، حضرت سلطان المشائخؒ کے ملفوظات کا ایک بیش قیمت مجموعہ ہے جسے ان کے فاضل مُرید خواجہ حسن سجزیؒ نے مرتب کیا تھا، اس کتاب کی تاریخی حیثیت ہمیشہ شک و شبہ سے بالا تر رہی ہے۔ چشتیہ نظامیہ سلسلہ سے وابستہ فقراء کے نزدیک اس کا وہی مقام ہے جو سہروردیہ سلسلہ کے درویشوں کے ہاں حضرت ابوحفص شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی عوارف المعارف کا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے زیادہ باباصاحبؒ کا کوئی دوسرا محرم راز نہ تھا تاہم اس ۴۶۳ صفحات کی ضخیم کتاب میں جہاں باباصاحبؒ کے بے شمار فضائل بیان کئے گئے ہیں وہاں سلطان غیاث الدین بلبن کی بیٹی کے ساتھ ان کے

Marfat.com

رشتہ کا اصلاً کوئی ذکر موجود نہیں، اگر ایسا ازدواجی رشتہ موجود ہوتا تو حضرت نظام الدین اولیاؒ اُس کا کبھی نہ کبھی تو ضرور ہی ذکر فرماتے [1]

امیر حسن سجزیؒ کی طرح سیّد محمد مبارک امیر خورد کرمانیؒ بھی حضرت سلطان المشائخؒ کے دامن ارادت سے وابستہ تھے اور اُنھوں نے سیر الاولیاء کے نام سے خواجگانِ چشت کے سوانح پر ۵۶۴ صفحات کی ایک ضخیم کتاب اپنی یادگار چھوڑی ہے، اس کتاب میں بابا صاحبؒ کے حالات ۵۷ صفحہ سے ۹۱ صفحہ تک پھیلے ہوئے ہیں [2]۔ بابا صاحبؒ کے سوانح حیات پر سید امیر خوردؒ نے بڑی سیر حاصل بحث کی ہے اور ان کی زندگی کا کوئی پہلو فاضل مصنف کی نگاہ باریک بیں سے اوجھل نہیں رہا۔ اس کتاب کے اندراجات کے متعلق پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب رقمطراز ہیں :-

"اس کتاب میں بابا فریدؒ کی زندگی کے واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اور ان کے علاوہ ان کے خاندان اور خلفاء کے حالات بھی اس کتاب میں مندرج ہیں، امیر خوردؒ کی معلومات اپنے گھرانے کی یادداشت پر مبنی ہیں یا پھر خواجہ نظام الدینؒ کے ارادت مندوں سے حاصل کی گئی ہیں جنھوں نے اس سرمایہ کو محفوظ کر لیا تھا" [3]

اس کے باوجود اس کتاب میں بابا صاحبؒ اور سلطان بلبن کی بیٹی کے رشتہ کا مطلق کوئی ذکر موجود نہیں۔ حالانکہ امیر خوردؒ نے ان کے بیٹوں، بیٹیوں، پوتوں اور نواسوں تک کے حالات بالتفصیل لکھے ہیں۔

---

[1] امیر حسن سجزی، فوائد الفواد، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء [2] امیر خورد، سیر الاولیاء مطبوعہ دہلی ۱۳۰۲ھ

[3] پروفیسر شیخ عبدالرشید ہسٹوریز آف انڈیا، پاکستان اینڈ سیلون، مطبوعہ لندن ۱۹۶۱ء، ص ۱۳۵

Marfat.com

سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کے جانشین حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے ملفوظات ان کے ایک مرید حمید قلندر نے خیر المجالس کے نام سے مرتب کئے تھے جنھیں استاد گرامی جناب پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بڑے خوبصورت ٹائپ میں علی گڑھ سے شائع کیا ہے۔[۴] ۳۰۷ صفحات کی اس عظیم کتاب میں بھی اس واقعہ کا سرے سے کوئی ذکر ہی موجود نہیں ہے، اگر حضرت نصیر الدینؒ نے ایسی کوئی بات حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی زبان حقیقت بیان سے کبھی سنی ہوتی تو وہ اس کا کبھی نہ کبھی تو اپنی مجلس میں ذکر فرماتے۔

عہد سلطنت کے سب سے نامور مؤرخ ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں سلطان بلبن کے حالات ۱۱۶ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں لیکن اس کتاب میں بھی سلطان بلبن کی بیٹی کے ساتھ بابا صاحبؒ کی نسبت کا کوئی ذکر موجود نہیں۔[۵] اس پر لطف یہ ہے کہ ضیاء الدین برنی حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کے دامن ارادت سے وابستہ تھا اور اگر اس نے کبھی حضرت محبوب الٰہی کی زبان فیض ترجمان سے ایسی بات سنی ہوتی یا کسی اور ذریعہ سے اُسے اس رشتہ کا علم ہوتا تو وہ بڑے فخر کے ساتھ اس کا ذکر کرتا۔ اس کی تاریخ فیروز شاہی بابا صاحبؒ اور سلطان بلبن کی لاتعلقی پہ ایک خاموش گواہ کی حیثیت سے موجود ہے۔

عہد فیروزی کے مشہور مؤرخ شمس سراج عفیف نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف تاریخ فیروز شاہی میں مشائخ چشت کا جا بجا ذکر کیا ہے، فاضل مصنف بابا صاحبؒ

---

[۴] حمید قلندر، خیر المجالس، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۵۹ء

[۵] ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، جلد اوّل، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۲۹-۱۴۶

Marfat.com

کے خلیفۂ اوّل حضرت قطب جمال ہانسویؒ کے جلیل القدر پوتے حضرت قطب الدین منورؒ کا مرید تھا۔ اس نے اپنے مشائخ کے فضائل و مناقب بڑے عمدہ پیرایہ میں بیان کئے ہیں لیکن اس کی ۵۱۶ صفحات کی تاریخ فیروز شاہی بابا صاحبؒ اور سلطان بلبن کی بیٹی کی لاتعلقی پر بہترین گواہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے پیش ہے۔[۵۶]

یحییٰ سہرندی، سلاطین سادات کے عہد کا ایک نامور مورخ ہے اور اس کی تاریخ مبارکشاہی علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس نے اپنی تاریخ میں سلطان بلبن کا ذکر ۳۹ صفحہ سے ۵۲ صفحہ تک کیا ہے لیکن وہ بھی بابا صاحبؒ اور بنتِ بلبن کے رشتے سے بے خبر تھا۔[۵۷]

شیخ جمالی، سلطان سکندر لودھی کے اُستاد اور اکبر کے سب سے پہلے صدر الصدور شیخ گدائی کے والد، اپنے زمانے میں بڑے نامور صوفی اور شاعر ہو گذرے ہیں۔ مولانا جامیؒ کے ساتھ ان کے تعلقات کے سلسلہ میں کئی دلچسپ لطائف تاریخ میں سے اکثر و بیشتر نے سنے ہوں گے۔ شیخ جمالی نے خواجگان چشت کے حالات سیر العارفین میں بڑی محنت سے، اور اگر اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے تو سب سے پہلے، سائنٹیفک طریقہ پر قلمبند کئے ہیں۔ اس کتاب میں بابا صاحبؒ کا ذکر خیر کرتے ہوئے شیخ جمالی رقمطراز ہیں کہ سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں بلبن، جو ان دنوں اُلغ خان کے لقب سے ملقب اور سلطان کا وزیر تھا، چار گاؤں کی جاگیر کا قبالہ لیکر بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؒ نے یہ فرماتے ہوئے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔

---

[۵۶] شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۱ء

[۵۷] یحییٰ سہرندی، تاریخ مبارک شاہی، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۱ء، ص ۳۹ - ۵۲

Marfat.com

"ہر کرا طالب و راغب دانید برسانید"

جو اس سے رغبت رکھتا ہو یا اس کا طالب ہو اُسے پہنچا دو۔

اس موقعہ پہ بھی شیخ جمالی نے کسی ازدواجی رشتہ کا ذکر نہیں فرمایا حالانکہ یہ اس کے بیان کا بہترین موقعہ تھا۔ [۵]

بابر و ہمایوں کے عہد میں چشتیہ سلسلہ میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ بڑے نامور بزرگ ہو گذرے ہیں۔ اور جن مشائخ نے ہمایوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے تحریک چلائی تھی، آپ ان کے علمبردار تھے۔ آپ کے ملفوظات آپ کے صاحبزادے حضرت شیخ رکن الدینؒ نے مرتب کئے تھے، ان میں بھی حضرت بابا صاحبؒ اور بنتِ بلبن کے رشتہ کا کہیں ذکر نہیں آیا [۶]

ملّا نظام الدین احمد، صاحبِ طبقات اکبری و مرتبِ تاریخ الفی اکبر کے عہد میں نامور مؤرخ ہو گذرا ہے۔ اس نے طبقات اکبری میں سلطان غیاث الدین بلبن کا ذکر صفحہ ۸۰ سے صفحہ ۱۰۳ تک کیا ہے۔ بلبن کے اوصافِ حمیدہ کا ذکر کرتے ہوئے ملّا صاحب رقمطراز ہیں [۷]:-

"بصیامِ نفل و قیامِ شب و مواظبت جمع و جماعات و نماز اشراق و تہجد اشتغال داشت و اصلاً بے وضو نبودے و بے حضور علماء و صلحاء دست

سلطان بلبن نفلی روزے رکھنے کے علاوہ رات کو قیام کرتا اور پابندی کے ساتھ نماز جمعہ میں شریک ہوتا تھا۔ وہ نماز باجماعت کا بڑا خیال رکھتا تھا اور

---

[۵] شیخ جمالی، سیر العارفین، قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری نمبر ۵ P II، ورق ۳۷ الف تا ۵۴ ب،

[۶] لطائف قدوسی، مطبوعہ دہلی ۱۳۱۱ھ، تعداد صفحات ۱۰۷

[۷] نظام الدین احمد، طبقاتِ اکبری، جلد اوّل، کلکتہ ۱۹۲۷ء ص ۸۲

Marfat.com

بطعام نبردے، در وقت طعام خوردن
مسائل شرعی از علمائے تحقیق نمودے
و در خانہای بزرگان رفتے و بعد از
نماز جمعہ زیارت مقابر کردے و
در جنازۂ اکابر حاضر شدے و تعزیت
رفتے و پسران و خویشان میت را
بخلعت نوازش فرمودے و وظیفہ
میت بر وارثان او مقرر داشتے و
با چندین حشمت و دبدبہ اگر در عین
سواری خبر یافتے کہ فلان جا مجلس
وعظ است در ساعت فرود آمدے
و تذکیر شنیدے و گریہ کردے۔"

اشراق و تہجد کبھی فوت نہ ہونے دیتا۔
سلطان ہمیشہ باوضو رہتا اور جب
تک علما و صلحا موجود نہ ہوتے وہ کھانے
کو ہاتھ نہ لگاتا۔ کھانے کے دوران بھی
وہ علما سے شرعی مسائل دریافت کیا کرتا
تھا۔ سلطان بزرگانِ دین کے گھروں
میں بھی چلا جاتا اور نماز جمعہ کے بعد وہ
مقابر کی زیارت کو نکل جاتا تھا۔ وہ
بزرگوں کے جنازوں میں شریک ہوتا
اور ان کی تعزیت کے لئے بھی جایا
کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میت کے
بیٹوں اور رشتہ داروں کو کپڑے دیتا
اور مرنے والے کا وظیفہ اس کے وارثوں
کے نام منتقل کر دیتا تھا۔ اس قدر جاہ و
جلال کے باوجود اگر وہ کبھی سوار ہو کر نکلتا اور اسے خبر ملتی کہ فلاں جگہ وعظ ہو رہا ہے تو وہ تھوڑی
دیر کے لئے سواری سے اتر آتا، وعظ سنتا اور رونے لگتا۔

نظام الدین احمد نے اس کے اوصافِ حمیدہ کے ضمن میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ اس نے اپنی دختر نیک اختر ایک درویش کے عقد میں دے دی تھی۔

اسی عہد کے دوسرے نامور اور شہرۂ آفاق مورخ ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ کی تینوں جلدیں میرے پیشِ نظر ہیں۔ جلد اوّل میں سلطان غیاث الدین بلبن کا ذکر ۱۲۷ صفحہ سے ۱۵۷ صفحہ تک پھیلا ہوا ہے[11]۔ ملا صاحب نے

---

۱۱ منتخب التواریخ، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء، ص ۱۲۷ - ۱۵۷۔

بھی سنی العقیدہ اور معتقد فقرار ہونے کے باوجود بابا صاحبؒ کے ساتھ اس کی بیٹی کے رشتہ کا مطلق ذکر نہیں فرمایا۔ حالانکہ ملا صاحب بال کی کھال اتارنے اور رائی کا پہاڑ بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اس کے باوجود اُنھوں نے اس بات کا ذکر اشارۃً بھی نہیں فرمایا۔

ابوالقاسم ہندو شاہ فرشتہ بھی اکبر کا ہم عصر مؤرخ تھا، اس کی تاریخ گلزار ابراھیمی سے، جو عوام میں تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہے، تاریخ کا ہر طالبِ علم واقف ہے، گلزار ابراھیمی میں فرشتہ نے ہندوستان کے اولیائے عظام کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور بابا صاحبؒ کے سوانح حیات نل سکیپ سائز کے ۱۴ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں[۱۲]۔ بابا صاحبؒ کے متعلق فرشتہ کی معلومات ہم میں سے اکثر و بیشتر اشخاص سے کہیں زیادہ ہیں، لیکن اس کے باوجود سلطان بلبن کی بیٹی کے ساتھ بابا صاحبؒ کے رشتہ سے وہ بھی بے خبر تھا۔

ابوالفضل علامی مغل شہنشاہ اکبر کا وزیرِ اعلیٰ اور اپنے زمانے کا بہترین اہلِ قلم تھا، اس کی تصانیف میں سے انشائے ابوالفضل، آئینِ اکبری اور اکبر نامہ اس کی علمیت پر دال ہیں۔

اکبر نامہ ابوالفضل کی بڑی اہم تصنیف ہے جو تین جلدوں میں طبع ہو چکی ہے، ہر چند کہ یہ کتاب عہدِ اکبر کے واقعات پر مشتمل ہے تاہم اس میں بزرگانِ دین کا ذکرِ خیر بھی ضمناً آگیا ہے، اکبر نامہ جلد دوم میں بابا صاحبؒ کا ذکرِ خیر موجود ہے لیکن بنتِ بلبن سے ان کی نسبت کا ذکر موجود نہیں[۱۳]۔

---

[۱۲] فرشتہ، گلزار ابراہیمی، جلد دوم مطبوعہ ۱۸۳۲ء، ص ۷۱۵ - ۷۲۹

[۱۳] ابوالفضل، اکبر نامہ، جلد دوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۹ء، ص ۳۵۹،

Marfat.com

آئین اکبری اس کی دوسری اہم کتاب ہے اس کی تیسری جلد کا انگریزی ترجمہ کرنل ایچ، ایس، جیرٹ نے کلکتہ سے ۱۸۹۴ء میں شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں "اولیائے ہند" کے عنوان سے ابوالفضل نے جن بزرگانِ دین کے سوانح حیات پر قلم اُٹھایا ہے ان میں بابا صاحب کا نامِ نامی بھی موجود ہے[۱۴] لیکن سلطان بلبن کی بیٹی کے ساتھ ان کے رشتہ سے ابوالفضل بھی بے خبر ہے۔ اگر ابوالفضل اکبرنامہ میں یہ بات لکھنی بھول گیا تھا تو آئینِ اکبری میں ہی اس کا ذکر آجانا چاہیئے تھا۔

عبدالباقی نہاوندی، عبدالرحیم خانخاناں کے دسترخوان کرم کا ریزہ چین تھا۔ اس نے اپنے محسن، اس کے آباؤ اجداد، ہم عصر علماء، شعراء اور فضلاء کا ذکر بڑے عمدہ پیرایہ میں کیا ہے۔ اس کی مایہ ناز تصنیف مآثر رحیمی ۱۹۲۴ء میں کلکتہ سے چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں ہندوستان کے قدیم سلاطین کا ذکر بھی موجود ہے اور اس ضمن میں اس نے سلطان بلبن کے سوانح حیات بھی قلمبند کئے ہیں لیکن وہ بھی ایسے رشتہ سے بے خبر تھا[۱۵]

بزرگوں کے سوانح حیات پر شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کی اخبارالاخیار اس پایہ کی کتاب ہے کہ جہانگیر نے بھی اپنی تزک میں اس کتاب کی تصنیف پر شیخ محدثؒ کو خراج تحسین پیش کیا ہے[۱۶] اس کتاب کے بارے میں اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ شیخ محدّثؒ کے بعد آنے والے تمام تذکرہ نویسوں نے اس سے

---

[۱۴] ابوالفضل، آئین اکبری، جلد سوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۴ء ص ۳۶۳ - ۳۶۴،

[۱۵] عبدالباقی نہاوندی، مآثر رحیمی، جلد اول، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۴ء ص ۳۰۵ - ۳۰۶

[۱۶] تزک جہانگیری، (سرسید ایڈیشن) علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۲۸۲۔

Marfat.com

استفادہ کیا ہے۔ اخبار الاخیار میں بابا صاحبؒ کا ذکرِ خیر بھی موجود ہے لیکن بلبن کی بیٹی کے ساتھ ان کی نسبت پر شیخ موصوف بھی خاموش ہیں[۱۷]

محمد غوثی مندوی صاحب گلزار ابرار عہد اکبر و جہانگیر میں مشہور تذکرہ نویس ہو گذرے ہیں۔ گلزار ابرار کا اُردو ترجمہ تو مدّت ہوئی اذکار ابرار کے نام سے شائع ہو چکا ہے، لیکن اصل کتاب ہنوز زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی۔ اس کا ایک بڑا عمدہ قلمی نسخہ جان رے لینڈ لائبریری مانچسٹر میں محفوظ ہے جس کی مائیکرو فلم راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ محمد غوثی نے آٹھ صفحات پر بابا صاحبؒ اور ان کی اولاد اور خلفاء کے حالات درج کئے ہیں اور انہیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی بنتِ بلبن اور بابا صاحبؒ کے رشتہ سے بے خبر تھا[۱۸]۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادے اور جانشین خواجہ محمد معصومؒ کے ایک مرید علی اکبر حسینی اردستانی نے مجمع الاولیاء کے نام سے تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات کی ایک عظیم اور ضخیم کتاب شاہجہان کی تخت نشینی کے چھ سال بعد قلمبند کی تھی۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے جس کی مائیکرو فلم راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ اس کتاب میں بابا صاحبؒ کے سوانح حیات بھی ملتے ہیں لیکن اس رشتہ کا ذکر کہیں موجود نہیں[۱۹] حالانکہ مجمع الاولیاء ایک ایسی کتاب ہے کہ اس میں بعض ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جو صرف سننے میں

---

[۱۷] شیخ عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۵۲-۵۴

[۱۸] گلزار ابرار، فارسی مخطوطہ نمبر ۱۸، جان رے لینڈ لائبریری مانچسٹر، ورق ۲۶ الف تا ۲۹ ب،

[۱۹] مجمع الاولیاء۔ انڈیا آفس لائبریری، مخطوطہ نمبر اتھے ۶۴۵، ورق ۶۵۱ الف تا ۶۵۲ ب،
(مجمع الاولیاء کا ایک مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بھی محفوظ ہے)

Marfat.com

آتے ہیں لیکن پڑھنے میں نہیں آتے۔

مجمع الاولیاء کی تصنیف کے چھ سال بعد ۱۰۴۹ھ میں شہزادہ دارا شکوہ نے بزرگانِ دین کے سوانح حیات پر سفینتہ الاولیاء کے نام سے ایک کتاب مرتب کی، اس میں بھی بابا صاحبؒ کا ذکرِ خیر موجود ہے[۲۰]۔ اگر سلطان بلبن کی کوئی بیٹی بابا صاحبؒ کے حرم میں ہوتی تو شہزادہ دارا شکوہ اس کا ذکر بڑے فخریہ پیرائے میں کرتا۔ یہ بڑے اچنبے کی بات ہے کہ دارا شکوہ نے بابا صاحبؒ اور ان کی رفیقۂ حیات کا مکالمہ نقل کیا ہے جس میں وہ نیک بخت بابا صاحبؒ سے تنگ دستی اور فاقہ مستی کا گلہ کرتی ہے، کم از کم ایسے موقع پر تو دارا شکوہ یہ کہنے میں حق بجانب تھا کہ وہ سلطان بلبن کی بیٹی تھی اور اس نے اچھا وقت دیکھا ہوا تھا اور جب فاقوں تک نوبت پہنچی تو بابا صاحبؒ سے شکوہ کرنے لگی۔

دارا شکوہ کی بہن شہزادی جہاں آرا نے اپنے طور پر خواجگانِ چشت کے سوانح حیات مونس الارواح کے نام سے مرتب کئے تھے، اس کتاب میں بابا صاحب کا ذکرِ خیر آٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے[۲۱]۔ اسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جہاں آرا بھی خواجگانِ چشت سے عقیدت کے باوجود بابا صاحبؒ اور بنتِ بلبن کے رشتہ سے بے خبر تھی۔

عہدِ عالمگیر کے مشہور مؤرخ بختاور خاں کی ریاض الاولیاء بھی اسی سلسلے کی ایک اہم اور ضخیم کتاب ہے۔ یہ کتاب بھی بدقسمتی سے ہنوز طبع نہیں

---

[۲۰] دارا شکوہ، سفینتہ الاولیاء، مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۲ء، ص ۹۶-۹۷،

[۲۱] جہاں آرا، مونس الارواح، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی نمبر ۱۱۹۱/۴ PF III، ورق ۹۰ ب تا ۱۹۴ الف

Marfat.com

ہوئی لیکن اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے، جس کی مائیکرو فلم راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ اس میں باباصاحبؒ کے سوانح حیات بھی مندرج ہیں لیکن بنتِ بلبن کے ساتھ ان کے رشتۂ ازدواج کا ذکر موجود نہیں ہے۔[۲۲]

اسی سلسلے کی ایک کتاب سفینۃ العارفین۔ مرتبہ محمد امان کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے جس کی مائیکرو فلم راقم الحروف کے پاس موجود ہے اس میں باباصاحبؒ کا ذکر خیر موجود ہے لیکن محمد امان بھی بنتِ بلبن کے ساتھ ان کے تعلق سے بے خبر ہے۔[۲۳]

بہرحال سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے تک ساڑھے چار سو سال میں جن مطبوعہ کتبِ تاریخ یا صوفیانہ تذکروں میں جہاں کہیں سلطان بلبن یا باباصاحبؒ کا ذکر خیر آیا ہے۔ وہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔ ان کتابوں میں باباصاحبؒ اور سلطان بلبن کی بیٹی کی نسبت کا کسی نے کھل کر تو کیا اشارۃً یا کنایۃً بھی ذکر نہیں کیا۔ اگر اس مفروضہ میں ذرہ بھر بھی حقیقت ہوتی تو کوئی نہ کوئی تذکرہ نویس اس کا ذکر ضرور کرتا۔ آخر اتنا اہم اور بڑا واقعہ تاریخ نگاروں یا تذکرہ نویسوں کی نظروں سے کیونکر اوجھل رہ سکتا تھا۔

انگریزی عہد میں جب پہلی بار ۱۸۸۴ء میں گزٹیئر آف منٹگمری ڈسٹرکٹ شائع ہوا تو اس میں بھی باباصاحبؒ کا ذکرِ خیر موجود تھا، لیکن اس میں بھی باباصاحبؒ کے سوانح حیات کے ضمن میں فاضل مرتب نے بنتِ بلبن کے ساتھ ان کی

---

[۲۲] ریاض الاولیاء، قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن نمبر اورینٹل ۱۷۴۵، ورق ۵۲ اب تا ۵۳ اب،

[۲۳] سفینۃ العارفین قلمی نسخہ، برٹش میوزیم لندن نمبر اورینٹل ۲۱۳، ورق ۲۲ الف، ۲۲ ب

Marfat.com

نسبت کا کوئی ذکر نہیں کیا [۲۴]

زمانہ حال کے مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام صاحب کا بڑا اونچا مقام ہے۔ آپ نے "آب کوثر" میں بارہ صفحات میں بابا صاحبؒ کے سوانح حیات قلمبند کئے ہیں۔ سلطان بلبن اور بابا صاحبؒ کے تعلقات کے ضمن میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ سلطان بلبن اپنے زمانۂ وزارت میں بابا صاحبؒ کی خدمت میں چار گاؤں کی ایک جاگیر کا پروانہ لے کر حاضر ہوا لیکن بابا صاحبؒ نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ بلبن کی بیٹی کے ساتھ بابا صاحبؒ کی نسبت کا ذکر کرنے کا یہ بہترین موقع تھا لیکن شیخ صاحب بھی اس نسبت کے متعلق خاموش ہیں [۲۵]

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں آرٹیکل "فرید الدین مسعود گنج شکر" موجود ہے اور فاضل مصنف نے بیلیوگرافی میں بے شمار ایسی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کے نام گنوائے ہیں جن میں بابا صاحبؒ کا ذکر خیر موجود ہے، لیکن اُسے بھی ایسی کوئی شہادت نہ مل سکی جس سے یہ ثابت ہوتا کہ بابا صاحبؒ کے نکاح میں سلطان بلبن کی کوئی بیٹی بھی تھی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی ہمارے زمانے میں عہدِ سلطنت کی تاریخ و ثقافت اور چشتیہ خاندان کے بزرگوں پر آخری سند سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب "دی لائف اینڈ ٹائمز آف حضرت فرید الدین گنجشکر"، علی گڑھ سے شائع ہو چکی ہے۔ مشہور مستشرق اور ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر سر ہملٹن گب نے

---

[۲۴] گزٹیئر آف دی منٹگمری ڈسٹرکٹ، مطبوعہ لاہور ۱۸۸۴ء، ص ۱۸۴ - ۱۸۵،

[۲۵] آب کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء، ص ۲۴۶ - ۲۵۸

Marfat.com

کبھی کسی کتاب پر تقریظ نہیں لکھی، لیکن اس کتاب میں پروفیسر خلیق احمد نظامی کی تحقیق و کاوش ملاحظہ کرتے ہوئے انھوں نے پہلی بار اپنا اصول توڑا۔ قارئین کو شاید یہ جان کر مایوسی ہوگی کہ اس کتاب میں بھی کسی ایسی نسبت کا ذکر موجود نہیں ہے۔[۲۶]

"سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" پروفیسر خلیق احمد نظامی کی ایک اور مایۂ ناز تصنیف ہے اور حق تو یہ ہے کہ آج تک اس موضوع پر ایسی پُر مغز کتاب کسی اسکالر کے قلم سے نہیں نکلی۔ اس میں سلطان بلبن کے مذہبی رجحانات کے ضمن میں آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"جواھر مزیدی میں گلشن اولیاء کے حوالے سے یہ روایت درج کی گئی ہے کہ بلبن کی ایک بیٹی کی شادی بابا صاحب سے ہوئی تھی اور بعد کے تذکروں میں اس سلسلہ میں بہت سے قصّے بھی بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن کئی وجوہ کی بنا پر ہم اس روایت کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ اول تو یہ کہ کسی معاصر مؤرخ یا تذکرہ نویس نے اس کا ذکر نہیں کیا، برنی کی تاریخ اور میر خورد کے تذکرہ میں متعدد مقامات ایسے آئے ہیں جہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ روایت کسی حقیقت پر مبنی ہوتی تو وہ اس کا ضرور ذکر کرتے، علاوہ ازیں بابا صاحبؒ کا سلاطین اور امراء کی طرف جو رویہ تھا اس کے پیشِ نظر اس قسم کے رشتہ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"[۲۷]

یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ وہ واقعات جن کا ذکر بلبن کے عہد سے

۲۶؎ خلیق احمد نظامی، دی لائف اینڈ ٹائمز آف حضرت فرید الدین گنج شکر، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۵ء

۲۷؎ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۱۶۷

Marfat.com

سے کہ اورنگ زیب کے عہد تک کسی مؤرخ یا تذکرہ نویس نے نہیں کیا اُن کا ذکر گذشتہ صدی کے اواخر میں شائع ہونے والی کتابوں مثلاً خزینۃ الاصفیا، حقیقتِ گلزارِ صابری، جواہر فریدی اور چراغ الچشت میں موجود ہے، مؤخر الذکر تبلیغی کتابوں میں اکثر و بیشتر ایسے بے سروپا قصّے پڑھنے میں آتے ہیں کہ ان کا ذکر کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ ان کتابوں کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وہ فنِ تذکرہ نویسی کے معیار پر پورا اترتی ہیں۔ ان کتابوں میں فوائد السالکین، راحت القلوب اور افضل الفوائد جیسی وضعی کتابوں کے حوالوں سے بہت سی ایسی باتیں نقل کی گئی ہیں جو حقیقت سے بعید ہیں۔ اسی طرح اُن کے مصنف اکثر جگہ بابا صاحبؒ کی زندگی کا کوئی واقعہ بیان کرتے ہوئے یوں لکھنے کے عادی ہیں کہ "نقل ہے کہ" اور محدّثین کی اصلاح میں ایسا شخص جو روائت بیان کرے لیکن راوی کا نام چھپائے اُسے مدلس کہتے ہیں اور ایسے مصنفوں کے سوانح حیات پر طبقات المدلسین نام کی ایک کتاب موجود ہے۔ اسی طرح ان کتابوں میں افراط و تفریط بھی بہت پائی جاتی ہے بابا صاحبؒ نے بقول امیر خورد اور شیخ محدّثؒ چالیس شب چلہ معکوس کیا تھا۔[۲۰، ۲۱] انیسویں صدی کے تذکرہ نویسوں نے چالیس شب کو پانچ سال پھر بارہ سال اور آخر میں چالیس سال بنا دیا۔

مفتی غلام سرور لاہوری کی خزینۃ الاصفیاء پر سبھی مؤرخ اور تذکرہ نویس اعتماد کرتے ہیں۔ مشہور مستشرق پروفیسر آربری نے اس کتاب کی تعریف میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ یہ صوفیائے کرام کا پہلا تذکرہ ہے جو سائنٹفک

۲۰؎ سیر الاولیاء، ص ۷۰، ۲۱؎ اخبار الاخیار، ص ۵۳،

58903

Marfat.com

طریقہ پہ لکھا گیا ہے۔ مفتی صاحب نے خدا جانے یہ کیسے لکھ دیا ہے کہ سلطان بلبن کی بیٹی ہزبرہ بانو بابا صاحبؒ کے حرم میں تھی۔ مفتی صاحب نے بنتِ بلبن کا نام بھی کہیں سے ڈھونڈ نکالا ہے۔ مفتی صاحب کی خزینۃ الاصفیا جس کی پروفیسر آر بری نے اس قدر تعریف کی ہے، رطب و یابس سے مملو ہے۔ مفتی صاحب کو خود پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں، مثلاً ایک جگہ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ جب داتا گنج بخش علی ہجویریؒ لاہور تشریف لائے تو لوگ حضرت حسین زنجانیؒ کا جنازہ اُٹھائے لیے جا رہے تھے۔[29] دوسرے موقعہ پہ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ داتا صاحبؒ نے بقول بعض سنہ ۴۶۰ھ اور بقول بعض سنہ ۴۶۵ھ میں وفات پائی[30] اور تیسرے موقع پہ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت حسین زنجانیؒ کا انتقال سنہ ۶۰۰ھ میں ہوا۔[31] یعنی داتا صاحب کی وفات کے ۱۴۰ یا ۱۳۵ سال بعد جب خزینۃ الاصفیاء میں اس طرح کی روایات عام ہوں تو اس پہ کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

اسی سلسلہ میں سیر الاقطاب مصنفہ شیخ الہدیہ چشتی کا ذکر بیجا نہ ہوگا۔ اس کتاب میں بابا صاحب کا ذکر چیز سترہ صفحات پہ پھیلا ہوا ہے۔ مصنف دیباچہ میں رقمطراز ہے کہ اس نے یہ کتاب "سن ستہ و ثلثین و الف (۱۰۳۶) میں حضرت ابو المظفر شہاب الدین محمد صاحب قرآن ثانی شاہ جہان غازی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ" کے عہد میں لکھی ہے۔[32] شاہجہان سن سبع و ثلثین و الف

---

[29] مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد دوم، مطبوعہ کانپور سنہ ۱۹۱۴ء، ص ۲۳۴،

[30] ایضاً، ص ۲۳۴ [31] ایضاً، ص ۲۵۱

[32] شیخ الہدیہ، سیر الاقطاب، مطبوعہ نولکشور سنہ ۱۹۱۳ء، ص ۲

Marfat.com

(۱۲۰۳۷) میں تخت نشین ہوا تھا۔ کم از کم ایک ہم عصر تذکرہ نویس ایسی غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب بھی وضعی ہے اور اس کی روایات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

آیئے اب دوسرے شواہد سے اس روایت کا تجزیہ کریں۔

۱۔ بابا صاحبؒ نے ۱۲۶۵ء میں پچانوے سال کی عمر میں وفات پائی۔ بابا صاحبؒ کی عمر کے متعلق امیر خورد نے ایک بار حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے سوال کیا تھا کہ "عمر شریف حضرت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز چند سال بود؟" آپ نے ارشاد فرمایا "نود و پنج سال"[۲۳] غیاث الدین بلبن بابا صاحب کی وفات کے ایک سال بعد ۱۲۶۶ء میں تخت نشین ہوا، اگر ہم یہ کہیں کہ بلبن نے اپنے زمانۂ وزارت میں اپنی بیٹی کا عقد بابا صاحبؒ کے ساتھ کر دیا تھا تو اس وقت یہ بات ذہن میں ہونی چاہیئے کہ جب ناصر الدین محمود نے بلبن کو قلمدانِ وزارت سونپا تو اس وقت بابا صاحبؒ کی عمر ۷۶ سال اور بلبن کی عمر ۴۰ سال کے لگ بھگ تھی، اس طرح بلبن کی بیٹی اگر وہ بابا صاحبؒ سے منسوب ہوتی تو اس کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس برس ہونی چاہیئے تھی، بابا صاحبؒ اور بنتِ بلبن کی عمروں میں اس قدر تفاوت کے پیشِ نظر یہ رشتہ طے ہونا ناممکن سا تھا۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ بلبن کے عہدۂ وزارت پر متمکن ہونے سے پہلے اس کی ایک بیٹی ناصر الدین محمود کے عقد میں تھی اور اس کی اگر کوئی دوسری بیٹی ہوتی تو وہ اور بھی کم سن ہوتی، اس طرح میرے خیال میں ایسا رشتہ ہونا ناممکن تھا۔

۲۔ کتب تواریخ میں سلطان بلبن کی اولاد کے ضمن میں فقط سلطان محمد،

---

[۲۳] سیر الاولیاء۔ مطبوعہ دہلی ۱۳۰۲ھ، ص ۹۱

Marfat.com

بغراخان اور ایک بیٹی کا ذکر ملتا ہے جو ناصرالدین محمود کے حرم میں تھی ۔ ان تینوں بچوں کے علاوہ اور کسی بچّے کا نام کسی کتاب میں پڑھنے میں نہیں آیا، ویسے بھی بلبن موجودہ اصطلاح میں "خاندانی منصوبہ بندی" کا بڑا حامی تھا۔ سلطان بلبن کے فرزند شہزادہ بغراخان نے ایک موقعہ پہ اپنے بیٹے کیقباد کو مخاطب کر کے یہ کہا تھا۔

"پدرِ ما سلطان بلبن کہ در تجارب ملکی و خانی و بادشاہی پیر شدہ بود بارہا بگفتی کہ من می توانم کہ از زنان و کنیزکان پسران و دختران بسیار بزایم ولیکن از بزرگانِ دین و دولت شنیدہ ام کہ بادشاہ را پسران و دختران بسیار نشاید چہ اگر ملک بدست یک پسر افتد ہمان پسر برادران و برادرزادگان را شریک ملک خود داند یا بر ہمہ را بکشد و یا در اقلیم ہای دُور دست جلا کند ایمن نشود، و دامادان بادشاہ را از جہت دختران بادشاہ بوی بادشاہی در دماغ افتد و ہمان بوی ایشان را زندہ بودن نگذارد۔"[۳۴]

ہمارے والدہ سلطان بلبن جو ملک، خان اور بادشاہ کی حیثیت سے تجربے کرتے کرتے بوڑھے ہو گئے تھے، اکثر کہا کرتے تھے کہ میری یہ بڑی خواہش تھی کہ میری بیویوں اور کنیزوں سے میرے بہت سے بیٹے اور بیٹیاں ہوتے (لیکن یہ خواہش اس لئے پوری نہ ہوئی کہ) میں نے بزرگان دین اور اکابر سلطنت کو بارہا یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ بادشاہ کے زیادہ بیٹے اور بیٹیاں نہیں ہونے چاہئیں، وہ اس لئے کہ جب اُس کا ملک کسی بیٹے کے قبضے میں آئے گا تو وہ اپنے دوسرے بھائیوں اور بھتیجوں کو اپنی سلطنت میں شریک سمجھے گا۔ اس صورت میں یا تو وہ ان سب کو قتل کر ڈالے گا یا انہیں جلاوطن کر کے دور دراز علاقوں میں بھیج دے گا۔

---

[۳۴] برنی، تاریخ فیروز شاہی، جلد اوّل، علیگڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۱۷۲

Marfat.com

سطورِ بالا کی روشنی میں یہ بات یقینی کہی جا سکتی ہے کہ سلطان بلبن کی ایک بیٹی کے علاوہ، جو ناصر الدین محمود کے حرم میں تھی، دوسری کوئی بیٹی نہ تھی۔

۳۔ سلطان بلبن کا بڑا بیٹا شہزادہ محمد اپنے والد کی زندگی میں ملتان کا گورنر تھا اور اس کے تعلقات خاندان شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے ساتھ بڑے خوشگوار تھے، اگر اس کی بہن اجودھن میں ہوتی تو اس کے تعلقات خاندانِ فرید کے ساتھ کہیں زیادہ خوشگوار ہوتے اور وہ ملتان سے اپنی بہن یا اس کی اولاد سے ملاقات کے لئے اکثر اجودھن آیا کرتا۔ کسی تذکرہ نویس یا مؤرخ نے اس کے سفرِ اجودھن کا ذکر نہیں کیا اور اتنا لیکہ امیر خسرو اور امیر حسن سجزی جیسے مؤرخ اور تذکرہ نویس اس کے درباری تھے۔

۴۔ بابا صاحبؒ کا امراء اور سلاطین کی طرف جو رویہ تھا وہ اس نصیحت سے عیاں ہے کہ جو انھوں نے سیدی مولہ کو کی تھی، آپ فرماتے ہیں :۔

"اے سیدی تو در دہلی میروی و می خواہی دری بکشائی و بانہ نام پیدا آری، تو دانی ہر چہ دران صلاح و صواب خود بینی ہم چنان بکنی، اما یک وصیت از من نگہداری، باید کہ با ملوک و امراء اختلاط نہ کنی و آمد و شد ایشان را در خانقاہ خویش از مہلکات تصور کنی کہ ہر درویشی کہ در اختلاط با ملوک و امراء بکشاید عاقبت او وخیم گردد۔"[۳۵]

سیدی تم دہلی جا رہے ہو اور چاہتے ہو کہ وہاں دروازہ کھولو اور نام پیدا کرو۔ جو چیز اپنے حق میں درست و بہتر سمجھتے ہو اس کو تم جانو اپنے صوابدید کے مطابق ہی کر لینا لیکن میری ایک وصیت کا خیال رکھنا اور وہ یہ ہے کہ ملوک و امراء کے ساتھ اختلاط نہ رکھنا اور اپنے گھر میں ان کی آمد و رفت کو مہلکات میں سے تصور کرنا جو درویش ملوک و امراء سے اختلاط کا دروازہ کھولتا ہے اس کا انجام خراب ہوتا ہے۔

(ترجمہ پروفیسر خلیق احمد نظامی)

۳۵۔ برنی، تاریخ فیروز شاہی، جلد دوم، مطبوعہ علیگڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۳۷

سطور بالا کی روشنی میں بابا صاحبؒ اور بنتِ بلبن کا رشتہ ایک مفروضہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

۵۔ بابا صاحبؒ لوگوں کو امراء و سلاطین کے پاس جانے سے روکتے تھے اگر سلطان بلبن کی کوئی بیٹی ان کے حرم میں ہوتی تو آپ لوگوں کو اس طرح کی نصیحت نہیں کر سکتے تھے، بصورت دیگر آپ کی مثال اس شخص جیسی ہوتی جو بسر و قد مرغی بغل میں دبا کر لوگوں کو دیانتداری اور راستبازی کی تلقین کرتا پھرے۔[۳۶]

۶۔ بابا صاحبؒ کا سلاطین اور امراء کی طرف جو رویہ تھا وہ اظہر من الشمس ہے۔ سلاطین و امراء تو ہے ایک طرف، بابا صاحبؒ عوام سے بھی بھاگتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ آپ ہانسی کی سکونت ترک کر کے اجودھن چلے گئے جہاں کے باشندے "درویش آزار اور درشت خو" مشہور تھے[۳۷] ان حالات میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ بابا صاحبؒ بلبن کی بیٹی کے ساتھ عقد کرتے۔

۷۔ بابا صاحبؒ کی زندگی اتنی درویشانہ تھی اور آپ اس حد تک قانع تھے کہ آپ نے کریر کے پھل ڈیلے (ٹینٹ) اور پیلو پہ مدتوں گذارہ کیا بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ روزہ افطار کرنے کے لئے آپ کے توشہ خانہ سے چٹکی بھر نمک بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ جب آپ نے رحلت فرمائی تو آپ کے

---

[۳۶] خلیق احمد نظامی، دی لائف اینڈ ٹائمز آف شیخ فریدالدین گنج شکر، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۵ء، ص ۱۰۳،

[۳۷] امیر خورد، سیرالاولیا، مطبوعہ دہلی ۱۳۰۲ھ، ص ۶۴،

Marfat.com

جنازہ پر ڈالنے کے لئے گھر سے چادر بھی نہ مل سکی اور امیر خورد کی دادی نے ایک چادر اس مقصد کے لئے پیش کی، جب لحد کا منہ بند کرنے کا وقت آیا تو کچی اینٹیں بھی میسر نہ آسکیں اور خانقاہ کے کسی حجرہ کا در، جو کچی اینٹوں سے بند کیا ہوا تھا، اکھاڑ کر کام چلایا گیا۔ ایسے درویش کو جس کے زہد کا یہ عالم ہو اور جس کے گھر میں کئی کئی دن کا فاقہ ہوا اور وہ عالم اضطراب میں سنگریزے منہ میں ڈال لے، جس کے متعلق محمد عوفی مندوہی یہ لکھنے پر مجبور ہو کہ۔ "ہند کے تمام مشائخ متفق اللفظ ہیں کہ ریاضت اور پرورش روح میں گنج شکرؒ کی مانند کوئی درویش پیدا نہیں ہوا" اسے بلبن جیسا قیصر صفت اور کسریٰ مزاج بادشاہ اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے تو رہا۔

۸۔ بلبن ذات پات کا بڑا قائل تھا اور نیچ ذات کے لوگوں کو دیکھنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

"من خود را از آل افراسیاب و از فرزندان افراسیاب از ان می دانم کہ باری تعالیٰ در من خاصیتی آفریدہ است کہ ہیچ کم اصل و دون و سفلہ و رذالہ را در شغل و منصب دولت نتوانم دید، و بہ مجرد آن کہ این طائفہ در نظر من در آیند جملہ رگہائی اعضائے من در جنبش در آید، و چون حال برین جملہ باشد کہ با شما گفتم من نتوانم کہ لئیم و کم اصل و ناکس زادہ را در

میں افراسیاب کی اولاد ہوں اور میرے آباؤ اجداد کا شجرۂ نسب افراسیاب سے جا ملتا ہے میں جانتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے میری فطرت ایسی بنائی ہے کہ میں کسی کم اصل، کمینے یا نیچ ذات کے فرد کو کسی سرکاری منصب پر نہیں دیکھ سکتا۔ جونہی ان میں سے کوئی شخص میرے سامنے آتا ہے میری ایک ایک رگ پھڑکنے لگتی ہے۔ جب میری یہ حالت ہو جو میں تمہارے سامنے بیان کر رہا ہوں تو پھر یہ کس طرح ہو سکتا کہ میں اس دولت میں جو خدا نے مجھے عطا کی ہے کسی کمینے، نیچ ذات کے فرد یا حرام زادے کو شریک

Marfat.com

صدر دولتی، کہ من از خدا یافتہ ام، شریک کردوں اور اُسے سرکاری ملازمت یا کنم وشغل و اقطاع و تصرف دہم۔"[۳۸] جاگیر بخشوں۔

۹۔ بابا صاحبؒ اور بلبن کے نظریات میں بعد المشرقین تھا اس لئے یہ کیسی صورت بھی ممکن نہ تھا کہ ان کے درمیان اس طرح کا رشتہ قائم ہوتا۔

۱۰۔ بلبن کا اپنے مخدوم زادے اور داماد سلطان ناصر الدین محمود کے ساتھ جو سلوک تھا اس کی ایک جھلک بعض کتب تواریخ میں پائی جاتی ہے۔ بعض مؤرخ یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ اس نے تمام اختیارات حکومت اپنے ہاتھ میں لے لئے اور ناصر الدین محمود مجبوراً خانہ نشین ہو گیا اور اس نے وہ ریاضت اور تقویٰ اختیار کیا جواب تک ضرب المثل ہے۔ بعض مؤرخ تو یہاں تک کہہ گئے کہ جب تمام اختیاراتِ حکومت اس نے اپنے ہاتھ میں لے لئے تو تختِ حکومت حاصل کرنے کے لئے اس نے ناصر الدین محمود کو زہر دے کر مار ڈالا[۳۹] اور عوام میں "غلام خواجہ کُش" کے لقب سے مشہور ہوا، سلطان فیروز تغلق کے متعلق روایت ملتی ہے کہ وہ دہلی کے اکثر و بیشتر سلاطین کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے لئے جایا کرتا تھا لیکن بلبن کو "خواجہ کُش" سمجھتے ہوئے وہ اس کے مزار پر فاتحہ نہ پڑھتا تھا۔[۴۰]

ناصر الدین محمود کا ذکر لوگ اولیائے اللہ کے زمرہ میں کرتے ہیں۔ اگر بلبن اس جیسے ولی کو مروا سکتا ہے تو بابا صاحبؒ جیسے ولی سے کب ایسی

---

۳۸ برنی، تاریخ فیروز شاہی جلد اوّل، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۴۴

۳۹ رحلۃ ابن بطوطہ، جلد دوم، مطبوعہ قاہرہ ۱۸۶۹ء، ص ۲۱

۴۰ نور الحق، زبدۃ التواریخ، قلمی نسخہ، برٹش میوزیم لندن، نمبر ایڈیشنل ۱۰۵۸۰، ورق ۱۵ ب،

Marfat.com

عقیدت رکھ سکتا تھا کہ اپنی بیٹی کا رشتہ ان کو دیتا۔

۱۱۔ اب رہی یہ بات کہ بلبن درویشوں سے عقیدت رکھتا تھا اور ان کے گھروں پہ جایا کرتا تھا اور اگر ان میں سے کوئی فوت ہو جاتا تو اس کے جنازہ میں شرکت کرتا اور تعزیت کے لئے اس کے لواحقین کے پاس جاتا اور ان کو نقدی اور کپڑے عطا کرتا، ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں، وہ ضرور ایسا کرتا ہوگا، لیکن یہ اس کی نیکی کی دلیل نہیں ہے۔ بڑے بڑے جابر اور فاسق بادشاہ درویشوں سے عقیدت رکھتے تھے لیکن اس عقیدت کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان سے اپنی بیٹیاں بیاہ دیتے تھے، ایسے بادشاہوں کے متعلق علامہ عبدالرحمٰن ابن جوزیؒ رقمطراز ہیں۔

"معاصی پہ اصرار کے ساتھ ساتھ ان کو صلحاء کی ملاقات کا بھی بڑا شوق ہوتا ہے اور اُن سے وہ اپنے حق میں دعائیں کراتے ہیں، شیطان ان کو سمجھاتا ہے کہ اس سے گناہوں کا پلڑا ہلکا ہو جائے گا، حالانکہ اس خبر سے اس شر کا دفعیہ نہیں ہو سکتا۔"[۴۱]

مورخین نے بلبن کی حسن درویش نوازی کا بڑے زور و شور سے ڈھنڈورا پیٹا ہے وہ سطور بالا کی روشنی میں اس کی نیکی کی دلیل نہیں بن سکتی۔

۱۲۔ بابا صاحبؒ کی وفات کے بعد بابا صاحبؒ کی اولاد کے ساتھ، جو اس مفروضہ رشتہ کی بنا پر بلبن کے نواسے ہوتے ہیں، بلبن نے اگر کوئی سلوک کیا ہوتا تو اس کا ذکر تذکروں میں ضرور ہوتا، آخر ان میں سے سبھی تو ایسے درویش

---

[۴۱] ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، حصہ اوّل، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۵۵ء، ص ۲۱۸
(مولانا علی میاں نے نقد مسالک الولاۃ والسلاطین کا حوالہ دیا ہے جو لاہور میں موجود نہیں)

Marfat.com

صفت نہ تھے جو ہدیۂ سلطانی کو رد کر دیتے۔ بابا صاحبؒ کے ایک فرزند نظام الدینؒ تو سرکاری ملازمت کو عار نہ سمجھتے تھے کم از کم وہ تو جاگیر قبول کر لیتے۔

۱۳۔ اگر واقعی بابا صاحبؒ نے بلبن کی بیٹی سے عقد کیا تھا تو اس کا ذکر حضرت نظام الدین اولیاءؒ یا شیخ نصیر الدینؒ چراغ دہلیؒ نے کیوں نہیں کیا؟

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک مستند تاریخی شواہد اور براہین کا تعلق ہے حضرت بابا صاحبؒ کے ساتھ سلطان غیاث الدین بلبن کی کسی بیٹی کی نسبت محض ایک افسانہ ہے اور حقیقت سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔

Marfat.com

فضل اللہ بن روزبہان اصفہانیؒ

اور

ان کا ایک نادر رسالہ

ابوالخیر فضل اللہ بن جمال الدین روزبہان[1] بن فضل اللہ[2]، الحنجی، الشیرازی، الاصفہانی، المتخلص بہ امین[3]، المشہور بہ خواجہ مولانا اصفہانی[4]، شیراز میں ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء میں پیدا ہوئے۔

مولانا فضل اللہ کا سال پیدائش ابھی تک متنازعہ فیہ ہے۔ ان کے ہم عصر اور استاد شہرۂ آفاق محدّث شمس الدین محمد السخاویؒ نے ان کے سوانح حیات اپنی مشہور عالم تصنیف الضوء اللامع میں بڑی تفصیل کے ساتھ قلمبند کئے ہیں لیکن ان کے سال پیدائش کے متعلق انھیں بھی یقین نہیں تھا۔ اس لئے آپ نے ان کی ولادت ۸۶۰ - ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ - ۱۴۵۶ء کے درمیان

---

[1] فضل اللہ، تاریخ عالم آرائے امینی، مخطوطہ فاتح لائبریری استانبول، ورق ۹۸ الف

[2] فضل اللہ، مہمان نامۂ بخارا، مطبوعہ تہران ۱۹۶۲ء ص ۳۵۶

[3] ایضاً - ص ۷۵، ۱۳۱، ۱۳۶، ۲۵۱، ۲۵۳، ۲۵۶، ۲۵۹، ۳۲۱، ۳۳۸

[4] فضل اللہ، مہمان نامۂ بخارا - ص ۳۵۶۔

Marfat.com

بتائی ہے۔[۵] عصر حاضر کے ادیب شہیر عمر رضا کحالہ کے خیال کے مطابق آپ ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء میں پیدا ہوئے۔[۶] تاریخ عالم آرائے امینی کے انگریزی ترجمہ کے دیباچے میں ایک فٹ نوٹ میں پروفیسر مینورسکی تحریر فرماتے ہیں کہ فضل اللہ ۸۷۷ھ/۱۴۷۲ء میں بغداد میں وارد ہوئے اس لیے گمان غالب ہے کہ وہ اندازاً ۲۵ سال کی عمر میں اصفہان سے نکلے ہوں گے اس لحاظ سے ان کی پیدائش ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء کی ہونی چاہیئے۔[۷] کچھ عرصہ بعد حسنِ اتفاق سے پروفیسر مینورسکی کو خود مولانا فضل اللہ کی تصنیف تاریخ عالم آرائے امینی سے ایک شہادت مل گئی جس سے یہ ثابت ہوا کہ مولانا ۲۵ برس کی عمر میں ۸۷۵ھ/۱۴۷۰ء میں اصفہان سے نکلے تھے اس حساب سے ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء مولانا کا سالِ پیدائش ہے۔[۸]

یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل اللہ شافعی المذہب علماء کے ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جس کے افراد پشتہا پشت سے عہدہ قضا پر فائز چلے آرہے تھے۔ ہرچند فضل اللہ نے اپنے والد اور دادا کے علاوہ اپنے کسی مورثِ اعلیٰ کا ذکر نہیں کیا تاہم ان کے والد کے غیر معمولی نام روزبہان کا تعلق فسا اور خنج کے اسی نام کے ایک خاندان سے جوڑا جا سکتا ہے۔[۹] یہ فسا وہی شہر ہے جہاں کی خاکِ پاک سے شہرۂ آفاق صوفی اور عالم حضرت

---

۵ السخاوی، الضوء اللامع، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۴ھ ج ۶ ص ۱۷۱

۶ عمر رضا کحالہ۔ معجم المؤلفین مطبوعہ دمشق ۱۹۵۹ء جلد ۸، ص ۶۸۔

۷ مینورسکی۔ پرشیا ان اے۔ ڈی ۱۴۷۸ تا ۱۴۹۰ مطبوعہ لندن ۱۹۵۷ء ص ۲۔ ۸ ایضاً ص ۱۲۷

۹ جنید شیرازی۔ شدّ الازار مطبوعہ تہران ۱۹۴۹ء۔ ص ۱۷۱ تا ۱۷۵

Marfat.com

روزبہان بن ابی نصر البقلیؒ (م ۶۰۶/۱۲۱۰) پیدا ہوئے تھے۔[۱۰] حسن فسائی نے اپنی قابلِ قدر تصنیف فارس نامۂ ناصری میں ایک اور عالم زین العابدین علی بن روزبہان (م ۷۰۰ھ/۱۳۰۰ء) کا ذکر کیا ہے جو اپنے دور میں مولانا فضل اللہ کے آبائی وطن خنج میں عہدۂ قضا پہ فائز تھے۔[۱۱]

فضل اللہ اپنی مشہور تصنیف تاریخ عالم آرائے امینی میں اپنے والد "جمال الحق والحقیقت روزبہان" کے متعلق رقم طراز ہیں کہ وہ سرداروں کے زمرہ میں داخل تھے لیکن ان پہ کچھ ایسی گذری کہ انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے اوقات پڑھنے لکھنے میں بسر کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کا شمار ان علماء میں ہونے لگا جن پہ سلطان یعقوب (م ۱۴۹۰ء) کی نظرِ عنایت رہتی تھی۔[۱۲]

فضل اللہ اپنی والدہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ وہ اصفہان کے ممتاز گھرانے صاعدی کی فرد تھیں۔[۱۳] یہ خاندان اپنی علم دوستی اور علمی سرپرستی کے لئے ایران بھر میں مشہور تھا۔ کمال اسمٰعیل اصفہانی جیسا صاحبِ کمال اور نامور شاعر اسی خاندان کے دسترخوان کرم کا ریزہ چین تھا اور اس نے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۶ قصائد اس خاندان کے مختلف افراد کی مدح میں لکھے ہیں۔[۱۴] فضل اللہ کا ایک ماموں جمال الدین صاعدی شیراز کے

---

[۱۰] فضل اللہ۔ تاریخ عالم آرائے امینی ورق ۲۰۰ ب۔

[۱۱] حسن فسائی فارس نامہ ناصری، مطبوعہ تہران ۱۳۱۱ش جلد دوم۔ ص ۱۹۰

[۱۲] فضل اللہ۔ تاریخ عالم آرائے امینی ورق ۸۹ الف

[۱۳] ایضاً ورق ۶۶ الف

[۱۴] کمال اسمٰعیل اصفہانی، دیوان، مطبوعہ بمبئی، ص ۱۲، ۱۵، ۱۷۔

Marfat.com

قراقیونلو حاکم پیر بودق بن جہان شاہ کے دور میں عہدۂ وزارت پہ فائز تھا۔[۱۵] فضل اللہؒ کا دوسرا ماموں مسعود شاہ شیراز کے حاکم جہان شاہ کا منظورِ نظر تھا جسے اس نے اپنے قبیلے کی سرداری کے علاوہ نقارہ و علم بھی عطا کیا تھا۔[۱۶] جہاں شاہ کے انتقال کے بعد مسعود شاہ ہمیں سلطان یعقوب کے دربار میں نظر آتا ہے جہاں حسبِ سابق اس کی ساکھ قائم تھی۔[۱۷] فضل اللہ نے اپنے ایک قریبی عزیز خواجہ نظام الدین احمد صاعدی کا ذکر بھی کیا ہے جس کے دسترخوان کرم سے ہر روز اندازاً ایک ہزار درویشوں کو کھانا ملتا تھا۔[۱۸] اس کا ایک دوسرا رشتہ دار قاضی عضدالاسلام صاعدی گرجی عیسائیوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے شہید ہوا تھا۔[۱۹]

فضل اللہ کی انہی رشتہ داریوں کے پیشِ نظر پروفیسر مینورسکی رقمطراز ہیں کہ ان پر غور کرنے سے یہ بات بخوبی عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو سُنّی عقائد کے علمبردار تھے۔[۲۰] ایک دوسرے موقع پر موصوف نے فضل اللہ کو "سُنّی مذہب کے فاضل علمبردار" کے لقب سے بھی یاد فرمایا ہے۔[۲۱] مولانا کے یہی عقائد ان کے مخالفین کے دل میں کھٹکتے رہتے

۱۵؎ فضل اللہ، تاریخ عالم آرائے امینی، ورق ۶۶ الف

۱۶؎ ایضاً ورق ۶۶ الف ۱۷؎ ایضاً ورق ۶۷ الف

۱۸؎ ایضاً ورق ۱۸۶ ب

۱۹؎ ایضاً ورق ۱۷۶ الف

۲۰؎ مینورسکی۔ پرشیا ان اے۔ ڈی ۱۴۷۸ - ۱۴۹۰ ص ۲

۲۱؎ مینورسکی۔ بولیٹن سکول آف اورنٹیل اینڈ افریقن سٹڈیز، جلد ۱۷/۳ ۱۹۵۵ء ص ۴۶۱۔

Marfat.com

تھے اور اس کا اندازہ حسن روملو کی احسن التواریخ کے مطالعہ سے ہوتا ہے جس میں اس نے مولانا کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک متعصب سنّی اور شیبانی خان کے درباری تھے اور اہلِ بیت کے ساتھ اپنی دشمنی کے لئے رسوائے عالم تھے[۲۲]۔ زمانہ حال کے ادیبوں میں سے پروفیسر براؤن[۲۳] اور اسٹوری[۲۴] نے بھی مولانا فضل اللہ کو جھگڑالو اور متعصب سنّی لکھا ہے۔

اس زمانے میں شیراز کا شمار دُنیائے اسلام کے گنے چُنے عالمی مراکز میں ہوتا تھا اور اس دور کے بلاشبہ سب سے بڑے شافعیُ فاضل مولانا جلال الدین دوانیؒ وہاں درس دیا کرتے تھے۔ مولانا فضل اللہ کی یہ بڑی سعادت تھی کہ انھیں برسوں دوانی کے حلقۂ درس میں بیٹھنے کا موقع ملا[۲۵]۔ محدّث السخاوی نے ان کے اساتذہ میں عمید الدین شیرازی کا بھی ذکر کیا ہے[۲۶]۔ فضل اللہ تاریخ عالم آرائے امینی کے آغاز میں رقم طراز ہیں کہ انھوں نے علوم عربیہ کی تعلیم شیراز میں پائی اور سترہ برس کی عمر میں حج کی نیت سے عازم حجاز ہوئے[۲۷]۔ ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ حج بیت اللہ کے بعد وہ شیراز واپس لوٹ لئے تھے۔

زمانے کے دستور کے مطابق فضل اللہ نے نوجوانی کے عالم میں سہروردیہ

۲۲۔ حسن روملو۔ احسن التواریخ۔ مطبوعہ بڑودہ ۱۹۳۱ء، ص ۱۷۴

۲۳۔ براؤن، اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا، مطبوعہ کیمبرج ۱۹۳۰ء، جلد چہارم، ص ۴۰۷، ۴۰۹

۲۴۔ اسٹوری، پرشین لٹریچر، مطبوعہ لندن ۱۹۲۷ء، جلد اول، ص ۳۰۰

۲۵۔ فضل اللہ مہمان نامۂ بخارا، مطبوعہ تہران ۱۹۶۲ء۔ ص ۳۳۵

۲۶۔ السخاوی، الضوء اللامع، مطبوعہ قاہرہ۔ ۱۳۵۴ھ، جلد ششم ص ۱۷۱

۲۷۔ فضل اللہ۔ تاریخ عالم آرائے امینی، ورق ۳۰ ب تا ۳۵ الف

Marfat.com

سلسلہ کے ایک بزرگ پیر جمال الدین صوفی جمالی اردستانیؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔[28] پیر جمال الدینؒ جن کی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گزرا تھا، اپنے دور کے سربرآوردہ شعراء میں شمار ہوتے تھے۔[29] ان کی کلیاتِ قلمی جس میں ۲۴ مثنویات کے علاوہ رباعیات، غزلیات اور مفردات بھی شامل ہیں کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ پروفیسر نکلسن نے پروفیسر براؤن کے مخطوطات کی فہرست میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ بہت ہی نادر منظوم شاہکار" ہے۔[30] پیر جمال الدینؒ کی کلیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے مرید فضل اللہ سے خاص لگاؤ تھا اور وہ اپنے خطوط میں ان کو فرزند کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ دوسروں کے نام خطوط میں بھی وہ اکثر ان کا اور ان کی ہمشیرہ کا ذکر بڑے پیار و محبت سے کیا کرتے تھے۔[31]

پیر جمال الدینؒ کی بیعت کے بعد فضل اللہ نے تصوف کا مطالعہ شروع کیا اور ان کی نگرانی میں منازلِ سلوک طے کرنے لگے۔ دوسرے سفر حجاز میں فضل اللہ نے بڑی رغبت کے ساتھ شیخ ابوحفص شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی عوارف المعارف کا مطالعہ کیا۔[32]

۲۸؎ ابن سکندر۔ بستان سیاحت، مطبوعہ تہران ۱۸۹۰ء ص ۳۴۸ ۲۹؎ (۱) رضا قلی خان۔ ریاض العارفین، مطبوعہ تہران ۱۳۰۵ھ ص ۵۳۔۵۴ (۲) پیر جمال کلیات، قلمی نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری نمبر ۱۲-۲۳۸ ورق ۱۰۱ الف، ۳۰۵ ب ۳۰؎ (۱) نکلسن۔ فہرست مخطوطات براؤن کیمبرج ۱۹۳۲ء ص ۲۳۹ (ب) نکلسن۔ عجب نامہ، کیمبرج ۱۹۲۲ء صفحہ ۳۶۴ تا ۳۷۰

۳۱؎ پیر جمال۔ کلیات، ورق ۲۱۱ الف، ۲۱۲ ب ۳۲؎ فضل اللہ تاریخ عالم آرائے امینی، ورق ۳۰ ب تا ۲۵ الف

Marfat.com

۲۵ سال کی عمر میں ۸۷۵ھ - ۱۴۷۱ء میں فضل اللہ اپنی والدہ اور پیر جمال الدینؒ کو ساتھ لے کر تلاش علم میں مصر کی جانب روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں قاہرہ میں شیخ محمد الخیضریؒ (م $\frac{۹۰۴}{۱۴۹۹}$) کے علم و فضل کا بڑا چرچا تھا اور یہ فضل اللہ کی سعادت تھی کہ انھیں شیخ موصوف کے درس میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا[۳۳]۔ ادھر فضل اللہ نے اپنی تعلیم مکمل کی ادھر ان کی والدہ انتقال کر گئیں اور وہ بددل ہو کر اپنے پیر و مرشد کی معیت میں فلسطین کی طرف روانہ ہوئے۔

بیت المقدس پہنچتے ہی پیر جمال الدینؒ نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کی تجہیز و تکفین کے بعد فضل اللہ نے مدینہ منورہ کی راہ لی[۳۴]۔

ان دنوں مدینہ منورہ میں شہرۂ آفاق محدث شمس الدین محمد عبدالرحمٰن السخاویؒ مسجد نبوی میں حدیث کا درس دیا کرتے تھے اور دور دور سے تشنگان علم ان سے سندِ حدیث لینے آتے تھے۔ فضل اللہ نے بھی ان سے بخاری شریف کا درس لیا اور جس دن انہیں سندِ حدیث ملی اس دن انھوں نے عربی میں ایک زوردار قصیدہ اپنے استاد کی مدح میں لکھا۔ اس واقعہ کے کئی سال بعد جب محدث السخاوی الضوء اللامع میں اپنے شاگردِ رشید کے حالات قلم بند کرنے بیٹھے تو وہ قصیدہ ان کے پاس موجود تھا[۳۵]۔

اس زمانہ میں مدینہ منورہ میں ایک اور بزرگ ابو عبداللہ محمد بن ابو الفرجؒ بھی حدیث کا درس دیا کرتے تھے، فضل اللہ نے ان کی خدمت میں رہ کر مسلم شریف کی سند حاصل کی[۳۶]۔

---

[۳۳] (i) السخاوی، الضوء اللامع، جلد چہارم۔ ص ۱۷۱ (ii) فضل اللہ نے سلوک الملوک میں ۸۸۶ھ میں اپنے قیامِ مصر کا ذکر کیا ہے (مخطوطہ لینن گراڈ، ورق ۴۳ الف)

[۳۴] السخاوی، الضوء اللامع، جلد چہارم ص ۱۷۱ [۳۵] و [۳۶] ایضاً۔

Marfat.com

امام محمد بن ادریس الشافعیؒ کے مقلدین میں امام محمد غزالیؒ بلا شبہ سب سے بڑے عالم ہوئے ہیں اس لئے شافعی المذہب ہونے کی بنا پر فطرتاً فضل اللہ کا رجحان ان کی طرف تھا۔ قیامِ حجاز کے دوران انھیں امام غزالی کی کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا اور انھوں نے منہاج العابدین اور احیاء العلوم کا مطالعہ بڑے شوق اور انہماک سے کیا۔[۳۷]

حجاز مقدس میں تکمیلِ تعلیم کے بعد فضل اللہ شیراز واپس لوٹے اور یہاں آتے ہی انھوں نے "بدیع الزمان فی قصۃ حیّ ابن یقظان" تالیف کی۔ اسی دوران ان کا دل کسی وجہ سے "آب رکناباد اور گل گشت مصلّٰی" سے اُچاٹ ہوا اور انھوں نے حجاز مقدس میں جا بسنے کی ٹھان لی۔ لیکن عین آخر وقت پر حجاز کی بجائے وہ سلطان یعقوب سے ملنے کی غرض سے آذربائیجان روانہ ہوئے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ فضل اللہ کے والد جمال الدین روزبہان سلطان موصوف کے منظورِ نظر علماء میں سے تھے اس لئے بغیر کسی دشواری کے شعبان ۸۹۲ھ / اگست ۱۴۸۷ء میں کوہ سہند کے گرمائی کیمپ میں سلطان کی خدمت میں باریاب ہوئے اور اپنی کتاب بدیع الزمان اس کی خدمت میں نذر گزرانی۔ سلطان نے فضل اللہ کو اپنا کاتب بنا کر ان کی عزت افزائی کی اور شاہی روزنامچہ لکھنے کی خدمت ان کے سپرد کی۔ آپ نے یہ خدمت قبول کرتے ہوئے سلطان کو یقین دلایا کہ خدا کو منظور رہا تو اس روزنامچہ کے سامنے جوینی کی تاریخ جہانگشائی کی آب و تاب ماند پڑ جائے گی۔[۳۸]

---

[۳۷] فضل اللہ۔ تاریخ عالم آرائے امینی ورق ۳۰ ب تا ۳۵ الف۔

[۳۸] ایضاً

Marfat.com

چار سال تک مولانا فضل اللہ بحیثیتِ کاتب سلطان یعقوب کی خدمت میں حاضر رہے۔ اس دوران میں متعدد بار آپ نے اہم دستاویزات تیار کیں۔ ۸۹۲ھ/۱۴۸۶ء میں سلطان اصفہان کے دورہ پر آیا تو اس نے وہاں کے سربرآوردہ لوگوں کو انعام و اکرام سے نوازا۔ مولانا فضل اللہ کو بھی ان کی خدمات کے عوض خلعتِ فاخرہ اور گھوڑا عطا ہوا اور اس کے ساتھ ہی ان کی تنخواہ میں بھی معقول اضافہ کیا گیا۔[۳۹]

۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء میں سلطان یعقوب نے بیت اللہ کے لیے غلاف تیار کروایا تو فضل اللہ کو حکم دیا کہ لوگوں میں اس بات کا اعلان کریں کہ جو لوگ محمل کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے جانا چاہیں ان کی مدد سرکاری خزانے سے کی جائے گی۔[۴۰] اسی سال سلطان نے اپنے بیٹے کا ختنہ کیا تو اس تقریب پر سلطان حسین بالقرا نے اپنا سفیر تحفے تحائف اور خط دے کر سلطان یعقوب کی خدمت میں بھیجا۔ سلطان نے فضل اللہ کو حکم دیا کہ وہ اس خط کا جواب تحریر کریں۔[۴۱] اسی سال جب سلطان یعقوب نے اپنا سفیر حاکمِ مصر ملک الاشرف ابو النصر سیف الدین قائیتبای کے دربار میں بھیجا تو اس کے ہاتھ جو خط ملک الاشرف کے نام بھیجا تو وہ بھی فضل اللہ ہی سے لکھوایا تھا۔[۴۲]

رمضان ۸۹۳ھ/اگست ۱۴۸۸ء میں سلطان یعقوب نے ایک شاہی فرمان کی رو سے اپنی قلم رو میں شراب کے استعمال پر پابندی لگا دی اور ہر چھوٹے بڑے شہر میں "لوگوں کے گھروں کو شراب کے پیالوں سے پاک

---

[۳۹] ایضاً ورق ۱۳۱ الف
[۴۰] ایضاً ورق ۱۱۶ ب
[۴۱] ایضاً ورق ۱۲۸ ب
[۴۲] ایضاً ورق ۱۱۸ الف و ب

Marfat.com

رکھنے کے لئے "محتسب مقرر کئے۔ اس موقع پر فضل اللہ بڑی مسرت کے ساتھ لکھتا ہے کہ اس فرمان کے ذریعے یہ قرار پایا کہ "جو شخص بھی پیالہ میں شراب انڈیلتا ہوا پکڑا جائے تو محافظان شریعت اس کے حلق میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل کر اس کی زندگی کا جام خالی کر دیں اور اگر کوئی ڈاڑھی منڈوا کر اپنا چہرہ بے نور کرے تو اس کا سر کاٹ کر اس کی زندگی کا چراغ بے نور کر دیا جائے۔"[۱۴۳]

اگلے ہی سال سلطان نے "نیزۂ دین" تیز کرتے ہوئے یہ حکم جاری کیا کہ احکام شریعت پر سختی کے ساتھ عمل کیا جائے اور خلفائے راشدین کے طریقے کے خلاف جو رسم و رواج پائے جاتے ہیں انھیں فوراً ختم کیا جائے۔[۱۴۴]

ایسے پاکیزہ ماحول میں فضل اللہ نے چار سال بسر کئے اور اس دوران میں نظام سلطنت میں بہت سی تبدیلیاں مشاہدہ کیں۔ محکمۂ عدل میں بہت سی اصلاحات کی گئیں اور شریعت کی ترویج کے لئے سلطان کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ احکام شریعت کے نفاذ کے لئے ہر شہر اور قصبے میں محتسب اور شحنے متعین ہوئے۔ قاضی عیسیٰ نے بحیثیت وزیر اعظم ملک کے طول و عرض میں جو زرعی اصلاحات کی تھیں فضل اللہ نے بڑے قریب سے ان کا مطالعہ کیا تھا۔ اس نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ سلطان یعقوب اپنی رعایا کے ساتھ نیکی کا سلوک کیا کرتا تھا اور لہو و لعب سے باز رہ کر حتی الوسع احکام شریعت پر عمل کیا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ علما اور فضلا کا بڑا قدر دان تھا۔[۱۴۵]

---

۱۴۳ ایضاً ورق ۱۶۶ ب۔ ۱۴۴ ایضاً ورق ۱۸۲ الف۔

۱۴۵ یونیورسٹی بلیٹن سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز لندن، جلد ۱۷/۲ ۱۹۵۵ء ص ۲۵۹

Marfat.com

قاضی عیسیٰ نے نظامِ سلطنت میں جو اصلاحات کی تھیں فضل اللہ نے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا۔ آئندہ زندگی میں جب عبید اللہ خان ازبک نے ان سے استدعا کی کہ وہ اسے ایسی کتاب تیار کر دیں جس پر عمل کر کے وہ بحیثیت حکمران نفاذ شریعت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے تو اس وقت اپنے سابقہ مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر ان کی رائے میں پختگی آچکی تھی اور ان کی معلومات محض سنی سنائی باتوں پر مبنی نہ تھیں۔

سلطان یعقوب نے ۲۴ دسمبر ۱۴۹۰ء کو وفات پائی اور اس سانحہ کے بعد انتظامِ سلطنت میں بدنظمی کا دور دورہ شروع ہوا۔ ان حالات میں فضل اللہ اپنی ذمہ داریوں سے مستعفی ہو کر اصفہان چلے آئے، جہاں وہ تصنیف و تالیف میں اپنا وقت گزارنے لگے۔ اسی زمانے میں شاہ اسمٰعیل صفوی آذربائیجان کے مطلع پر نمودار ہوا۔ جونہی ۲۳ دسمبر ۱۵۰۳ء کو مولانا فضل اللہ نے کاشان میں مشہور شیعی عالم علامہ حسن مطہر الحلّی دم ۱۳۲۵ء) کی کتاب نہج الحق کا رد کتاب ابطال نہج الباطل و اھمال کشف العاطل کے نام سے مکمل کیا اسی روز عراقِ عجم پر شاہ کے "منحوس قبضہ" کی خبر کاشان پہنچی۔

ان حالات میں بقول فضل اللہ ہجرت کے سوا اور کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ایران سے نکل کر کہاں سر چھپایا جائے؟ خراسان کے تیموری حکمرانوں کے شاہ اسمٰعیل کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے اس لئے ان کے دربار میں فضل اللہ کو اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی سوچ و فکر کے دوران مولانا کو امید کی ایک کرن نظر آئی۔ ماوراء النہر کا حاکم شیبانی خان کٹر سُنّی ہونے کی وجہ سے مولانا کا ہم مسلک اور شاہ کا سخت ترین مخالف تھا اس لئے مولانا نے اس کے دربار کی راہ لی۔ ۱۵۰۸ء میں ہمیں

Marfat.com

مولانا فضل اللہ شیبانی خان کے مصاحبوں اور اس کے دربار کے سربرآوردہ علمأ کی صف میں نظر آتے ہیں۔[۴۶]

شیبانی خان علمأ و فضلا کا قدردان ہونے کے علاوہ بذاتِ خود بڑا پڑھا لکھا اور صاحب ذوق حکمران تھا۔ اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قطعات آج بھی پیرس کے کتب خانہ کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ اکثر اوقات وہ دوسرے علمأ[۴۷] کی موجودگی میں مولانا فضل اللہ کے ساتھ علمی مسائل پر گفتگو کیا کرتا تھا۔

بعض اوقات خراسان اور ماوراء النہر کے علماء کی موجودگی میں خان موصوف مولانا سے ہی درخواست کیا کرتا تھا کہ وہ کسی علمی یا مذہبی مسئلہ پر گفتگو کا آغاز کریں۔[۴۸] ایسی مجالس میں موقع پاتے ہی مولانا شیبانی خاں کو شاہ اسمٰعیل کے خلاف اعلان جہاد کرنے پر اُبھارتے۔[۴۹] جو ان کے خیال میں صلیبیوں سے بڑھ کر گمراہ اور بے دین تھا۔[۵۰]

اپنی ترکی غزل میں، جو شیبانی خان نے عید الفطر کی صبح لکھی تھی، وہ مولانا فضل اللہ کو مخاطب کرتے ہوئے ایسی ہی علمی مجالس کا ذکر کرتا ہے۔[۵۱]

بعض اوقات جب خراسان اور ماوراء النہر کے علما کسی مذہبی مسئلے پر خانِ موصوف کو مطمئن نہ کر سکتے تھے تو وہ مولانا کو بلا کر ان سے صحیح جواب طلب کیا کرتا تھا۔[۵۲] کبھی کبھار خان ان سے خلوت میں ملاقات کرتا

---

[۴۶] فضل اللہ، مہمان نامۂ بخارا۔ مطبوعہ تہران ۱۹۶۲ء۔ ص ۳۲

[۴۷] ایضاً ص ۳ تا ۳۱، ۶۱ [۴۸] ایضاً ص ۱۲، ۱۴، ۱۵، ۱۷، ۱۹، ۲۹

[۴۹] ایضاً ۱۰۵، ۱۰۷ [۵۰] فضل اللہ۔ مہمان نامۂ بخارا مطبوعہ تہران ۱۹۶۲ء ص ۴۵۰

[۵۱] ایضاً ۱۹۷ [۵۲] ایضاً ص ۲۳، ۲۹۶

Marfat.com

اور ایسے مواقع پہ ان کو اپنے ساتھ کھانے میں بھی شریک کر لیتا تھا۔[۵۳]
اگر کبھی علالت کی بنا پہ مولانا دربار سے غیر حاضر ہوتے تو خان اپنے کسی مصاحب کو بھیج کر ان کی مزاج پرسی کیا کرتا تھا۔[۵۴] ایک بار جب مولانا خان کے ساتھ قزاقوں کے خلاف مہم میں شریک ہوئے تو اثنائے سفر علیل ہو گئے، خان بار بار ان کی مزاج پرسی کے لئے کسی نہ کسی شخص کو ان کے پاس بھیجتا تھا۔ علاوہ ازیں خان نے اپنے ذاتی معالج مولانا زائری کو ان کے معالجے کا حکم دیا۔[۵۵] جب مولانا صحت یاب ہو کر خان سے خواجہ احمد یسویؒ کے مزار مبارک پہ ملے تو خان اُٹھ کر ان سے گلے ملا۔[۵۶]

قزاقوں کے خلاف مہم پہ روانہ ہونے سے قبل سلطان نے علماء سے مشورہ کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ قزاقوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ صادر کریں۔ علماء نے بشمول مولانا فضل اللہ فتویٰ جہاد پہ اپنی اپنی مہریں ثبت کر دیں۔[۵۷]

ایک بار خان موصوف نے اپنے بیٹے تیمور سلطان کو حکم دیا کہ وہ تمام قضاۃ اور صوبہ داروں کے نام یہ فرمان جاری کرے کہ آئندہ سے یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے حصّہ دیا جائے۔ اس موقع پہ مولانا فضل اللہ میدانِ عمل میں کودے اور اُنھوں نے حدیث اور فقہ کے دلائل سے خان کو قائل کر کے وہ حکم واپس لینے پہ مجبور کر دیا۔[۵۸]

ایک بار خان نے جمعہ کے روز آپ کو حکم دیا کہ اس کی موجودگی میں وہ

---

۵۳ ایضاً ص ۱۳۳ ۵۴ ایضاً ص ۹۳
۵۵ ایضاً ص ۱۳۹-۱۴۰ ۵۶ ایضاً ۲۵۹
۵۷ ایضاً ص ۴۳ ۵۸ ایضاً ص ۲۶، ۲۸

Marfat.com

خطبۂ جمعہ ارشاد فرمائیں۔ مولانا نے اپنے خطبہ میں خان کو بحیثیت حکمران اپنے فرائض سے آگاہ کرتے ہوئے اُسے حضرت عمرؓ کے نقشِ قدم پر چلنے کا مشورہ دیا۔[۵۹] ایک دوسرے موقع پر خان نے آپ کو ایک انکوائری کمیشن کا صدر بنا کر اساتذہ اور طلبہ کے معاملات میں تحقیق کرنے کا حکم دیا۔ آپ کی سفارش پر خان نے اساتذہ کا مشاہرہ بڑھاتے ہوئے طلبہ کے لئے وظائف جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔[۶۰]

عام طور پر مولانا فضل اللہ جامع مسجد سمرقند، مدرسہ شیبانی خان اور موضع خرتنگ میں امام بخاریؒ کے مزار پر حدیث کا درس دیا کرتے تھے اور ان کے اپنے الفاظ میں دُور دُور سے ہزاروں طلبہ ان سے حدیث کا درس لینے آیا کرتے تھے۔[۶۱] جب کبھی مولانا شیبانی خان کے ساتھ سفر پر جاتے تو طلبہ کا جم غفیر ان کے ہم رکاب رہتا اور اثنائے سفر بھی وہ درس حدیث جاری رکھتے۔[۶۲] دیکھتے ہی دیکھتے مولانا کے شاگرد ماوراء النہر اور ترکستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے اور اُنہوں نے ہر جگہ حدیث اور دوسرے علوم شریعت کا درس جاری کیا۔[۶۳] تذکرۂ حسن نثاری کے مصنف کے قول کے مطابق ماوراء النہر کے اکثر و بیشتر علماء نے مولانا فضل اللہ کے حضور میں زانوئے تلمذ طے کیا تھا۔[۶۴] خود عبید اللہ خان ازبک والیٔ بخارا نے حصن حصین مولانا سے پڑھی تھی، اور دورانِ تدریس وہ ہمیشہ خان موصوف کو قزلباشوں کے خلاف جہاد کی ترغیب دیا کرتے تھے۔[۶۵]

---

[۵۹] ایضاً ص ۳۳ [۶۰] ایضاً ص ۳۰۶ [۶۱] ایضاً ص ۹۷ [۶۲] ایضاً ص ۲۵۴، ۲۵۵، ۳۴۲

[۶۳] ایضاً ص ۲۶۰، ۲۶۶ [۶۴] مینورسکی۔ پرشیا ان اے۔ ڈی ۱۴۷۸ - ۱۴۹۰ مطبوعہ لندن ۱۹۵۷ء ص ۴ (پیش لفظ) مینورسکی نے تذکرہ حسن نثاری کے روسی ترجمہ کا حوالہ دیا ہے۔ بدقسمتی سے یہ کتاب میری دسترس سے باہر ہے، [۶۵] فضل اللہ۔ مہمان نامۂ بخارا، ص ۵۶

Marfat.com

وسط ایشیا کے بے شمار علماء نے مولانا فضل اللہ سے روایت حدیث کی اجازت لی[66] علاوہ ازیں خود ان کے الفاظ میں حجاز، مصر، شام، آذر بائیجان، دیار بکر، عراق، فارس، خراسان، ماوراء النہر اور ترکستان کے بیشمار لوگوں نے ان سے قصیدۂ بردہ پڑھنے کی اجازت لی اور ایسے لوگوں کی تعداد بھی شمار سے باہر تھی جنہوں نے قصیدۂ بردہ کے متن کو مولانا کے متن سے ملا کر صحیح کیا[67]

ماوراء النہر کے قیام کے دوران مولانا نہ صرف ایک اعلیٰ پایہ کے عالم ہی تسلیم کئے جاتے تھے بلکہ عوام ان کو ایک خدارسیدہ درویش بھی سمجھتے تھے[68] ان کے اپنے بیان کے مطابق نقشبندیہ سلسلہ کے شہرۂ آفاق بزرگ خواجہ ناصر الدین عبید احرارؒ کے مرید بھی ان کی خدمت میں کسب فیض کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے[69]

۱۵۰۹ء میں فضل اللہ نے شیبانی خاں کی معیت میں مشہد مقدس میں امام علی رضاؑ کے مزار کی زیارت کی اور زیارت سے فارغ ہوتے ہی خان موصوف سے رخصت لے کر آپ امام غزالیؒ کے مزار کی زیارت کے لئے طوس روانہ ہو گئے[70] طوس میں چند روز قیام کے بعد آپ ہرات چلے گئے۔

---

۶۶ ایضاً ص ۳۵۰ ۶۷ فضل اللہ۔ شرح قصیدۂ بردہ، مخطوطہ ایڈنبرا یونیورسٹی لائبریری نمبر ۱۰۵، ورق ۳۱ الف، ۳۲ ب۔

۶۸ مینورسکی۔ پرشیا ان اے ڈی ۱۴۷۸-۱۴۹۰، ص ۴ (پروفیسر مینورسکی نے تذکرہ حسن نثاری کا حوالہ دیا ہے۔)

۶۹ فضل اللہ۔ مہمان نامۂ بخارا، ص ۲۵۱ ۷۰ ایضاً ص ۳۳۹

Marfat.com

جب ۲۳ رجمادی الاوّل ۹۱۵ھ / ۱۵۰۹ء میں آپ نے مہمان نامۂ بخارا مکمل کی تو آپ ہرات میں ہی قیام پذیر تھے[1]

فضل اللہ نے آٹھ برس شیبانی خاں کے دربار میں بسر کئے۔ مہمان نامہ بخارا کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ دَور ان کی زندگی کا بہترین دور تھا۔ بدقسمتی سے ۲ر دسمبر ۱۵۱۰ء کو شیبانی خاں نے مرد کے مقام پر اسمٰعیل صفوی سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا[2] اور اس کی شہادت کے بعد اسمٰعیل کے مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے ازبک ترکستان کی طرف چلے گئے۔

اسی اثنا میں بابر نے اسمٰعیل کی بھیجی ہوئی فوج کی مدد سے ماوراء النہر پر قبضہ کر کے سمرقند کو اپنا پایۂ تخت بنایا[3] بابر نے اسمٰعیل کے ساتھ اپنے وعدہ کے مطابق شیعہ علما کو اپنے عقائد کی تبلیغ کے لئے خاص مراعات دیں اور اس کے علاوہ اپنے سکوں پر ائمہ اثنا عشر کے نام منقوش کروائے[4]۔ ماوراء النہر کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی مساجد میں ایک شیعہ حکمران یعنی شاہ اسمٰعیل صفوی کا نام خطبہ میں پڑھا گیا[5] فضل اللہ ان دِنوں سمرقند میں قیام پذیر تھا بلکہ بقول اس کے وہ "ملحدوں" میں رہنے پر مجبور تھا[6]۔ یہ زمانہ بلاشبہ

---

[1] ایضاً ص ۲۵۶ [2] غلام سرور، ہسٹری آف شاہ اسمٰعیل صفوی، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۳۹ء، ص ۱۱۲

[3] اسکندر منشی۔ تاریخ عالم آرائے عباسی، مطبوعہ تہران ۱۳۱۴ شمسی جلد اوّل، ص ۳۰

[4] لین پول۔ کیٹلاگ آف اورئینٹل کوئنز ان دی برٹش میوزیم، مطبوعہ لندن ۱۸۹۰ء جلد پنجم ص ۱۶۳

[5] اسکندر منشی۔ تاریخ عالم آرائے عباسی۔ جلد اوّل، ص ۳۰۔

[6] فضل اللہ۔ سلوک الملوک، مخطوطہ لینن گراڈ، ورق ۷ ب۔

Marfat.com

فضل اللہ کی زندگی کا بدترین دور تھا۔

دو سال بعد ۱۵۱۲ء میں فضل اللہ کے شاگرد، رشید عبید اللہ خان ازبک نے بابر کے حلیف اور ایرانی سپاہ کے قائد نجم ثانی کو غجدوان کے مقام پر شکست دے کر قتل کر ڈالا اور بابر سے دو دو ہاتھ کرنے کے ارادہ سے سمرقند کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں وہ یسی کے مقام پر حضرت خواجہ احمد یسوی کے مزار پر دعا کے لئے حاضر ہوا اور وہیں اس نے خواجہ کو گواہ بنا کر خدا سے یہ وعدہ کیا کہ اگر اسے بابر پر فتح ہوئی تو وہ شریعت کے مطابق حکومت کرے گا۔ بابر بقول فضل اللہ نوے ہزار اور بقول حیدر دوغلات چالیس ہزار سپاہ کے ساتھ عبید اللہ کے مقابلہ کے لئے سمرقند سے نکلا۔ کول ملک کے مقام پر دونوں میں مقابلہ ہوا اس جنگ میں بابر کو شکست فاش ہوئی اور وہ بمشکل اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جانیں بچا کر سمرقند سے کابل کی جانب فرار ہوا۔ خدا تعالیٰ نے فضل اللہ کی دعا سن لی، اور اسے "ملحدوں" کے چنگل سے نجات ملی۔[۵۷] عبید اللہ نے ماوراءالنہر پر قابض ہوتے ہی فضل اللہ کو بخارا آنے کی دعوت دی اور اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے ان کی خدمت میں ایک ایسی کتاب لکھنے کی درخواست پیش کی جس میں حکومت کے ہر شعبہ کے متعلق شریعت کے احکام موجود ہوں۔ دو سال کی محنت کے بعد ۱۵۱۴ء (۹۲۰ھ) میں آپ نے "سلوک الملوک" اس کی خدمت میں پیش کی۔ حسن اتفاق سے اس کتاب کا اصل مسودہ بخارا میں ایک روسی مستشرق اے زیڈ، والی دوف کے ہاتھ[۵۸] لگا اور اس نے

---

[۵۷] ایضاً ص ۱۱ب، ۱۲ الف

[۵۸] مینورسکی، پرشیا ان اے۔ ڈی ۱۴۷۸ - ۱۴۹۰ ص ۸

اسے لینن گراڈ کے عجائب گھر موزے ایشیاٹیک کو دے دیا۔ پروفیسر مینورسکی کی سعی و کاوش سے اس کی مائیکروفلم مجھے مل گئی اور میں نے کیمبرج میں قیام کے دوران اس کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا۔

سلوک الملوک کی تصنیف کے بعد بھی فضل اللہ بے کار نہ بیٹھے بلکہ کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہے۔ ۱۵۱۵ء/۹۲۱ھ میں اُنھوں نے قصیدۂ بردہ کی شرح لکھی اور اصل قصیدہ کا فارسی میں منظوم ترجمہ بھی کر ڈالا۔[۷۹]

فضل اللہ نے اپنی زندگی کے آخری چھ سال بخارا میں اپنے سرپرست اور قدردان عبید اللہ خان کے دربار میں گزارے اور حسن روملو کی روایت کے مطابق وہیں ۷۷ سال کی عمر میں ۵ جمادی الاول ۹۲۷ھ مطابق ۱۳ اگست ۱۵۲۱ء کو وفات پائی۔[۸۰]

فضل اللہ کے آثار

۱۔ بدیع الزمان فی قصۃ حی ابن یقظان۔ فضل اللہ کی اوّلین تالیف ہے جسے اُنھوں نے ۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء سے قبل مکمل کر کے سلطان یعقوب کے نام منسوب کیا۔ بدقسمتی سے اس کتاب کا سُراغ دنیا کے کسی بھی کتب خانے میں نہیں ملتا۔

۲۔ مہمان نامہ بخارا کو فضل اللہ کی ذاتی ڈائری کہا جا سکتا ہے جس میں اُنھوں نے بخارا، سمرقند، مشہد اور مرو میں منعقد ہونے والے مباحث دینی

۷۹؎ فضل اللہ۔ شرح قصیدہ بُردہ۔ مخطوطہ ایڈنبرا یونیورسٹی لائبریری نمبر ۱۰۵

۸۰؎ حسن روملو۔ احسن التواریخ، مطبوعہ بڑودہ ۱۹۳۱ء ص ۱۷۴

کی تفصیلات دی ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے شیبانی خاں کی قزاقوں کے خلاف مہم کا بھی بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ مولانا اس کا نام سفرنامہ بخارا رکھنا چاہتے تھے لیکن شیبانی خان کے اصرار پر اسے مہمان نامہ بخارا کا نام دیا۔ یہ کتاب تہران سے ۱۹۶۲ء میں دکتر منوچہر ستودہ کی سعی و ترتیب سے شائع ہو چکی ہے۔

۳۔ کتاب البطال نہج الباطل و اہمال کشف العاطل مولانا کی عربی زبان میں ایک اہم تالیف ہے اور جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ یہ کتاب انھوں نے مشہور شیعی عالم علامہ حسن مطہر الحلیؒ کی منہج الحق کے رد میں لکھی تھی۔ جس دن یہ کتاب مکمل ہوئی تھی اسی دن شاہ اسمٰعیل صفوی کے عراقِ عجم پر قبضہ کی خبر فاضل مصنف کو ملی۔ اس کتاب کا بھی کوئی نسخہ تاحال دستیاب نہیں ہو سکا۔

۴۔ تاریخ عالم آرائے امینی مولانا فضل اللہ کی بہت ہی اہم تالیف ہے جس میں انھوں نے سلطان یعقوب کے عہد کے واقعات قلم بند کئے ہیں۔ اس کتاب کے دو قلمی نسخے ہمارے علم میں ہیں۔

i۔ مخطوطہ نمبر ۴۴۳۱۔ فاتح لائبریری استانبول (۲۲۵ اوراق)

ii۔ مخطوطہ نمبر ۱۰۱۔ بیبلیوتھیک نیشنل، پیرس، (۲۰۷ اوراق)

اس کتاب کے چیدہ چیدہ صفحات کا انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۹۵۷ء میں پروفیسر مینورسکی آنجہانی نے "پرشیا ان اے۔ ڈی ۱۴۷۸-۱۴۹۰" کے نام سے شائع کیا۔

۵۔ سلوک الملوک بلاشبہ مولانا فضل اللہ کی سب سے اہم تصنیف ہے جو انھوں نے عبید اللہ خاں کی استدعا پر لکھی تھی۔ اس کتاب کے پانچ نسخے میرے علم میں ہیں۔

Marfat.com

i۔ برٹش میوزیم لندن، مخطوطہ اورینٹیل نمبر ۲۵۳۔
ii۔ موزے ایشیاٹیک لینن گراڈ کا نسخہ مولانا فضل اللہ کے ہاتھ کی تحریر ہے۔
iii۔ جامعہ نظامیہ حیدر آباد کا نسخہ
iv۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کا نسخہ
v۔ آصفیہ لائبریری حیدر آباد کا نسخہ۔

حال ہی میں ڈاکٹر نظام الدین صاحب مرحوم نے دائرۃ المعارف حیدر آباد کی طرف سے یہ کتاب شائع کر دی ہے لیکن ابھی تک میری نظر سے نہیں گزری۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ وفیسر آربری آنجہانی کے توسط سے صرف ایک صفحہ بطور نمونہ مجھے بھیجا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ٹائپ میں بڑی نفاست کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔

۶۔ شرح قصیدۂ بردہ یہ کتاب مولانا نے سنہ ۹۲۱ھ / ۱۵۱۵ء میں بخارا میں قلمبند کی تھی اور جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے مولانا اپنے دور میں قصیدۂ بردہ پر آخری سند سمجھے جاتے تھے اور دور دراز کے علاقوں سے سینکڑوں کی تعداد میں مشتاقین ان سے قصیدہ کا ورد کرنے کی اجازت لینے آیا کرتے تھے۔ اس کتاب کے تین مخطوطے ہمارے علم میں ہیں۔

i۔ مخطوطہ نمبر ۳۴۳۱، نور عثمانیہ لائبریری، استانبول۔
ii۔ مخطوطہ نمبر ۹۸۹، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ،
iii۔ مخطوطہ نمبر ۱۰۵، ایڈنبرا یونیورسٹی لائبریری، ایڈنبرا، سکاٹ لینڈ،
آخری نسخہ کے ۱۱۳ اوراق ہیں جس سے اس کی ضخامت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۷۔ رسالۂ حارثیہ۔ یہ رسالہ مولانا فضل اللہ نے حدیثِ حارث

Marfat.com

کی تشریح میں لکھا تھا۔ اس کا کوئی نسخہ ہمارے علم میں نہیں۔ مہمان نامۂ بخارا میں اس کا حوالہ موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ۹۱۵ھ/۱۵۰۹ء سے قبل تحریر کیا تھا۔

۸۔ رسالہ در حقیقت وانواع حدیث قدسی مولانا فضل اللہ کے ۴ ورق کے اس مختصر سے رسالہ کا واحد نسخہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں موجود ہے جس میں اُنھوں نے حدیث قدسی کی اقسام ایک عزیز کے استفسار پر ذرا تفصیل سے لکھی تھیں۔ یہ رسالہ ۲۴ رذی قعدہ ۹۲۲ کو "دقصبہ کرمینہ من سغد سمرقند" میں ورطۂ تحریر میں آیا۔

۹۔ مولانا فضل اللہ نے شیخ علی بن عیسیٰ الاربلی کی مشہور تالیف "کتاب کشف الغمہ" کا ایک خلاصہ تیار کیا اور پھر اس کی شرح لکھی بدقسمتی سے یہ کتاب بھی اب مفقود ہو چکی ہے۔

ان کتب ورسائل کے علاوہ ان کا ایک فارسی اور ایک ترکی قصیدہ منشآت السلاطین میں محفوظ ہے، ان قصائد میں اُنھوں نے سلطان سلیم عثمانی سے استدعا کی ہے کہ جس طرح سکندر نے ایران پر حملہ کر کے دارا کو شکست دی تھی اسی طرح آپ بھی ایران پر حملہ کر کے شاہ اسمٰعیل صفوی کو شکست دیں۔ مولانا کی یہ آرزو ان کی زندگی ہی میں پوری ہو گئی اور سلطان سلیم نے چالدران کی جنگ میں شاہ اسمٰعیل کو شکست فاش دے کر اس کے پایۂ تخت تبریز پر قبضہ کر لیا۔

مولانا کی کتابوں کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے مندرجہ بالا کتب کے علاوہ اور کتابیں بھی تحریر کی تھیں۔ جو زمانہ کی دستبرد سے ہم تک نہیں پہنچ پائیں۔

Marfat.com

۱۔ مناقب پیر جمال اردستانیؒ
۲۔ شرح صحیح المسلم
۳۔ شرح وصایائے خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ
۴۔ حاشیہ بر حواشی شرح جدید
۵۔ حاشیہ بر تفسیرِ کشاف
۶۔ رسالہ مقاصد
۷۔ حاشیہ بر محالات
۸۔ حلِ تجرید
۹۔ حاشیہ بر کتاب شرح مواقف

رسالہ در حقیقت و انواع حدیث قدسی

(یہ چار ورق کا مختصر سا رسالہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے مجموعہ سبحان اللہ (۲۹۷/۱۳) میں محفوظ ہے اور جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے یہ واحد نسخہ ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ مولانا کے حالات کے ساتھ اسے بھی شائع کر دیا جائے تاکہ یہ محفوظ ہو جائے۔ رسالہ کا رسم الخط نستعلیق ہے حتیٰ کہ عربی عبارات بھی نستعلیق میں ہی لکھی ہوئی ہیں۔ رسالہ قدرے کرم خوردہ ہے اس لئے پڑھنے میں ذرا دقت ہوتی ہے۔)

الحمد للہ الذی نزلِ احسن الحدیث کتاباً منسمیّ القدسیِ خطاباً

والصلوٰۃ علیٰ سیدنا محمد الراوی عن ربّہ حکمۃ وصوابا
وعلیٰ آلہ واصحابہ ما انشأ الریاح سحابا، و بعد نمودہ می شود کہ
یکی از اصحاب کہ در زمرہ سادات رتبہ ارجمندان داشت و از ارباب سعادات
نزد ما مرتبہ فرزندان داشت[1]۔ التماس نمودہ کہ حقیقت حدیث قدسی جہت
اُو بیان کردہ شود و بعضی ازان با ترجمہ در طی بیان حقیقت اُو آوردہ شود
بہ حسب التماس آن فرزند اعز ارجمند این ورقہ مکتوب گشت۔ اُمید کہ
فوائد آن مسلمانان را شامل گردد و ما را ثواب تبلیغ علم حاصل گردد ان شاء اللہ
تعالیٰ والتوفیق منہ فی کل باب۔

بدان ایدک اللہ تعالیٰ کہ حدیث قدسی حدیثی است کہ حضرت پیامبر
صلی اللہ علیہ وسلم آنرا روایت فرمودہ باشد از پروردگار خود بصیغہ کہ دلالت
کند بر آنکہ آن فرمودۂ حق تعالیٰ است و حرف متعلق بلفظ آن نباشد و
مراد از عدم تعلق حرف بلفظ آنست کہ لفظ آنرا جنب و حائض تواند خواند
و بی طہارت مساسِ آن توان کرد و بدین قید ممتاز می گردد از قرآن و فرق
میان او و قرآن از چند وجہ است، اول آنکہ حدیث قدسی مروی پیغامبر
است از حضرت حق تعالیٰ و قرآن منزل بوحی است۔ دوم آنکہ قرآن
لا بد است کہ منزل بر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بواسطۂ جبریل باشد و در
حدیثِ قدسی این لازم نیست۔ سیوم آنکہ لفظ حدیث قدسی لازم نیست
کہ بر حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم از جانب حق تعالیٰ وارد شدہ باشد
بلکہ معنی آن ملقی بر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شدہ و لفظ می تواند بود کہ

---

[1] مراد باین سیدی کہ رتبہ ارجمندان دارد میر سلطان محمود مشہور بمیر کہ سید غیاث است

Marfat.com

از ان پیغامبر باشد صلی اللہ علیہ وسلم، وچون این مقدمہ معلوم شد باید
دانست کہ حدیث قدسی ہر چند نوع است - نوع اوّل آنکہ در شب
معراج بعد از قطع سموات وعبور از سدرۃ المنتہیٰ چون بشرف لقای حضرت
جل وعلا مشرف گشت حق تعالی با آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم مکالمہ فرمود
وآن کلام را آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم با امت خود روایت کرد ودر
عدد آن اختلاف کہ دہ اند بعضی گویند کہ او سہ قسم بود، یک قسم آنکہ حضرت
حق تعالی امر فرمود کہ آنرا بہ بندگان برساند، وقسم دوم آنکہ امر فرمود کہ آنرا
پوشیدہ دارد از بندگان زیرا کہ منفعت آن خاصہ آنحضرت بود صلی اللہ علیہ
وسلم ودیگر امتان آنرا نمی فہمیدند پس از ایشان پوشیدہ بایست داشتن،
قسم سیوم آنکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مرخص بود کہ اگر خواہد رساند واگر
نخواہد نرساند، بعضی گویند سی ہزار حدیث بود واز آنجملہ کتابیست کہ آنرا
احمدیات گویند ودر آنجا بسیاری از احادیث است یا احمد محبتی
محبۃ الفقراء فقرب مجلسھم منک ادنک یعنی ای احمد دوستی
من دوستی فقرا است پس نزدیک گردان مجلس ایشان را کہ بخود کہ نزدیک
کردم من بتو، اما علمای حدیث را در صحت احادیث احمدیات سخن است
وتعیین عدد آن احادیث در صحیح وارد نشدہ واز جملہ، احادیث قدسیہ کہ
در صحیح وارد نشدہ کہ در شب معراج در مکالمہ حق با آنحضرت بودہ این حدیث
است، ھی خمسٌ وَھی خمسون لا یُبدّل القول لدیّ یعنی این نمازہا
کہ بر بندگان فرض گردانیدم پنج نماز است وثواب پنجاہ نماز دارد وتبدیل کردہ
نمی شود قول نزد من، یعنی سخن من وامر من تبدیل نمی یابد - ونیز این حدیث
دیگر است، امضیت فریضتی وخففت عن عبادی یعنی فریضہ خود را

امضاء کردم واز بندگانِ خود تخفیف نمودم، واین ہر دو حدیث در شبِ معراج وارد شده بعد از آنکه نماز پنجاه وقت مقرر شده بود باشارۂ موسیٰ درخواست آن حضرت علیہما الصلوٰۃ والسلام از پنجاه بر پنج مقرر شده، حق تعالیٰ این دو حدیث بہ آنحضرت فرموده ونیز در احادیث قدسیہ شبِ معراج وارد شده۔ یا محمد انہن خمس صلوٰۃٍ کُلّ یومٍ ولیلۃٍ لکل عشر فذلك خمسون صلوٰۃً من ھمّ بحسنۃ فلم یعملھا کتبت لہٗ حسنۃ فان عملھا کتبت لہٗ عشراً ومن ھمّ بسیئۃ فلم یعملھا لم یکتب لہٗ شیئٌ وان عملھا کتبت لہٗ سیئۃ واحدۃ۔ یعنی ای محمد این نمازہای فرض کرده شود بر تو پنج نماز است در شبانہ روزی مر ہر نمازی را ثواب ده نماز است پس پنجاه نماز باشد، ہر کہ قصد نیکو کند وآنرا بعمل نیاورد از برائے او ثواب یک حسنہ نویسند، پس اگر بعمل درآورد او را ثواب ده حسنہ نویسند، وہر کہ قصد کار بدی کند وبعمل نیاورد وہیچ چیز بر و ننویسند۔ واگر بعمل آورد از برای او یک گناه نویسند۔ نوع دوم از حدیث قدسی آنست کہ معنیٔ آن حق تعالیٰ در دل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم می افگند وآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعبارتِ خود آنرا بیان می فرماید، واز صحاح آن احادیث حدیث است قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما یرویہ عن ربہ اعددت لعبادی الصالحین[۲] مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ یعنی مہیا گردانیده ام از برای بندگان صالح خود آن چیزی کہ ندید چشمی ونہ گوشے شنید ونگذشت بر دل آدمی مراد آنکہ ثواب بندگان

---

[۲] مراد از صالحان عارفان اسرار باطن و مراد از مالا عین رازہای درونی ایشان است کہ عنایت الہی باعطا بیش خاص گردانده۔

صالحان بسیار عظیم است که مثل آن کس ندیده و نشنیده و در دل کسی نگذشته
و دیگر این حدیث است که در صحیح مسلم از ابوذر روایت کرده قال الله تعالی
یا عبادی کلکم ضال الا من هدیته فاستهدونی اهدکم یا عبادی
کلکم جائع الا من اطعمته فاستطعمونی اطعمکم یا عبادی
کلکم عار الا من کسوته فاستکسونی اکسکم یا عبادی انکم تخطئون
باللیل والنهار وانا اغفر الذنوب جمیعا فاستغفرونی اغفر لکم
یا عبادی انکم لن تبلغوا ضری فتضرونی ولن تبلغوا نفعی فتنفعونی
یا عبادی لو ان اولکم و آخرکم وانسکم وجنکم کانوا علی اتقی قلب
رجل واحد منکم ما زاد ذلک فی ملکی شیئا یا عبادی لو ان اولکم
و آخرکم وانسکم وجنکم کانوا علی افجر قلب رجل واحد منکم
ما نقص ذلک من ملکی شیئا یا عبادی لو ان اولکم و آخرکم وانسکم
وجنکم قاموا فی صعید واحد فسألونی فاعطیت کل انسان مسئلته
ما نقص ذلک مما عندی الا کما ینقص المخیط اذا دخل البحر
یا عبادی انما هی اعمالکم احصیها لکم ثم اوفیکم ایاها فمن
وجد خیرا فلیحمد الله ومن وجد غیر ذلک فلا یلومن
الا نفسه صدق یا رسول الله۔

ترجمه حدیث قدسی۔ ای بندگان من، همه شما گم راهید مگر آن کسی که من
راه نمایم او را، پس طلب راه راست کنید از من که من راه راست نمایم
شما را، ای بندگان من، همه شما گرسنه اید مگر آنکسی که من اطعام کنم او را،
پس طلب طعام کنید از من که اطعام نمایم شما را، ای بندگان من، همه شما
خطا می کنید در شب و در روز و من می آمرزم گناهان را، همه پس طلب آمرزش

کنید از من که بیامرزم شما را ، ای بندگان من شما نمی رسید بر سانیدن گزند بمن پس تا گزند رسانید بمن و نمی رسید به سانیدن نفع بمن تا نفع رسانید مرا ، ای بندگان من اگر آنکه اول شما و آخر شما و انس شما و جن شما باشند بر دل متقی ترین مردی از شما نه زیادت می گرداند در ملک من چیزی را ، ای بندگان من اگر آنکه اول شما و آخر شما و انس شما و جن شما باشند بر دل فاجر ترین مردی از شما کم نمی گرداند در ملک من چیزی را ، ای بندگان من اگر اول شما و آخر شما و انس شما و جن شما بایستند در یک زمین هموار پس بخواهند هر یکی از من آنچه مطلوب او باشد پس من بدهم هر کس را آنچه خواسته کم نگرداند از ملک من چیزی را الا آن قدر که کم میگرداند سوزن هرگاه که در دریا فرو برند ، ای بندگان من نیست این عملهای شما که من آن را شمارم و ضبط میکنم پس از ان جزای آن تمام بشما می رسانم ، پس آنکسی که می یابد چیزی را باید که ستایش کند پروردگار را و آنکسی نیابد غیر آن پس باید که ملامت نکند مگر نفس خود را ، تمام شد " و امثال این نوع در احادیث قدسیه بسیار است ، نوع سیوم آنست که حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم از جبرئیل علیہ السلام روایت می کند و او از حضرت حق تعالیٰ جل و علا روایت میکند و از آنجمله است حدیث مسلسل بروایت اہل بیت که در آنجا امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ فرمود که حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم فرمود که حضرت جبرئیل علیہ السلام فرمود که حضرت حق تعالیٰ فرمود کلمۃ لا الہ الا اللہ حصنی فمن قالها دخل فی حصنی ومن دخل فی حصنی امن من عذابی — یعنی کلمہ لا الہ الا اللہ حصار من است پس آنکسی که گفت آن کلمہ را در آمد در حصار من و ہر کس که در آمد در حصار من ایمن

گشت از عذاب من ، و امثال او در احادیث قدسیه بسیار است ، نوع
چهارم از احادیث قدسیه آنست که آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم از معنی قرآن
استنباط فرموده باشد و در آخر صورت آیت را باستشهاد آورده باشد و امثله
او در احادیث بسیار است . نوع پنجم از احادیث قدسیه آنست که آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم از اوامر و احکام الٰہی نسبت با امم سالفه یا از کتب استنباط
فرموده باشد یا از مجاری اقوال سالفان در اجرای حکم قضای الٰہی در شان
ایشان فراگرفته باشد و این نوع را هم امثله بسیار است . نوع ششم آنکه
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حق تعالیٰ را در واقعه دیده باشد و در رویای
صالحه که یک جزو از اجزای نبوت است حضرت حق تعالیٰ با آنحضرت صلی اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم خطاب فرموده باشد و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
حکایت آن خطاب با امت فرموده باشد و از آنجمله است حدیثی که در
باب کفارت وارد شده و از کتب صحاح موجود است ، این شش نوع است
حدیث قدسی که امثله و شواهد آن در احادیث بسیار واقع شده و اگر درین
محل بسط نموده مجلدی کبیر تالیف باید کرد و علی حسب فیض الوقت این چند
ورق مکتوب شد و بعضی امثله آورده گشت تا اطلاع بر انواع آن میسر
گردد ، والتوفیق من اللہ الاحد ، تمت الرسالة بیمن مؤلفها
العبد فضل اللہ بن روزبهان المشتهر بخواجه مولانا اصفهانی
بلغه اللہ اقصی الامانی فی الرابع والعشرین من شهر
ذی قعده سنه اثنین وعشرین وتسعمأیه وقد کتبت
فی بعض لیلة من اللیالی والحمد للہ علی فیضه الکامل
ولطفه الشامل وفضله الحاصل بقصبته کرمینه من

Marfat.com

اعمال سغد سمرقند والحمد لله الواحد الاحد و
والختم بالصلوٰة والسلام على سيدنا ونبينا محمد
صلى الله وعليه وسلم.

كاتب محمد باقر بن عبد الله اليمني، المشتهر بامير عرب، صفر سنه
ثمان وستين وتسعمائة.

Marfat.com

مبلغ الرجال

مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خواجہ عبید اللہ المعروف بخواجہ کلاں رح بن خواجہ باقی باللہ دہلوی رح کی ایک نادر فارسی تصنیف مبلغ الرجال کا مخطوطہ موجود ہے، جس کا فہرست نگار نے یونیورسٹی کلکشن میں نمبر ۱۹۱ کے تحت اندراج کیا ہے۔ یہ مخطوطہ ۴۴ اوراق پر مشتمل اور کافی حد تک کرم خوردہ ہے۔ اس رسالہ کا ایک اور نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے۔ جس کا فہرست نگار نے دہلی کلکشن میں نمبر ۱۱۲ کے تحت اندراج کیا ہے[1]۔ اس وقت تک اس رسالے کے یہی دو نسخے منظر عام پر آئے ہیں۔

مبلغ الرجال کے سرورق پر یہ عبارت موجود ہے: "رسالہ مبلغ الرجال من مصنفات حضرت خواجہ کلاں بن حضرت خواجہ باقی باللہ - ۱۰ ارجمادی الاولی یوم الثلثا ۱۰۷۶ ہجری صلعم"[2] اسی طرح رسالہ کے اختتام پر یہ عبارت درج

---

[1] مائیکروفلم عندی [2] مبلغ الرجال، نسخہ علی گڑھ، سرورق۔

Marfat.com

ہے" وقد فرغت من تسوید هذه العجالہ ست وستین بعد الف"[۵۳] ۱۰۶۶ ان دونوں تحریروں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں اس رسالہ کا سالِ تالیف اور سالِ کتابت ایک ہی ہے ۔ اگر مصنف کے نام سے پہلے "حضرت" تحریر نہ ملتا تو ہم یہ باور کر لیتے کہ یہ رسالہ فاضل مصنف ہی کا تحریر کردہ ہے ۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ کاتب نے اسے سالِ تالیف ہی میں اصل نسخے سے نقل کیا ہے ۔

مولانا عبدالحیؒ نے نزهتہ الخواطر میں خواجہ کلاںؒ کی تصانیف کا ذکر کیا ہے لیکن ان میں مبلغ الرجال شامل نہیں۔[۵۴] اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس رسالہ کے مخطوطات نایاب ہیں اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کسی دوسری کتاب میں اس رسالہ کا نام دیکھنے میں نہیں آیا، اس لئے مولانا عبدالحیؒ اس رسالہ سے بے خبر تھے ۔ اس رسالہ کا نام مبلغ الرجال عبارت کے درمیان میں بھی موجود ہے اس لئے اس میں شک نہیں کہ یہ رسالہ اسی نام سے موسوم ہے[۵۵]

فاضل مصنف اس رسالہ کی ابتدا یوں کرتے ہیں ۔ الحمد للہ علیٰ ما منّ علینا بالارشاد إلی سواء السبیل والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد ارالعد ۔ گوید بندہ سرافگندہ شرمندہ از کردار تباہ سراپا گناہ خانہ زاد خواجہ آفاق سبطِ آل نبی مؤید الملتہ والدین الوالوقت خواجہ محمد الباقی قدس سرہٗ ، احقر عبیداللہ سامحہ اللہ سبحانہ[۵۶]

---

[۵۳] ایضاً ۔ ورق آخر ۔ [۵۴] نزہتہ الخواطر، جلد پنجم، مطبوعہ حیدر آباد، ۱۹۵۵ء، ص ۲۶۹
[۵۵] "این رسالہ را مبلغ الرجال نام کردہ شد" ورق ۳ الف [۵۶] مبلغ الرجال، ورق ۱ ب

اس رسالہ میں اکثر جگہ ایسی ہی مرصع عبارات موجود ہیں۔ مثلاً محمود بیخوانی کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ کلاں رقمطراز ہیں :۔

"از املاک ولایت خوزستان در عنفوان سن شعور طریق طلب معرفت و کسب سعادت برگزیدہ دل از وطن مالوف بریدہ، واز ناز و نعم دست افشاندہ در ویرانہائی آن سرزمین گوشہ انزوا گزیدہ بود و آنجا بطاعت و عبادت و ذکر و مراقبہ مشغول بودہ"[1]

اس کتاب کی تالیف کے دوران فاضل مصنف نے مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا ہے۔

مرأۃ الجنان، کتاب الانساب، مصباح الھدایہ، اصطلاحات، مفتاح الانوار، احیاء العلوم، کتاب التنزیل، مشکوٰۃ الانوار، تنزیۃ العقائد اور شرح تعرف۔

ان کتابوں سے استفادہ کے علاوہ فاضل مصنف نے مندرجہ ذیل بزرگوں کے اقوال بھی اس رسالہ میں نقل کئے ہیں۔

ابو علی دقاقؒ، شہاب الدین نوربخشی، مولانا رومیؒ، احمد غزالیؒ، محمد غزالیؒ عین القضاۃ ہمدانی۔ شیخ عبداللہ یافعیؒ، ابن جوزیؒ، ابن الاثیر الجزریؒ، ابو سعید ابو الخیرؒ، میر سید شریف، شیخ عبدالرزاق کاشی، فرید الدین عطارؒ، حسین بن منصور حلاج، شیخ شہاب الدین مقتول، شیخ ابراہیم کانپوریؒ، شیخ ابو محمد حریری، عزیز الدین محمد نسفیؒ، ملا حسین کاشفیؒ، خواجہ غیاث الدین مقصود کازرونی،

---

[1] ایضاً - ورق ب ۳۱

Marfat.com

حضرت علیؓ، ابوالحسن نوریؒ، اوحدالدین کرمانیؒ، سہل بن عبداللہ تستریؒ، بایزید بسطامیؒ، جنید بغدادیؒ، شبلیؒ، خواجہ باقی باللہؒ، ابوبکر وراقؒ، ابوالحسن خرقانیؒ، فخرالدین عراقیؒ، شیخ عبدالحق محدثؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، شیخ محی الدین اکبر ابن عربیؒ، ابوبکر کلابادیؒ، ابوالعباس ابن عطا ارمی اور محمود پسیخوانی۔

اس رسالہ میں مندرجہ ذیل اشخاص کا ذکر کسی نہ کسی سلسلہ میں آیا ہے۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ، محمود غزنوی، شریف آملی، امیر تیمور، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہان، اسمٰعیل صفوی، شیخ مبارک، لاڈو فیضی، ابوالفضل، ابوالخیر، ابوالبرکات، ابوالمکارم، ابراہیم لودھی، اسمٰعیل بن جعفر صادق، اویس قرنیؒ، حسن بصریؒ، عبداللہ بن المقتنع، ہارون الرشید، داؤدؑ، جلال الدین تھانیسری، شاہ قاسم انوار، میاں شیخ میر، شیخ عبدالجلیل، نوشیرواں، مزدک، ابوالعباس السفاح، ابوجعفر منصور، خلیفہ ہادی، مولانا زاہد بلخی، شیخ حسین خوارزمی، خلیفہ المتوکل، المعتصم، بابک رومی، یعقوب بن المقبل، عبداللہ بن سبا، شیخ محمد بن حسن ملتانی، سیف الدین بن شیخ سعداللہ بخاری، شیخ حمید افغان، سید رفیع الدین صفوی، سلطان سنجر، ابراہیم زردشتی اور گشتاسپ بن لہراسپ۔

فاضل مصنف نے چونکہ طریقت کے اعلیٰ مقامات حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں رہ کر طے کئے تھے، اس لئے جہاں کہیں بھی حضرت کا ذکر آیا ہے مصنف نے ان کا ذکر بڑے عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ایک جگہ آپ ان کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

یکے از کبار صوفیا اعنی بدرالملت والدین ابوالبرکات شیخ احمد بن شیخ عبدالاحد السہرندی الفاروقی النقشبندی قدس سرہٗ[۵۸]

---

[۵۸] ایضاً۔ ورق ۴، الف

Marfat.com

ایک دوسرے موقع پر ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

شیخ الشیوخ العصر شیخ بدر الدین ابو البرکات احمد السہرندی الفاروقی النقشبندی قدس سرہٗ۔[۹]

اس رسالہ میں ایک جگہ حضرت کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

شیخ الشیوخ العصر امام الراسخین و قدوۃ المتمکنین بدر الملت والدین ابو البرکات شیخ احمد السرہندی الفاروقی النقشبندی قدس سرہٗ۔[۱۰]

آمدم بر سرِ مطلب، اس رسالہ میں چار وصل اور ایک فصل موجود ہے جیسا کہ فاضل مصنف فرماتے ہیں: "مطلب این رسالہ در چہار وصل (بواؤ) و یک فصل (بفاء) تحریر می یابد" ان وصول کے مطالب درج ذیل ہیں۔

وصل اوّل - در بیان مذہب حکماء

وصل دوم - در بیان مذہب متکلمین و جمہور قدماء صوفیہ

وصل سوم - در بیان مذہب اتباع شیخ محی الدین ابن العربی قدس سرہٗ، حکماء اشراقین و تصرف کہ شیخ العصر بدر الدین ابو البرکات احمد السرہندی الفاروقی النقشبندی قدس سرہٗ درین مسئلہ نمودہ اند۔

وصل چہارم:- در بیان فضل و رجحان مقام انبیاء علیہم السلام و برکہ بر مسلک ایشان علیہم السلام رسوخ ورزد۔

فصل بفاء - در مذہب ملاحدہ حفظہم اللہ سبحانہٗ۔

اب ہم ان میں سے ہر موضوع پہ الگ الگ بحث کریں گے۔

---

[۹] ایضاً، ورق ۴ الف

[۱۰] ایضاً، ورق ۲۲ ب

Marfat.com

وصل اوّل :۔ فلاسفہ کا کہنا ہے :۔

واجب الوجود موجب نداشت عالم از ذات او صادر شدہ چنانچہ شعاع از قرص، و وجود معلول از علّت، لیس تا قرص آفتاب بود شعاع آفتاب، وکذا الحکم فی العلۃ والمعلول، و می گویند کہ اوّل چیزے از باری تعالیٰ صادر شد جوہری بود، نام آن جوہر عقل است اوّل، و این بر اصل اہلِ حکمت است کہ انہ لا یصدر من الواحد الا الواحد، پس از باری تعالیٰ کہ احد حقیقی است، احد حقیقی صادر شد و آن عقل اوّل است۔[11]

فلاسفہ کا یہ خیال ہے کہ اسی عقل سے روح و نور، جبرئیلؑ، میکائیلؑ عزرائیلؑ اور اسرافیلؑ پیدا ہوئے، اور اسی سے لوح و قلم، بیت المقدّ، بیت العتیق، و بیت الاوّل اور مسجد اقصیٰ وجود میں آئے۔ پھر اسی عقل سے آدمؑ، ملک مقرب اور عرشِ عظیم ظہور میں آئے، اور جو کچھ بھی معرضِ وجود میں آیا ہے، یہ "جملہ اسامی این عقل اند"۔[12]

اس کے علاوہ فلاسفہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ یا تو جوہر ہے یا عرض۔[13] فلاسفہ کے ان اقوال کی تائید میں آپ نے احمد غزالیؒ، ابو وفاق، شہاب الدین تورپشتی، مولانا رومیؒ، محمد غزالیؒ، عبدالرحمٰن الجوزیؒ عبداللہ یافعیؒ، ابن الاثیر الجزریؒ اور عین القضاۃ ہمدانیؒ کے اقوال نقل

---

[11] ایضاً، ورق ب۴ [12] ایضاً، ورق ۵ الف

[13] ایضاً، ورق ب۵

Marfat.com

کئے ہیں۔

وصل دوم:۔ خواجہ کلاںؒ رقمطراز ہیں کہ علماء متکلمین کہتے ہیں ہر "اوّل چیزے کہ از دریائے عدم لباس وجود آمد جوہرے بود آں جوہرے بشگافت و دو شاخ شد، شاخے از ان بہ مبداء عالم ارواح است و شاخے مبداء عالم اجسام۔ مبداء عالم ارواح در زبانِ شرع ماء خواندہ شدہ۔ وجعلنا من الماء کل شئی حیّ افلا یومنون۔[۱۴]

متکلمین میں ایک گروہ ایسا بھی موجود ہے جس کا یہ خیال ہے کہ سب سے پہلے خدا نے جوہر خاک پیدا کیا اور اس کے واسطے سے دوسری چیزیں پیدا کیں[۱۵] اس نظریہ کی تائید میں بھی خواجہ کلاںؒ کو عین القضاۃ ہمدانیؒ اور احمد غزالیؒ کے اقوال مل گئے ہیں۔

وصل سوم:۔ اہلِ وحدت کا یہ خیال ہے کہ وجود ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا، اور اس وجود سے ان کی مراد وجود باری تعالیٰ ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ باری تعالیٰ کا وجود کوئی جزو یا حصّہ رکھتا ہو۔ اہلِ وحدت کہتے ہیں کہ اس کا ایک وجود ظاہری ہے اور دوسرا باطنی، اور یہ باطنی وجود نور ہے اور یہی نور جانِ عالم ہے اور اسی نور سے یہ عالم مالا مال ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ "ظاہر این وجود مظاہر صفات این نور اند۔ ہر اسمے و فعلے و صفتے کہ در عالم است جملہ آسامی و افعال از پرتوِ نور وجود است۔"[۱۶]

---

[۱۴] ایضاً، ورق ۷ الف [۱۵] ایضاً، ورق ب۷
[۱۶] ایضاً، ورق ۱۳ الف۔

Marfat.com

اہل وحدت یہ بھی کہتے ہیں کہ "حقیقت امواج متکثرہ بحر جز بحر نسیت"۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ کلمات وحروف کی حقیقت اسی ذات کی تجلیات ہیں۔ اہل وحدت کہتے ہیں کہ "ہمہ صورت ہای علمی حق اندکہ حق تعالیٰ خود را باین صور تہا ظاہر گردانیدہ است"[۱۷] اس نظریہ کی تائید میں خواجہ کلاںؒ نے صوفیۂ موحدہ میں سے میر سید شریف، امام غزالیؒ، شیخ شہاب الدین مقتول، ملا حسین کاشفی، خواجہ غیاث الدین منصور کازرونی، حسین بن منصور حلاج، شیخ عبدالرزاق کاشی، فریدالدین عطارؒ، ابوالحسن نوریؒ، اوحدالدین کرمانیؒ، شیخ ابراہیم کانپوریؒ، سہل بن عبداللہ تستریؒ، شیخ ابو محمد حریریؒ اور عزیز الدین محمد نسفیؒ کے حوالے دئے ہیں۔ مزید برآں آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بھی ایک قول نقل کیا ہے۔

یہ سب لکھنے کے بعد خواجہ صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ "علماء شرع شریف را بر بعضی از کلمات این طائفہ اعنی صوفیہ موحدہ اعتراضے است"[۱۸]۔ اس کے بعد آپ نے خود ہی صوفیہ موحدہ پر اعتراضات کئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کا کلام خلافِ شریعت ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں اس جھگڑے میں نہ پڑتا لیکن حضورؐ کی ایک حدیث یاد آگئی ہے جس میں آپؐ فرماتے ہیں:۔

الساکت عن الحق شیطان اخرس

لہٰذا میں ان کے اقوال کے جوابات دینے پر مجبور ہوں۔[۱۹]

۱۷۔ ایضاً ۱۸۔ ایضاً، ورق ۲۰ الف

۱۹۔ ایضاً۔

خواجہ کلاںؒ شیخ محی الدین اکبر ابن عربیؒ کا نظریۂ وحدت الوجود بیان کرنے کے بعد رقمطراز ہیں کہ اس نظریہ پر حضرت مجدد الف ثانیؒ نے تصرف کیا ہے۔ حضرت کا یہ فرمان ہے کہ:

عبودیت مقام عدم ذاتی و احتیاج است کہ عین حقیقت امکانیہ است، پس ہر کہ خود را بر مقام مذکور نگاہ دارد از معارف حضرت الٰہی نصیبہ بہتر یابد۔ و این مقام مطابق قدم نبوت است۔ پس اہتمام در اکثار عبادت باوجود حصول کمالِ حقیقی سبب از دیاد مشخصات کمال وجودی شخصی آید پس التزام بدان لازم باشد۔ بالجملہ احکام وجود شخصی را باکمال توحید جمع داشتن قدم انبیاء است۔[۲۰]

اسی وجہ سے حضرت یہ فرمایا کرتے تھے کہ منتہیوں کا قول و فعل شریعت سے اقرب ہوگا۔ ایک دوسرے موقع پر حضرت مجددؒ الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ جس قدر عارف کا پایۂ عبودیت بڑھے گا، اسی قدر کنگرۂ عرفان رفیع تر ہوگا۔ آپ کا یہ بھی قول ہے کہ جنھیں مقامِ عبودیت پر استقامت ہوگی انھیں کو معبود کی تجلیوں سے بہرہ ملے گا۔ اور یاد رہے کہ یہی مقام انبیاء علیہم السلام کا تھا اور حضور سرورِ کائناتؐ مقام عبودیت میں ان سب سے آگے تھے۔[۲۱]

فصل چہارم: ۔خواجۂ کلاںؒ رقمطراز ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد توحید کے موضوع پر گفتگو ہونے لگی اور توحید نعلی

---

[۲۰] ایضاً، ورق ۲۳ الف [۲۱] ایضاً۔

Marfat.com

اور توحید صفاتی پر لوگوں کی زبانیں کھلنے لگیں۔ اسی طرح جب توکل اور تفویض کے موضوع زیر بحث آئے تو حضرت اویس قرنیؒ اور حضرت حسن بصریؒ سے لے کر سید الطائفہ جنید بغدادیؒ تک رائے زنی کرنے لگے۔ پھر کچھ اور زمانہ گزرا تو توحید حالی اور توحید حق پر مناظرے ہونے لگے اور محبت وانس اور ہیبت و وصلت پر بھی گفتگو ہونے لگی۔ انہی ایام میں ابن العربیؒ بھی میدان میں نکل آئے اور وحدۃ الوجود کے موضوع پر وعظ کہنے لگے۔ اس کے بعد صحو و تمکین صوفیہ کا تکیہ بنے۔ اس موقع پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ صحو و تمکین کمال تنزل درجات ہے اور صوفیہ اسے "قصور استعداد بشریت تجلیات ذاتیہ" کے نام سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔[۲۲]

خواجہ کلاںؒ فرماتے ہیں کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ "نہایات الصدیقین اول احوال الانبیاء" اور اس کی تشریح وہ یوں کیا کرتے تھے کہ اگر احوال الانبیاء کو ایک پانی سے بھری ہوئی مشک سے تشبیہ دی جائے تو "نہایات الصدیقین" کی مثال اس طراوت جیسی ہوگی جو مشک کی سطح پر آجاتی ہے[۲۳] (یعنی قطرہ آب بھی نہیں) غالباً حضرت بایزیدؒ کے اسی قول کو پیش نظر رکھ کر ابو العباس ابن عطاءؒ نے یہ کہا تھا۔

ادنیٰ منازل المرسلین اعلیٰ مراتب الانبیاء
ادنیٰ مراتب الانبیاء اعلیٰ مراتب الصدیقین

---

۲۲ ایضاً، ورق ۲۳ ب ۲۳ ایضاً، ورق ۲۴ ب

Marfat.com

ادنی مراتب الصدیقین اعلیٰ مراتب الشہداء۔
ادنی مراتب الشہدا اعلیٰ مراتب الصالحین۔
ادنی مراتب الصالحین اعلیٰ مراتب المومنین[۲۴]۔

خواجہ کلاںؒ جناب ابوبکر کلاباذیؒ کی شرح تعرف کے حوالے سے یہ نقل فرماتے ہیں کہ اس پہ اولیاء اللہ کا اجماع ہے کہ خواہ کوئی کتنا بھی بلند پایہ اور قوی پایہ کیوں نہ ہو وہ انبیاء کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ ایک دوسرے موقع پہ شیخ شہاب الدین مسعود بک خواہر زادہ سلطان فیروز تغلق کے رسالہ تنزیہ العقائد کے حوالے سے یہ لکھتے ہیں کہ :

"نبوۃ صفتے است مخصوص کہ یافتہ نشود مگر در انبیاء ہمثل نطق در لسان۔ و ولایت صفتے است کہ یافتہ می شود در انبیاء و غیر انبیاء مثل حیوۃ کہ شامل است مر انسان و حیوان را[۲۵]"

خواجہ صاحبؒ اس جگہ مفتاح الاسرار کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شیخ سماء الدین ابراہیم کانپوریؒ کا بھی یہی قول ہے[۲۶]۔

فصل دربیان مذاہب ملاحدہ کا :-

ملاحدہ وہ لوگ ہیں جو "عالم را موجود بیا اعتبار میدانند و ترتیب ثواب و عقاب بر عمل و کردار اعتقاد نکنند[۲۷]"۔ اس گروہ خبیثہ میں عنصریہ، کوکبیہ، سوفسطائیہ اور دہریہ شامل ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جو کچھ زمین میں بوؤ گے وہ اُگ آئے گا۔ اور اس کے اُگنے میں قدرت کو کوئی دخل نہیں

---

۲۴ ایضاً ۲۵ ایضاً، ورق ۲۵ الف

۲۶ ایضاً ۲۷ ایضاً،

Marfat.com

ملکہ یہ عمل تاثیرِ کواکب و عناصر کے تحت ہوگا۔ یہ لوگ مبداؤ معاد کے مسائل کو دل لگی سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جو شخص مرتا ہے وہ گھاس کی طرح ضائع ہو جاتا ہے[۲۸]

یہ لوگ قرآنِ پاک کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف سمجھتے ہیں اور ان کا یہ کہنا ہے کہ احکامِ شرع اہل رائے نے بنائے ہیں۔ علاحدہ نماز کا مذاق اڑاتے ہیں اور جب کسی کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ خدا کو آسمان پہ ماننا اور سرزمین پہ رکھنا بھی بھلا کوئی دانائی کا کام ہے۔ جب یہ لوگ حجاج کو صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ انہوں نے کیا گم کر دیا ہے جس کی تلاش میں یہ ادھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ قربانی کے جانوروں کو دیکھ کر یہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ان بے گناہوں کو کیوں مارتے ہو۔ ماہِ رمضان کا نام انہوں نے۔ ماہ گرسنگی و تشنگی۔ رکھا ہوا ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ جو قطرہ آب انسان کی خلقت کا سبب ہے۔ اس کے باہر نکلنے سے غسل کیونکر واجب ہوتا ہے؟ حالانکہ اسی راہ سے پیشاب، جو کہیں زیادہ گندہ ہے، نکلنے سے غسل واجب نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ لوگ ماں بہن کی حرمت کے قائل نہیں ہیں، یہ گروہ نقلیات کا منکر اور عقلیات کا داعی ہے اور ہر اسلامی شعار کا مذاق اُڑانا اس کا بہترین شغل ہے[۲۹]

علاحدہ کا طریقہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک ندیم ابراہیم

---

[۲۸] ایضاً۔ [۲۹] ایضاً، ورق ، ب۲۵،

Marfat.com

زردشتی سے شروع ہوا۔ اس طائفہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ابراہیم زردشتی کے بدن پہ برص نمودار ہوئی تو بنی اسرائیل نے اُسے جلاوطن کر دیا اور وہ ایران چلا آیا، جہاں گشتاسپ بن لہراسپ نے اُسے اپنے ہاں پناہ دی۔ ایران میں قیام نے دوران اس نے عوام کو "آئین زندقہ و اباحت" سے روشناس کرایا۔ اکاسرہ ایران کی سرپرستی میں اس طریقہ کی ایران میں خوب ترویج ہوئی۔ جب یہودیوں کی ایران میں آمدورفت شروع ہوئی تو وہ بھی "آئین اباحت" سے روشناس ہوئے رومیوں نے بھی اس سرزمین سے یہ فیض پایا اور حکمائے اشراق اور حکمائے مشائین بھی ایران میں رہتے ہوئے "آئین زندقہ و اباحت" سے اثر پذیر ہوئے۔

جب نوشیرواں تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے والد کی وصیت کے مطابق زنادقہ اور اباحتیہ کا قلع قمع کیا۔ اسی کے عہد معدلت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایران پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ خلافت میں:

"عبداللہ ابن سبا در لباس تشیع مجدد آن مذہب ناروا گشت وگروہا گروہ مردم از اہل کوفہ و بصرہ و مصر و یمن بنا دلستگی گفتار او را پذیرفتند و بظاہر خویشتن را شیعہ آل محمد گویا نندہ۔ بباطن در فساد دین متین اسلام کوشیدند و فتنہ ہا انگیختند۔"[۵]

---

[۵] ایضاً۔

از نفوس طیبہ در باد خزاں فتنہ و فساد نابود شد۔[۳۱]

حضرت علیؓ نے ان میں سے بہتوں کو جہنم رسید کیا۔

ابو العباس السفاح اور ابو جعفر منصور کے عہد میں مزدک نامی ایک شخص نے دوبارہ یہی فتنہ کھڑا کیا اور مہدی و ہادی کے زمانے میں کثرت کے ساتھ لوگ گمراہ ہوئے۔ ان پہ نماز ادا کرنا اور غسلِ جنابت کرنا گراں گزرنے لگا۔ اسی طرح موسمِ گرما میں روزے رکھنا دوبھر ہوا۔ ادائیگی زکوٰۃ بھی ان کو مشکل نظر آنے لگی۔ اس دور میں ان ملاحدہ کے زیرِ اثر اتباعِ خواہش، زنا اور شراب کو فروغ ہوا۔[۳۲]

عہدِ مہدی میں سمرقند میں عبداللہ ابن المقنع نے دعویٔ الوہیت کیا اور مسلمانوں کے خلاف فوج آرا ہوا۔ دار الخلافہ سے اس کے خلاف ایک لشکر جرار بھیجا گیا جس نے اس کے متبعین کی اکثریت کو جہنم واصل کیا۔ مہدی اور ہادی کو خدا نے توفیق عطا فرمائی اور انھوں نے حتی الوسع زندقہ و الحاد کو دبایا۔[۳۳] ہارون الرشید کے آخری ایامِ حکومت اس فتنہ نے دوبارہ سر اٹھایا اور اس بار رؤسائے عرب اور ملوکِ عجم بھی گروہ ملاحدہ میں شامل ہو گئے۔ عباسیوں کے اکثر وزیر اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس زمانے میں زندقہ و الحاد کی ہوا کچھ ایسی چلی کہ اکثر ہاشمی بھی گمراہ ہو گئے، ان میں سے یعقوب بن الفضل بن عبدالرحمٰن بن عباس بن ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب خاص طور پہ قابلِ ذکر ہے۔ اس نے

۳۱۔ ایضاً، ورق ۲۶ ب ۳۲۔ ایضاً۔

۳۳۔ ایضاً، ورق ۲۷ الف۔

Marfat.com

اپنی بیٹی کو حمل کر دیا اور اسی وجہ سے وہ عوام میں زندیق کے لقب سے مشہور ہوا۔[۳۴]

المعتصم کے عہدِ خلافت میں بابک نامی ایک رومی نے مذہب الحاد کا پرچار شروع کیا۔ خلیفہ نے اس کے مقابلے پر پے در پے لشکر روانہ کئے تب کہیں اس کا زور ٹوٹا۔ خلیفہ المتوکل کے عہد میں قرامطہ نے سر اُٹھایا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ لوگ حجاز، عراق اور سندھ پر قابض ہو گئے۔ اُنھوں نے حجاز کے قافلوں کو لوٹنا اپنا شعار بنایا اور ان کی جرأت یہاں تک بڑھی کہ وہ بیت اللہ سے حجرِ اسود بھی اُکھاڑ کر لے گئے۔[۳۵]

اسی زمانے میں باطنی فرقے کا ظہور ہوا، یہ لوگ خود کو شیعۂ اسمٰعیل بن جعفر صادق کہلاتے تھے۔ انھوں نے کچھ باتیں تو مجوس سے اخذ کیں اور باقی احکام فلاسفہ سے مستعار لئے۔ اُنھوں نے باطنی تعلیم کے بہانے احکامِ شریعت ساقط کر دئے۔ ان کے طریقے کا کسی نے ان الفاظ میں کیا خوب تجزیہ کیا ہے "ظاہر مذہب شیعہ باطن مذہب الحاد و کفر"۔[۳۶]

ملتان میں خدا نے شیخ حمید افغان کو توفیق دی اور اس نے قرامطہ کا خاتمہ کیا۔ اسی طرح سلطان محمود غزنوی نے بھی تائید ایزدی سے ان پر ضربِ کاری لگائی۔ ایران میں دیالمہ نے بھی لباسِ تشیع میں سر اُٹھایا اور اپنی قلمرو میں الحاد کو فروغ دیا۔ وہ بھی سلطان محمود کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوئے۔[۳۷]

---

[۳۴] ایضاً [۳۵] ایضاً، ورق ۲۸ الف

[۳۶] ایضاً، ورق ۲۹ ب [۳۷] ایضاً ورق ۳۰ ب

Marfat.com

انتہائے مغرب میں اسماعیلیہ نے، جو اس دیار میں عبیدیہ کے نام سے معروف ہیں، "تمراز لحاف گمنامی برداشت" وہ کچھ تو خیرالسلاطین صلاح الدین ایوبیؒ کے ہاتھوں برباد ہوئے اور بقیہ کو سلطان سنجر نے تہ تیغ کیا۔ اس کے بعد محمود بسیخوانی اٹھا اور اس نے زندقہ والحاد کا پرچار شروع کیا۔ اس کی موت کے بعد اڑھائی سو سال تک الحاد کا نام سننے میں نہ آیا۔ اسمٰعیل صفوی کے تخت نشین ہوتے ہی زندقہ والحاد میں از سر نو جان پڑ گئی[۳۸]

ہندوستان میں زندقہ والحاد کا آغاز اس طرح ہوا۔

"دربار شاہی سلطان عظیم الشان جلال الدین محمد اکبر بادشاہ حافظا اللہ عنہ شیخ ابوالفضل ناگوری بساط آئین خسارت قرین را در مملکت ہندوستان گستردہ سرگزشت محمود دبسخوان و شیخ ابوالفضل ناگوری چون بواقعی گوش آشنائے مردم نیست دنیز در تاریخ کمایلبغی نگاشتہ نشدہ این کمترین دریں محل ثبت می نماید[۳۹]"

محمود بسیخوانی خوزستان کے ایک موضع بسیخوان کا رہنے والا تھا۔ وہ نوجوانی میں طلب حق میں گھر سے نکلا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ وہ آبادی سے باہر عبادت و مراقبہ میں مشغول رہتا اور درختوں کے پتے اور گھاس کھا کر گزر بسر کرتا۔ ایک دن وہ ایک ندی کے کنارے بیٹھا وضو کر رہا تھا کہ اُسے پانی میں کوئی چیز بہتی نظر آئی۔ جب وہ چیز اس کے قریب آئی تو اس نے

۳۸؎ ایضاً - ورق ۱۳۱ الف   ۳۹؎ ایضاً۔

"

اُسے بغور دیکھا تو وہ ایک تر و تازہ گاجر تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس گاجر کو پکڑ لیا اور وہیں بیٹھے بیٹھے اُسے کھا گیا۔ اس کے بعد وہ ہر روز وقتِ مقررہ پر وضو کے لیے ندی پر پہنچتا اور ایک بہتی ہوئی گاجر اس کی طرف آتی اور وہ اُسے پکڑ کر کھا لیتا۔ وہ اس پر خوش تھا کہ خدا نے اس کے رزق کا اس طرح انتظام کر دیا ہے۔

محمود پسیخوانی کو گاجریں کھاتے ہوئے دو ماہ گزر گئے تو اس کے دل میں یونہی ایک خیال آیا کہ دیکھنا تو چاہیئے کہ یہ گاجریں کہاں سے آتی ہیں۔ اگلے دن وہ وقتِ مقررہ سے پہلے ندی پر پہنچا اور پانی کے بہاؤ کے خلاف چل پڑا۔ ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک برہنہ عورت ندی کے کنارے بیٹھی:

زردکے را در محل مخصوص خود میفرستد و می بر آرد و ساعتے
نیک بدان عمل قیام نمود، چون از کار پرداخت و آتش توفان
او فرونشست آن زردک را در آب از دست فروہشت ۳۰

محمود نے دور سے یہ ماجرا دیکھا تو خدا کو مخاطب کر کے کہنے لگا "اے خدا تو اپنے مخلص بندوں کو ایسی چیزیں کھانے کو دیتا ہے؟" اس واقعہ کے بعد وہ اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ وہ اسلام سے پھر گیا اور اس نے الحاد کا پرچار شروع کیا۔ اس نے اپنے عقائد پر تیرہ رسالے لکھے جن میں سے "بحر و کوزہ" سب سے گیا گذرا ہے "فضلائی کہ وی در آنجا خوردہ گوش از شنیدن آن قی میکند" اس "ملعون" کے مذہب کے

---

۳۰ ایضاً۔ ورق ۱۳۱ ب

رڈسا میں سے شریف آملی اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا اور ابوالفضل کا دستِ راست بنا۔[۴۱]

شریف آملی کا شمار ملا حدہ میں ہوتا ہے۔ وہ کسی زمانے میں بلخ میں مولانا محمد زاہد نبیرۂ مخدومی شیخ حسین خوارزمیؒ کی خانقاہ میں قیام کے ارادہ سے آیا لیکن جب انھیں اس کے عقاید معلوم ہوئے تو انھوں نے اُسے اپنی خانقاہ سے نکال دیا۔ بلخ سے نکل کر وہ دکن چلا آیا اور وہاں اپنے عقائد کا پرچار کرنے لگا۔ دکن میں لوگ اس کے قتل کے درپئے ہوئے تو وہ شمالی ہندوستان چلا آیا۔ کسی نہ کسی طرح وہ اکبر کے حضور میں باریاب ہوا اور پہلی ہی ملاقات میں اس نے "حرفہائے ناہموار" کہے جو بادشاہ نے پسند کیے۔ اکبر نے اُسے ہزاری منصب دے کر اپنے مقربین کے زمرہ میں داخل کر لیا۔ وہ محمود پسیخوانی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بنگال میں لوگوں کو مراتب چہارگانہ کی، جو ابوالفضل کے اجتہاد کا نتیجہ تھے، تلقین کیا کرتا تھا۔ اس نے بھی مجرد کوزہ کی طرز پر "مہمات" پر مشتمل ایک کتاب لکھی تھی۔[۴۲]

شیخ مبارک ناگوری کا شمار "دانشمند ملاؤں" میں ہوتا تھا اور وہ سید رفیع الدین شیرازی کا شاگرد تھا۔ شیخ مبارک کی شادی لاڈو سے ہوئی جس کے بطن سے فیضی، ابوالفضل، ابوالخیر، ابوالمکارم اور ابوالبرکات پیدا ہوئے۔ شیخ کے مذہب کے متعلق خواجۂ کلاں رقمطراز ہیں

---

[۴۱] ایضاً، ورق ۳۲ الف

[۴۲] ایضاً، ورق ۳۲ ب

Marfat.com

" در ہر عصر ہمان مشرب و مذہب شعار وقت خود می ساخت کہ ملوک و امرای عصر بدان مذہب رغبت پیدا انشتند"[۴۳] شاید ایسے ہی شخص کے لئے کسی نے کہا ہے۔ ؎

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

شیخ مبارک کو سلطان ابراہیم لودھی کے عہد میں کٹر سنی سمجھا جاتا تھا اور سوریوں کے عہد حکومت میں لوگ اُسے مہدویوں کے زمرہ میں شمار کرتے تھے، ہمایوں کے زمانہ حکومت میں وہ خود کو نقشبندی صوفی ظاہر کرتا تھا۔ اکبر کے عہد میں وہ مشرب اباحت پر کاربند اور صلح کل ہونے کا دعوی کرتا تھا۔ شیخ مبارک کی طرح اس کے فرزند ابو الفضل میں بھی استقلال نام کو نہ تھا۔ خواجۂ کلاںؒ کے الفاظ میں "دل بالکل وی ہیچ دین و ملت قرار نمی گرفت"۔ اس نے مجوس و نصاری و یہود سے مذہب کے متعلق معلومات حاصل کیں اور انھیں لے کر اکبر کے دربار میں حاضر ہوا۔ وہ اکبر کی صحبت کو اپنے لئے تائید غیبی سمجھتا تھا۔

ابو الفضل نے شاہی فرامین بھیج کر دنیا بھر سے دوسرے مذاہب کی کتابیں حاصل کیں اور اسی شوق میں متھرا، بنارس، جگن ناتھ اور سومنات تھ سے

۴۳؎ ایضاً، ورق ۳۳ الف (خواجہ باقی باللہؒ کے انتقال کے وقت خواجۂ کلاںؒ ابھی بچے ہی تھے، اس لئے ان کی تربیت خواجہ بزرگ کے خلیفہ خواجہ حسام الدینؒ نے کی۔ خواجہ حسام الدینؒ کی اہلیہ شیخ مبارک کی بیٹی اور فیضی اور ابو الفضل کی ہمشیرہ تھیں، اس لئے خواجۂ کلاںؒ کی اس خاندان کے متعلق روایات بڑی وزنی ہیں۔)

بھی کتابیں منگوائیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے اس کی حیرت میں اضافہ ہوا اور وہ نہ صرف یہ کہ دہریہ ہوا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس نے اباحت میں قدم رکھا۔[۴۴] اخلاق کے معاملے میں وہ کتب حکماء کو مقدم رکھتا تھا۔ ابوالفضل نے ایک کام اور کیا وہ یہ کہ "در رنگ ابن مقنع خبیث مذکور کلیلہ و دمنہ را بر طرز خاص تحریر نمود و در مقام تمثیل و استشہاد حکایت واہیہ از نزد خود افزود ۔" کفر و زندقہ کی یہ تمام منازل اس نے خود طے کیں اور) اس کے بعد شریف آملی سے ملا اور خوب ملحد ہوا اور بالآخرہ باشارۂ بادشاہ زادہ عالمیان ولی عہد نورالدین محمد جہاں گیر" قتل ہوا۔

خواجہ کلاںؒ ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ عوام کی گمراہی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ "ہوسناک اور اوباش" لوگوں کا ایک گروہ فقراء کی خانقاہوں میں "آش و نان" مہیا کر رہا ہے جس کے کھانے سے فقراء کی قوت فہم و ادراک میں نقص پیدا ہوتا ہے اور وہ وادی الحاد میں جا نکلتے ہیں[۴۵] بسا اوقات لوگ صوفیوں کی تحریروں کو پڑھ کر یا ان کے وعظ سن کر جادۂ شریعت سے دور نکل جاتے ہیں۔ خواجہ کلاںؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد بزرگوار خواجہ آفاق محمد الباقیؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنی بعض رباعیات میں وحدت الوجود کے مسائل پیش کئے ہیں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ "ازاں این تصنیف خوب واقع نشدہ است"[۴۶] اسی ضمن میں آپ نے

---

[۴۴] ایضاً، ورق ۳۳ ب [۴۵] ایضاً، ورق ۳۴ ب

[۴۶] ایضاً۔

Marfat.com

یہ بھی فرمایا کہ مجھے بہت بعد جاکر معلوم ہوا ہے کہ "دارائی طریقہ وحدۃ الوجود را ہے است دسیع و راہِ توحید نسبت بآن شاہراہ کوچہ تنگی بیش نیست"[۴۷] اس خیال سے کہ طریقت کے بعض مقامات اور ان کے احوال عوام کے فہم سے بالاتر ہیں، آپ نے حضرت مجدّد الف ثانی کو یہ نصیحت فرمائی تھی۔

"اگر سخن گرائید بطور علماء گرایند نہ بطور صوفیہ و اگر احیاناً بطور صوفیہ

گفتہ شود بہ اغلاق گرائید کہ جز مخاطبت دقیقہ شناس دیگرے

نفہمد و از آنجا چیزی فرا نگیرد کہ موجب ذلّت و ہفوات وی شود"[۴۸]

د اگر حضرت مجدد الف ثانیؒ اس نصیحت پر عمل پیرا ہوتے اور اپنے مکتوب یازدہم کی اشاعت نہ فرماتے تو انھیں گوالیار میں سنّتِ یوسفی کی پیروی نہ کرنا پڑتی۔)

خواجہ کلاںؒ رقمطراز ہیں کہ ان حقائق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں وہ دہریوں، طبیعیوں، اسماعیلیوں اور مباحیوں کی وجہ سے پیدا ہوئیں[۴۹]۔ اب حضرت بادشاہ دین پناہ، امام السلطنتہ والسلاطین، و قطب الخواقین زینہار زمان و زمین، و بادشاہ عالم و عالمین، مؤسس قواعد العقل والداد، دافع احکام الظلم، و قامع بنیان الحاد، نزہتہ الدہر و بہجتہ العصر الاسلام، عضد قوی و الحق برہان جلی، نجم ثاقب للمرذۃ والشیاطین، و شمس بازغ لاہل معرفت والیقین، محی الخلفاء الراشدین، و منقبتہ امیر سید المرسلین، ظل اللہ الظلیل، امیر المومنین، صاحبقران ثانی، شہاب الدین محمد شاہجہان بادشاہ اطال اللہ عمرہ کو حکمائے یونان

۴۷۔ ایضاً۔ ۴۸۔ ایضاً۔ ۴۹۔ ایضاً، ورق ۳، الف۔

Marfat.com

اور فلاسفہ ناپسند ہیں اور اسی وجہ سے زندیق بھی اس سے خائف و ترساں رہتے ہیں[۵۰]۔

آخر میں خواجۂ کلاں رقمطراز ہیں کہ ان دنوں آئمۂ متقی کم رہ گئے ہیں جو دین کی غم خواری کریں اس لئے بادشاہ سے کہو کہ وہ یہ کام کرے[۵۱]۔

---

[۵۰] ایضاً، ورق ۳۵ الف

[۵۱] ایضاً، ورق ۳۶ ب، ۳۷ الف

Marfat.com

پیر محمد شاہؒ اور ان کا نادر کتب خانہ

سید پیر محمد شاہ قادریؒ کا شمار احمد آباد کے اولیائے کبار میں ہوتا ہے اور جس شاہراہ پر ان کی درگاہ واقع ہے وہ انہی کے نام کی نسبت سے پیر محمد شاہؒ روڈ کہلاتی ہے۔ آپ کی درگاہ احمد آباد (بھارت) میں مرجع خلائق ہے اور وہاں کے باشندے بلا امتیاز مذہب و ملت آپ کے دل و جان سے معتقد ہیں۔

آپ کا اسم گرامی سیّد محمد تھا لیکن عوام میں آپ سید محمد شاہ کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب والد ماجد کی طرف سے حضرت سیّد عبدالقادر جیلانیؒ سے اور والدہ ماجدہ کی طرف سے حضرت سیّد بندہ نواز گیسو درازؒ سے جا ملتا ہے۔ ان نسبتوں سے دنیائے فقر و تصوف کے دو شریف خانوادوں کا مقدس خون آپ کی رگوں میں موجزن تھا۔ آپ بیجاپور میں ۱۵ شعبان سنہ ۱۱۰۰ھ کو پیدا ہوئے، اتفاق سے آپ کے والد ماجد آپ کی ولادت سے پہلے ہی انتقال فرما گئے، اس لئے آپ کی تربیت کا بار آپ کے چچا سیّد عبدالرحمٰنؒ کے کندھوں پر پڑا۔

Marfat.com

سیّد عبدالرحمٰن کا شمار اس عہد کے برگزیدہ قادری بزرگوں میں ہوتا تھا اور اطرافِ دکن میں آپ کے ہزارہا مرید تھے۔ آپ کا سلسلۂ ارادت چار واسطوں سے علامہ وجیہ الدین گجراتیؒ اور پانچ واسطوں سے حضرت محمد غوث گوالیاریؒ سے جا ملتا ہے۔

سید محمد کی تعلیم کا آغاز سید عبدالرحمٰنؒ کی نگرانی میں ہوا۔ سات سال کی عمر میں آپ نے قرآنِ پاک حفظ کیا۔ جب آپ نو سال کے ہوئے تو چچا نے قادریہ سلسلہ میں بیعت سے مشرف فرمایا اور مکہ مکرمہ جا کر تحصیل علم کا حکم دیا۔ آپ نو عمری میں ہی مکہ مکرمہ میں حصول علم کے لئے وارد ہوئے۔ ان دنوں مکہ مکرمہ میں مولانا عبداللہ بن طرفہؒ، عبدالرحمٰن بن محمد ذہبیؒ، عبدالملک بن حسین عصامیؒ، ابوعبداللہ جمال الدین محمد بن احمد بن سعید عقیلہؒ، محمد بن شیخان بن عمر سالمؒ، مصطفیٰ بن فتح اللہ مکیؒ، شہاب احمد بن عبداللہ مکیؒ، شہاب احمد بن محمد دمیاطیؒ، شیخ قاسم بن محمد بغدادیؒ، محمد بن سلیمان مغربیؒ، سیّد محمد شنّیؒ، اور ملّا الیاس بن ابراہیم کورانیؒ جیسے جیّد علما موجود تھے۔ آپ نے ان میں اکثر بزرگوں سے کسبِ فیض کیا اور علوم مروّجہ میں سے خاص کر تجوید اور تفسیر میں مہارت حاصل کی۔

مکہ مکرمہ میں چھ سال قیام کے بعد آپ مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے۔ وہاں ان دنوں علماء کی ایک جماعت مصروفِ درس و تدریس تھی۔ ان میں سے خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ کے تلمیذ رشید احمد یکدستؒ مولانا اسعد اسکداریؒ، مولانا عبدالرحمٰن سمہوریؒ، مولانا عبدالکریم خلیفتیؒ، سید عبداللہ المحدادؒ، علامہ محمد بن ابراہیم کورانیؒ، محمد بن عبدالہادی سندھیؒ، اور مولانا علی

Marfat.com

بن ابراہیم شروانی قابل ذکر ہیں۔ آپ نے سات سال ان بزرگوں کی خدمت میں رہ کر علومِ مروجہ کی تکمیل کی اور تئیس برس کی عمر میں اِن کی دُعائیں لے کر احمد آباد روانہ ہوئے۔

جس سال آپ احمد آباد تشریف لائے اسی سال بہادر شاہ اوّل فوت ہوا اور جہاندار شاہ ہندوستان کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ ملک کے سیاسی حالات دن بدن مخدوش ہوتے چلے گئے اور امورِ سلطنت بادشاہ گروں کے ہاتھ میں آگئے۔ مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مختلف صوبوں کے صوبے دار آزاد ہو گئے۔ گجرات میں گائیکواڑ کو سر اُٹھانے کا موقع مل گیا اور اس نے ہمت سے کام لے کر سورت پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ کے بعد گجرات میں مسلمانوں کی پوزیشن دن بدن خراب ہوتی چلی گئی اور مرہٹے طاقت پکڑتے گئے۔ احمد آباد کا مسلمان گورنر ان کے رحم و کرم پر ہی اپنے منصب پر برقرار رہ سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ تمام کاروبارِ حکومت پر مرہٹے حاوی ہو گئے اور انھوں نے احمد آباد کے آخری مسلمان گورنر جوانمرد خاں کو اس کے منصب سے الگ کر کے احمد آباد پر قبضہ کر لیا۔

سید محمد شاہؒ سیاسی اتار چڑھاؤ کے اس زمانے میں اول اول تو شہر سے باہر محلہ راج پورہ میں بی بی کی مسجد میں قیام پذیر رہے۔ لیکن بعد ازاں آپ نے ماناک چوک کی جامع مسجد میں سکونت اختیار کر لی اس مسجد میں آپ نے رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا جو آپ کے دمِ واپسیں تک جاری رہا۔

آپ پر وحدۃ الوجود کا رنگ بہت زیادہ غالب تھا اور اکثر سُکر کی حالت میں رہتے تھے۔ جب کبھی صحو کی حالت میں ہوتے تو لکھنے

Marfat.com

پڑھنے کی طرف توجہ فرماتے۔ آپ کی تصانیف میں عشق اللہ، نور الشیوخ، مجموعۂ رسائل، مکاشفات، غزلیات اور مراثی شامل ہیں۔ آپ شاعر بھی تھے اور اقدسؔ تخلص کرتے تھے۔ آپ کا کلام اور اوّل الذکر دونوں کتابیں درگاہ کمیٹی نے شائع کر دی ہیں۔ آپ کے سوانح حیات ابوظفر ندوی نے تذکرۂ اقدس کے نام سے مرتب کئے تھے جو ۱۹۳۴ء میں اعظم گڑھ سے طبع ہو چکے ہیں۔

تذکرۂ اقدس پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے گجرات کے سُنّی بوہروں میں تبلیغ کا کام بڑے وسیع پیمانے پر کیا تھا اور ان کے عقائد درست کرنے میں آپ کا بڑا ہاتھ تھا۔ آج تک گجرات کے سُنّی بوہرے آپ کے بڑے معتقد ہیں اور ان کے ہاں یہ رسم چلی آ رہی ہے کہ وہ نومولود بچّے کو آپ کے مزار کے پائینتی لا کر رکھتے ہیں اور جب کسی بچّہ کو مکتب میں بٹھاتے ہیں تو اس کی رسم بسم اللہ بھی آپ ہی کے مزار پر ادا کرتے ہیں۔

سیّد محمد شاہؒ کو علامّہ وجیہہ الدین گجراتیؒ سے بے حد عقیدت تھی اور ان کے مزار پر فاتحہ خوانی آپ کا روزمرّہ کا معمول تھا۔ جب آپ جامع مسجد مانک چونک سے علامّہ مرحوم کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے تشریف لے جاتے تو راستے میں اکثر ایک بڑھیا کی خیر و عافیت دریافت فرمانے کے لئے اس کی جھونپڑی کے باہر رُک جاتے۔ وہ اکثر آپ سے وہاں چند دِ قیام فرمانے کی استدعا کرتی تو آپ ہمیشہ اسے یہی جواب دیتے "ہاں ہاں جب اس جگہ آؤں گا تو پھر اسی جگہ رہوں گا۔"

سیّد محمد شاہؒ نے ۲۶ رجمادی الاولیٰ ۱۲۳۲ھ کو وفات پائی۔ انہے

Marfat.com

ذات پاک بودہ" سے مادۂ تاریخ برآمد ہوتا ہے۔ حسن اتفاق سے آپ کو اسی بڑھیا کے جھونپڑے کے پاس دفن کیا گیا ہے۔ آج کل آپ کے عالی شان مقبرہ سے ملحق ایک نفیس مسجد، ایک خوبصورت مدرسہ، ایک پُروقار خانقاہ ایک عمدہ سی لائبریری اور درگاہ کمیٹی کے دفتر کی پُرشکوہ عمارات موجود ہیں۔ درگاہ سے متعلقہ اوقاف کی آمدنی ایک لاکھ روپے سالانہ سے متجاوز ہے جو ان عمارات کی دیکھ بھال پر خرچ ہوتی ہے۔

سید محمد شاہؒ کو کتابیں پڑھنے اور نادر مخطوطات جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ تذکرۂ اقدمین کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کتابیں آپ کے مطالعہ میں رہتی تھیں وہ آپ کو حفظ ہو چکی تھیں۔ آپ کے انتقال کے بعد ان مخطوطات کو ایک کمرہ میں محفوظ کر دیا گیا۔ درگاہ کمیٹی کے ارکان کی توجہ سے گذشتہ دو سو سال میں اس مجموعہ میں معتدبہ اضافہ ہوا اور آج پیر محمد شاہؒ لائبریری کا شمار برصغیر پاک و ہند کے بہترین کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ابھی تک ان مخطوطات کی کوئی وضاحتی فہرست شائع نہیں ہوئی اس لئے ان مخطوطات کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ راقم نے اگست ۱۹۶۸ء میں ناظم کتب خانہ مولانا محمد سورتی کی عنایت سے اکثر و بیشتر مخطوطات سے استفادہ کیا اور اس ضمن میں ان میں سے چند نوادرات کا تعارف کروانا چاہتا ہوں۔

تفسیر ابی سعود عمادی

علامہ ابی سعود عمادیؒ ایک حنفی عالم تھے، آپ نے ۹۷۳ھ میں عربی زبان میں قرآن کی تفسیر دو جلدوں میں تحریر فرمائی تھی۔ پیر محمد شاہؒ لائبریری میں اس تفسیر کا ۱۰۰۱ھ کا نوشتہ مکمل نسخہ موجود ہے۔

Marfat.com

تفسیر بیضاوی

قاضی بیضاوی کی تفسیر متعدد بار شائع ہو چکی ہے اور اکثر دینی مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ پیر محمد شاہؒ لائبریری کا مخطوطہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ علامہ وجیہہ الدین گجراتیؒ کا تحریر فرمودہ ہے۔

تفسیر غرائب القرآن

یہ تفسیر مولانا حسن بن محمد بن حسین القمی معروف بہ نظام الاعرجؒ نے عربی زبان میں ۷۲۸ھ میں تحریر فرمائی تھی۔ پیر محمد شاہؒ لائبریری کا مخطوطہ فن کتابت کا بہترین نمونہ ہونے کے علاوہ اپنی قدامت کے لئے بھی مشہور ہے۔

شرح فی معانی بعض الآیات القرآنیہ

یہ مختصر سا رسالہ کابل کے مشہور عالم دین ملا محمد صادق حلوائیؒ کی تالیف ہے۔ اکبر کا بھائی حکیم میرزا اور خواجہ باقی باللہؒ دونوں اسی بزرگ کے شاگرد تھے۔ نفس مضمون کے لحاظ سے یہ بے بدل تالیف ہے۔

سورۂ فاتحہ

کسی کاتب نے خطِ غبار میں سورۂ فاتحہ کے اندر پورا قرآنِ پاک نسخ میں لکھا ہے جو فن خطاطی کا بہترین شاہکار ہے۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں خط غبار میں کسی کاتب کا "یا حضرت بابا فرید الدین گنج شکر" کے اندر لکھا ہوا قرآنِ پاک محفوظ ہے۔

ترجمہ قرآن پاک

۱۱۰۲ھ کا تحریر شدہ قرآن پاک کا بین السطور فارسی ترجمہ پیر محمد شاہؒ لائبریری میں موجود ہے۔ ان حضرات کا یہ دعویٰ ہے کہ سب سے پہلے شاہ ولی اللہؒ نے قرآن پاک کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا ان کی خدمت میں اتنا ہی

Marfat.com

عرض کرنا کافی ہوگا کہ یہ ترجمہ شاہ صاحبؒ کی ولادت سے بارہ برس قبل ہوا تھا۔

کتاب الفقہ حنفی

شیخ ابو حفص نجم الدین عمر بن محمدؒ ایک مشہور حنفی عالم ہو گذرے ہیں۔ انھوں نے عربی نظم میں فقہ حنفی پہ ایک کتاب لکھی ہے۔ اس لائبریری میں جو مخطوطہ موجود ہے وہ ۱۱۷۷ھ کا کتابت شدہ ہے مضمون کے اعتبار سے بھی یہ ایک نادر مخطوطہ ہے۔

حاشیہ وشرح ھدایہ

حکیم ہاشمی نام کے ایک بزرگ نے پہلے ھدایہ پہ حاشیہ لکھا بعد ازاں پوری کتاب کی شرح لکھی۔ پیر محمد شاہؒ لائبریری میں اس کتاب کا جو ضخیم نسخہ ہے وہ فاضل مصنف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

ترغیب الصلوٰۃ

علاء الدین خلجی کے عہد میں محمد بن احمد زاہد نام کے ایک فاضل نے ۶۵۹ھ میں ترغیب الصلوٰۃ کے نام سے ایک ضخیم کتاب تحریر کی تھی، پیر محمد شاہؒ لائبریری میں اس کے دو مکمل نسخے محفوظ ہیں۔

تیسر الاحکام

ملک العلما شہاب الدین دولت آبادیؒ صاحب تفسیر بحر مواج نے علم فقہ پہ ۴۷ ورق کا ایک مختصر سا رسالہ فارسی زبان میں قلم بند کیا تھا۔ پیر محمد شاہؒ لائبریری کا مخطوطہ عہد شاہجہانی میں ۱۰۲۱ھ میں درطۂ تحریر میں آیا تھا۔

فتاویٰ تتارخانیہ

اس کتاب کا مکمل سیٹ میں نے اوّل بار پیر محمد شاہؒ لائبریری میں دیکھا ہے۔

Marfat.com

ہماری پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بھی، جو اپنے مخطوطات کے لئے پاکستان بھر میں مشہور ہے، اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔

فوائد فیروز شاہی

شرف الدین محمد انعطائی نے فیروز تغلق کے عہد میں فقہ پر ایک ضخیم کتاب فوائد فیروز شاہی کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے مخطوطے کلکتہ، بانکی پور، انڈیا آفس اور مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہیں۔ پیر محمد شاہ لائبریری کا مخطوطہ ۹۷۳ھ کا نوشتہ ہے۔

رسالہ اسماء اہل بدر

یہ مختصر سا رسالہ الشیخ ابوبکر المحدثؒ کی تالیف ہے، پیر محمد شاہؒ لائبریری کے مخطوطہ کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ فاضل مصنف کے ہاتھ کی تحریر ہے۔

مرأۃ العارفین

سلطان فیروز تغلق کے خواہر زادے شیر خان مسعود بک نے عارفین کے سوانح اس عنوان سے جمع کئے تھے، پیر محمد شاہؒ لائبریری میں ۱۱۱۶ھ کا نوشتہ ایک مخطوطہ محفوظ ہے۔

مناقب العارفین

اس نام کا ایک مخطوطہ اس لائبریری میں موجود ہے لیکن مصنف کا نام اس پر درج نہیں نفس مضمون کے لحاظ سے یہ ایک نادر نسخہ ہے۔

سفرنامۂ مخدوم جہانیاں

حضرت سیّد جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے سفرنامہ کا ایک مخطوطہ اس لائبریری میں موجود ہے۔

Marfat.com

جنگ نامہ اعظم شاہ و معظم شاہ

اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں کے درمیان حصولِ تخت کے لئے جو جنگ ہوئی تھی اس کے مکمل کوائف نعمت خان عالی نے سات ابواب میں قلم بند کر لئے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مجموعۂ شیرانی میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ لیکن پیر محمد شاہ لائبریری کے مخطوطہ کا متن کافی حد تک صاف ہے۔

دیوانِ نویدی

نویدی ہمایوں کا ہم عصر شاعر تھا۔ اس کا دیوان ایک بار شائع ہو چکا ہے لیکن اب ناپید ہے پیر محمد شاہؒ لائبریری کا مخطوطہ ہر لحاظ سے مکمل اور دیدہ زیب ہے۔

دیوان فیضی

فیضی کا ایک مکمل دیوان پیر محمد شاہؒ لائبریری میں موجود ہے۔ پنجاب یونیورسٹی نے ادارہ تحقیقاتِ پاکستان کی طرف سے کلیاتِ فیضی شائع کی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ فاضل مرتب نے اس نسخہ سے بھی استفادہ کیا ہے یا نہیں —

راگ درپن

عہد شاہجہانی میں جتنے موسیقار ہو گذرے ہیں ان کا ایک تذکرہ فقیر اللہ سیف خاں نے اس عنوان سے تحریر کیا تھا۔ علاوہ ازیں فنِ موسیقی پر بھی فاضل مصنف نے کافی کچھ لکھا ہے۔ علی گڑھ میں بھی راگ درپن کا ایک ناقص نسخہ موجود ہے۔ اتفاق سے پیر محمد شاہؒ لائبریری کے نسخے کے بھی چند اوراق غائب ہیں۔ اس کتاب کے مخطوطے پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور

Marfat.com

بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں بھی موجود ہیں۔

مکاشفاتِ عینیہ

امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کی مکاشفاتِ عینیہ کا ایک مکمل نسخہ اس لائبریری میں موجود ہے۔ اس نسخہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ امام ربانی کی وفات کے صرف سترہ سال بعد ۱۰۵۱ھ میں ورطۂ تحریر میں آیا تھا۔

رسالہ علوم الہامیہ و معارف لدنیہ

یہ بھی حضرت امام ربانیؒ کی تالیف ہے، ہر چند کہ سالِ کتابت مخطوطہ پر درج نہیں تاہم کتابت کے اعتبار سے یہ ایک قدیم نسخہ ہے۔

خیالات العشاق

حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت ابوحفص شہاب الدین عمر سہروردیؒ کے مرید اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مصاحب تھے۔ اس لائبریری میں آپ کی اس تالیف کے دو نسخے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ۱۰۹۰ھ میں ورطۂ تحریر میں آیا تھا۔

رسالۂ غوثیہ۔

اس نام کا ایک مختصر سا رسالہ سیّد بندہ نواز گیسو درازؒ کی طرف منسوب ہے۔ ویسے آپ کثیر التصانیف بزرگ ہو گذرے ہیں، تاہم اس رسالہ کی صحت کے متعلق کچھ لکھنا محال ہے۔

مرصاد العباد

اس لائبریری کے نوادرات میں مرصاد العباد بڑا اہم مخطوطہ ہے۔ یہ ابوبکر بن عبداللہ بن محمد بن شاہوار اسدی رازیؒ نام کے ایک بزرگ کی تالیف ہے۔ پیر محمد شاہؒ لائبریری کا مخطوطہ سید عبدالملک کی فرمائش پر حسین

Marfat.com

بن عماد بن محمد نام کے ایک کاتب نے ۱۰۱۶ھ میں لکھا تھا، بعد ازاں علی اصغر نامی ایک شخص نے اسے جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پر جہانگیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ تحریر موجود ہے "مرصاد العباد فرستادۂ علی اصغر خویش آقا عرب کہ از مستقر الخلافۃ اکبر آباد ارسال حضور نمودہ۔ بتاریخ ہفتم ماہِ شوال ۸ جلوس ہمایوں بتحویل خواجہ مطلوب تحویل دار کتاب خانہ سرکار علیہ داخل جمع نمودہ شد" یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ کسی بد ذوق نے شاہی مہریں مٹا دی ہیں۔ بہرحال یہ کتاب جہانگیر کے ذوقِ علم کی آئینہ دار ہے۔

غرّۃ الازیاج

غرّۃ الازیاج المعروف بہ زیچ ہندی ابوریحان البیرونی کی تصنیف ہے، اور ناظم کتاب خانہ کا دعویٰ ہے کہ پیر محمد شاہؒ لائبریری کا نسخہ دنیا بھر میں واحد مخطوطہ ہے۔ حال ہی میں حکومت ہندوستان نے اس مخطوطہ کا عکس حاصل کیا ہے۔ راقم کو معلوم نہیں ہو سکا کہ اسے حکومت ہندوستان نے شائع کر دیا ہے یا ابھی تک یہ طباعت کے مراحل سے گذر رہی ہے۔

الہلال

مخطوطات کے علاوہ اس لائبریری میں مولانا آزاد کے مجلّہ الہلال کا مکمل سیٹ بھی محفوظ ہے جو حال ہی میں آگرہ کے کسی علم دوست بزرگ نے لائبریری کے لئے مرحمت فرمایا ہے۔

Marfat.com

شاہانِ مغلیہ کا ذوقِ موسیقی

برصغیر پاک و ہند کے اکثر حکمران فن موسیقی میں بڑی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ معز الدین کیقباد[1]، سلطان جلال الدین خلجی[2] اور قطب الدین مبارک[3] کا اکثر وقت اسی شغل کی نذر ہوتا تھا۔ سلطان محمد بن تغلق کی ایسی تصاویر موجود ہیں جن میں وہ تخت پر بیٹھا کنیزوں کے گانے سے محظوظ ہو رہا ہے[4]۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اس فن لطیف کی بڑی ترقی ہوئی[5]، اور جہاں علم فقہ پر فوائد فیروز شاہی، فتاویٰ تتارخانیہ اور فقہ فیروز شاہی

---

[1] خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۱۸۹-۱۸۸

[2] ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۸ء، ص ۲۷،

[3] ایضاً، جلد ۲، ص ۲۱۶، "در مدت چہار سال و چہار ماہ کار نبود مگر شراب خوردن و سماع شنیدن"۔

[4] آغا مہدی حسن، رائز اینڈ فال آف محمد بن تغلق، مطبوعہ لندن ۱۹۳۸ء، تصویر بالمقابل ص ۳۔

[5] شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۱ء، ص ۳۶۸۔ سلطان فیروز تغلق کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے عفیف لکھتا ہے "کاروبار مطربان دہلی بجائے رسید کہ فرزندان خرد سال برابر خود کردہ از شہر دہلی تا فیروز آباد می آرند"

Marfat.com

جیسی بلند پایہ کتابیں لکھی گئیں وہاں علم موسیقی پر بھی فرید الزمان فی معرفت الالحان اور غنیۃ المنیہ[۵۶] جیسی قابلِ قدر کتابیں در طۂ تحریر میں آئیں۔ جونپور کی شرقی حکومت کے تاجدار سلطان ابراہیم کا اکثر و بیشتر وقت اسی شوق کی نذر ہوتا تھا۔ اس نے فنِ موسیقی پر سنسکرت زبان میں شروِمنی سنگیت کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب کی جس میں اس فنِ لطیف کے رموز و اسرار پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے پوتے سلطان حسین کو اس فن میں مجتہد کا درجہ حاصل تھا اور اس نے خیال، جونپوری، حسین کا نہڑا اور حسینی ٹوڈی جیسے راگ ایجاد کیے۔[۵۷] اکثر مؤرخین نے اپنی کتابوں میں سلطان حسین شرقی کا ذکر THE MUSICIAN KING OF JAUNPUR کے عنوان کے تحت کیا ہے۔[۵۸] کشمیر کا سلطان زین العابدین بھی موسیقی کا بڑا سرپرست تھا۔ مؤرخ کشمیر منشی محمد دین فوق تاریخ بڈشاہی میں رقمطراز ہیں کہ سلطان زین العابدین کو ساز و سرود سے بڑی رغبت تھی اور وہ اس فن کو خوب جانتا اور راگ کی ماہیت کو خوب سمجھتا تھا۔ اس نے ملّا غود اور جمیل جیسے مغنیوں کو، جو صاحبِ تصانیف اور کئی راگ راگنیوں کے موجد تھے، خراسان سے کشمیر بلایا اور ان کی خوب آؤ بھگت کی۔[۵۹] اس کے ایک درباری پنڈت

---

۵۶ ایتھے، فہرست مخطوطات فارسیہ، انڈیا آفس لائبریری لندن مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۰۳ء مخطوطہ نمبر ۲۰۰۸

۵۷ ڈاکٹر عبدالحلیم، الیسیز آن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۱۷

۵۸ عطیہ بیگم فیضی، دی میوزک آف انڈیا، مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء، ص ۶۵

۵۹ ڈاکٹر عبدالحلیم، الیسیز آن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۱۲

۶۰ محمد دین فوق، تاریخ بڈشاہی۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۴۴ء، ص ۳۳۸۔

Marfat.com

بودی بٹ نے علم موسیقی پر زین نام کی ایک کتاب لکھ کر سلطان کی خدمت میں پیش کی۔[111] سلطان کے ذوق وشوق کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ گاہ گاہے کتب موسیقی اور گویوں کا تبادلہ گوالیار کے راجہ کے ساتھ کیا کرتا تھا۔[112] گوالیار کے راجہ مان سنگھ تنوار کو تمام گویوں نے استاد تسلیم کیا ہے، اس نے دھرپد راگ ایجاد کیا[113] اور فن موسیقی پر مانکتوھل نام کی ایک کتاب لکھی،[114] جس پر شمالی ہندوستان کے گویوں کا مدتوں تک مدار رہا۔ اس نے گوالیار میں ایک میوزک اکیڈمی بھی قائم کی جہاں سے بڑے نامی گرامی گویے تربیت پا کر نکلے۔ بخشو نائک، جس کی بیٹی سے تان سین نے راگ سیکھا تھا، راجہ مان سنگھ تنوار کا تربیت یافتہ تھا۔ مالوہ کا فرمانروا باز بہادر بھی فن موسیقی میں مجتہد کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کے عہد میں مالوہ میں اس فن کو بہت عروج ہوا۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیر الدین محمد بابر شراب ونغمہ کا بڑا دلدادہ تھا، ویسے بھی شراب ونغمہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے عمر خیام نے کہا ہے۔

مے بر کفِ من نہ و بر آور غلغل   لا جام شراب دے لبالب بالکل

---

۱۱۱ ایضاً، ص ۳۴۰

۱۱۲ ڈاکٹر عبدالحلیم، اسیز آن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۱۸

۱۱۳ عطیہ بیگم فیضی، دی میوزک آف انڈیا مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء، ص ۲۳

۱۱۴ برہسپتی پدا بند و پادھیائے، دی میوزک آف انڈیا، مطبوعہ بمبئی، طبع اول، ص ۵۶

۱۱۵ سیف خان، راگ درپن، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۵۲

با نالۂ عندلیب و صوتِ بلبل	کس وقت نگر، جب ہوں چہکتے بلبل
بے نغمہ اگر بُدے مے خوردن	بے نغمہ اگر شراب ہوتی جائز
مے در سرِ شیشہ ہا نہ کردے قلقل[15]	سنتے نہ کبھی شیشے کے منہ سے قلقل[16]

فتح ہندوستان سے قبل اس کی عمر جس علاقے میں گذری اس کی فضا میں چاروں طرف میر علی شیر نوائی اور مولانا بنائی کے نغمے گونج رہے تھے۔ میر علی شیر خود ماہر ارغنون نواز ہونے کے علاوہ موسیقاروں کا بڑا خیال رکھتا تھا۔[17] اس کے متعلق عباس پرویز رقمطراز ہیں۔

چوں خود موسیقی می دانست تربیت	وہ چونکہ خود موسیقی داں تھا اس لیے
طبقۂ آہنگسازان و موسیقیدانان	وہ سازندوں اور گویوں کی تربیت
می پرداخت[18]	کا بڑا خیال رکھتا تھا۔

مولانا بنائی، شیبانی خان کے دربار میں ملک الشعراء کے منصب پر فائز تھے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ وہ موسیقی کے بھی ماہر تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان کے متعلق میر خواند لکھتا ہے :

از علم تصوف و موسیقی وقوف	وہ علم تصوف اور موسیقی میں
کامل داشت[19]	پوری دسترس رکھتے تھے۔

---

[15] عمر خیام، رباعیات، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۹۴۹ء، ص ۶۶

[16] آغا شاعر قزلباش، خمکدۂ خیام، مطبوعہ رفاہ عام پریس، لاہور۔ ص ۱۹

[17] دولت شاہ سمرقندی، تذکرہ، مطبوعہ تہران ۱۳۳۷ ش، ص ۵۶۹

[18] عباس پرویز، مقدمہ، روضۃ الصفا، مؤلفہ میر خواند، جلد اوّل، مطبوعہ تہران ۱۳۳۸ ش، ص "ط"

[19] میر خواند، روضۃ الصفا، جلد ہفتم، مطبوعہ تہران ۱۳۳۹ ش، ص ۲۰۱

Marfat.com

بابر نے بھی اپنی تزک میں مولانا بنائی کے ماہر موسیقی ہونے کا اعتراف کیا ہے[۲۰]۔ بابر کے عہد میں ہرات میں غلام شادی، حافظ حاجی، جلال الدین محمود، تل محمد عودی، شیخ نائی اور علی شیر بیگ جیسے باکمال موسیقار موجود تھے۔ بابر نے اِن سب کے کمالِ فن کا اعتراف اپنی تزک میں کیا ہے[۲۱]۔

ماوراُالنہر میں بابر کے حریف عبیداللہ خان ازبک کو فن موسیقی میں بڑا کمال حاصل تھا اور اس کی مُرتب کردہ دھنیں عوام میں بے حد مقبول تھیں۔ حیدر دوغلات کا کہنا ہے کہ وسطِ الشیاء کے شہروں اور قصبوں میں عوام اسی کے ترتیب دئے ہوئے نغمے الاپتے پھرتے تھے[۲۲]۔ اس ماحول میں رہتے ہوئے بابر کو بھی موسیقی سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور تزکِ بابری کے بعض اندراجات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موسیقی کے زیر و بم سے کماحقہٗ واقف تھا۔

تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں موروثی خصوصیتوں سے کافی بہرہ اندوز تھا اور اس کے دِل میں علمی ذوق ہر وقت موجزن رہتا تھا۔ اس نے ہفتہ میں دو دن موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لئے وقف کر دئے تھے۔ خوندامیر ہفتہ کے مختلف دنوں میں ہمایوں کی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے دوشنبہ اور چہار شنبہ کے ضمن میں لکھتا ہے :۔

---

[۲۰] تزک بابری، مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۸ھ، ص ۱۱۴

[۲۱] ایضاً، ص ۱۱۵ ، ۱۱۲ ، ۱۲۰

[۲۲] حیدر دوغلات، تاریخ رشیدی، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی، آفور کلکشن نمبر ۴۹، ورق ۲۴۸ الف

"این زمان در افزاہ اہلِ طرب از تصنیفات اوست۔"

Marfat.com

درین دو روز با جوانان قمر پیکر صحبت داشتہ با امتزاجِ لغات والحانِ ساز وآواز از دربار زیب و زینت بخشند۔[۲۳]	یہ دو دن بادشاہ قمر پیکر جوانوں کی صحبت میں بسر کرتا اور ملک کے ساز و نغمہ سے (محفل کی) رونق دو بالا کرتا تھا۔

شاہی دربار کے علاوہ کبھی کبھی شاہی حرم میں بیگمات کی موجودگی میں محلس طرب منعقد ہوا کرتی تھی جس میں — ساز ندھا و گو بندھا۔ اپنے اپنے فن کا کمال دکھایا کرتے تھے۔[۲۴]

مرأت سکندری کی روائت ہے کہ فتح مانڈو کے بعد ہمایوں تین صد جنگی قیدیوں کو قتل کروانا چاہتا تھا، اتفاق سے ان میں سلطان بہادر شاہ گجراتی کا درباری گویا منجھو بھی تھا۔ حسنِ اتفاق سے ایک ہندو راجہ کا اُدھر سے گذر ہوا اور اس نے منجھو کو پہچان لیا۔ راجہ نے ہمایوں سے اس کی جان بخشی کی سفارش کی، ہمایوں کا ایک درباری خوشحال بیگ قورچی جو ایک بار سلطان بہادر شاہ کے دربار میں ہمایوں کا ایلچی بن کر گیا تھا، وہ منجھو کے مقام سے واقف تھا۔ اس نے بھی موقع محل دیکھ کر ہمایوں سے کہا "این منجھو کلاونت پادشاہ لولیان است"[۲۵] بادشاہ نے منجھو کو کچھ سنانے کا حکم دیا۔ منجھو نے بادشاہ کا اشارہ پاتے ہی یہ غزل چھیڑی:۔

---

۲۳ خواند امیر، قانونِ ہمایونی، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۴۰ء، ص ۳۸

۲۴ گلبدن بیگم، ہمایوں نامہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۱۸۲

۲۵ سکندر بن محمد، مرآۃ سکندری۔ مطبوعہ بمبئی ۱۸۹۰ء ص ۲۵۰

Marfat.com

کسے نماند کہ اُو را بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی[۲۶]

منجھو کا گانا ختم ہونے سے قبل ہی ہمایوں کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس نے سُرخ لباس اُتار کر سبز لباس زیب تن کیا۔ بعد ازاں منجھو کی سفارش قبول کرتے ہوئے ہمایوں نے تمام قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا۔

ہمایوں نے منجھو کو اپنا مقرب بنا کر انعام و اکرام سے نوازنا شروع کیا لیکن اس کے باوجود وہ موقع پا کر بھاگ نکلا اور بہادر شاہ کے پاس جا پہنچا۔ ہمایوں کو اس کے فرار کی خبر ملی تو اس نے بے ساختہ کہا۔

کم بختی او بر این داشت و الّا ما	یہ اس کی بدبختی تھی جو اس نے
این قدر نوازش می فرمودیم کہ	ایسا کیا ورنہ ہم اسے اتنا انعام و
ہرگز سلطان بہادر را یاد نمی	اکرام دیتے کہ وہ سلطان بہادر شاہ
آورد[۲۷]	کا نام زبان پہ نہ لاتا۔

سکندر بن محمد کی روائت ہے کہ جب منجھو ہمایوں کے دربار سے بھاگ کر سلطان بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے مسرت کے ساتھ کہا۔

دیگر مرا آرزوئی نماندہ آنچہ از	اب میری اور کوئی خواہش نہیں رہی

۲۶۔ شاہنواز خان، مرأت آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری نمبر فارسی ۲۴، ورق ۲۹۴

۲۷۔ مرآۃ سکندری، ص۔ ۲۵

خدا میطلبیدم بمن رساند بس[٢٨] میں نے جو کچھ خدا سے مانگا وہ پا لیا

موسیقی کی سرپرستی میں صوفیائے کرام بھی بادشاہوں سے کسی طرح پیچھے نہ تھے۔ شاہی درباروں کے باہر صوفیائے کرام کی خانقاہیں موسیقی کا سب سے بڑا گہوارہ سمجھی جاتی تھیں۔ ہمایوں کے عہد میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی چشتیہ سلسلہ کے سربراہ تھے اور آپ کثرت کے ساتھ سماع سنتے تھے۔ لطائفِ قدوسی کے اندراجات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر ہر وقت جذب و مستی کا عالم طاری رہتا تھا۔ آپ کے صاحبزادے

---

٢٨ ایضاً۔ نوٹ:- ا۔ سکندر بن محمد نے اس گویئے کا نام منجھو لکھا ہے۔

(مراۃ سکندری، ص ٢٥٠)

ب۔ ہمایوں کے سوانح نگار بنرجی نے بھی اس کا نام منجھو ہی لکھا ہے۔

(ہمایوں بادشاہ، مطبوعہ کلکتہ ١٩٣٨ء، ص ١٣٤)

ج۔ شاہنواز خان نے اس کا نام بیجو لکھا ہے۔

(مرأت آفتاب نما، ورق ٢٩٤ ب)

د۔ عطیہ بیگم فیضی نے بھی اس کا نام بیجو ہی لکھا ہے۔ ان کے خیال میں اس نے ایک ٹوڈی بھی ایجاد کی تھی جو سلطان بہادر شاہ کے نام کی رعایت سے "بہادری ٹوڈی" مشہور ہے

(دی میوزک آف انڈیا، مطبوعہ لندن ١٩٢٥ء، ص ٦٥)

ہ۔ ایشوری پرشاد نے اس گویئے کا نام "بیجو" لکھا ہے۔

(اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا، مطبوعہ الہ آباد ١٩٣٠ء، ص ٦٦٤)

و۔ منشی محمد اکرم امام خان کے خیال میں اس کا صحیح نام بہنو ہے کیونکہ راجہ مان سنگھ تنوار نے مانکتو ہل میں ایسے ہی لکھا ہے (معدن الموسیقی، مطبوعہ لکھنؤ ١٩٢٥ء، ص ٢٧)

Marfat.com

رقمطراز ہیں کہ ہمارے والد ماجد کی شادی کی تقریب میں جونہی ڈومنیوں نے یہ دوہڑا گایا۔

کہو کہہ کھول دینا شہہ دیکھا لوری
اس گھونگھٹ کی کارن شہہ ہاتھ مروڑی

حضرت قطبی را حال وجد غالب آمد
وسوز عشق پیدا شد، از تختِ عروسی افتادند و در تواجد رقص فرمودند و جاہا عروسی ہمان ساعت پارہ پارہ کردند۔[۲۹]

حضرت قطب صاحب میں سوز عشق پیدا ہوا اور آپ وجد میں آگئے اور اسی عالم میں مسندِ عروسی سے نیچے گر پڑے۔ آپ نے فی الفور اپنا عروسی جوڑہ چاک کر ڈالا اور وجد کے عالم میں رقص کرنے لگے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے صاحبزادوں نے ان کی نشست و برخاست کے لیے جماعت خانہ کے صحن میں ایک چھپر ڈال دیا تھا اور اسی کے نیچے اکثر مجلسِ سماع منعقد ہوا کرتی تھی اور آپ سماع سنتے سنتے وجد میں آکر رقص کرنے لگتے۔ شیخ رکن الدینؒ نے لطائف قدوسی میں ایک محفل سماع کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

محمود قوالی از گجرات آمدہ بود ہمان
ساعت حاضر شدہ و سرود گفت
حضرت قطبی را حالتِ بسیار و وجد
بر کمالی پیدا شد آن چھپر را از صحن
جماعت خانہ شکستہ کردہ برون

محمود قوال گجرات سے (گنگوہ) آیا اور اسی لمحے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ محمود نے قوالی شروع کی جسے سن کر حضرت قطب صاحب کی حالت غیر ہوئی اور ان پر وجد طاری ہوا۔ اسی

---

[۲۹] شیخ رکن الدین، لطائف قدوسی، مطبوعہ دہلی ۱۳۱۱ھ، ص ۱۲

Marfat.com

آمد اختند و در صحن رقص و تواجد شد[۳۰]	عالم میں آپ نے وہ چھپر جماعت خانہ کے صحن سے اکھاڑ کر باہر پھینک دیا اور صحن میں رقص کرنے لگے۔

چشتی اس کا اعتراف بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں کہ سماع کو عام کرنے میں شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا بڑا ہاتھ ہے۔ اسی طرح سہروردی حضرات کا یہ کہنا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں موسیقی کی ترویج میں حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ کی کوششوں کو بڑا دخل حاصل ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شیخ موصوفؒ راگ کے زیر و بم سے کماحقہٗ واقف ہونے کے علاوہ اس فن کے بڑے سرپرست تھے۔[۳۱] شاہنواز خان حضرت کے کمال فن کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

ایشان در تودی مالسری را و دھناسری را ضم نمودہ ملتانی دھناسری نامیدہ اند و این مرغوب طبع حضرت خواجہ قطب الدین قدس سرہ بود[۳۲]	حضرت بہاءالدین زکریا نے ٹوڈی مالسری اور دھناسری کو ملا کر ملتانی دھناسری بنائی اور یہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو بہت مرغوب تھی۔[۳۳]

ملتانی دھناسری کے علاوہ حضرت بہاءالدین زکریاؒ نے نٹ ہمیر اور اہیر کو ملا کر گور راگ بنایا، یہ راگ گجرات میں بہت مقبول ہے۔ اسی طرح آپ نے

۳۰۔ ایضاً، ص ۳۲۔

۳۱۔ سیف خان، راگ درپن، مخطوطہ علیگڑھ یونیورسٹی لائبریری، ورق ۱۴ الف

۳۲۔ شاہنواز خان، مرأت آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری فارسی نمبر ۲۴/۲، ورق ۴۹۴ الف

۳۳۔ عنایت خان راسخ، رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۱ء، ص ۴۰

رام کلی، سیام اور گندھار کو ملا کر گوجری راگ بنایا۔[۳۴] محمد اشفاق علی خان نے ملتانی راگ کی ایجاد بھی آپ ہی کی طرف منسوب کی ہے۔[۳۵] ان راگوں کے علاوہ آپ نے پوربا اور دہناسری کو ملا کر پوربا دہناسری راگ ایجاد کیا۔[۳۶] ماہرین موسیقی کے ان بیانات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ اس فنِ لطیف میں مجتہد کا درجہ رکھتے تھے۔

ہمارے خیال میں موسیقی ایک لطیف فن تھا اور صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں موسیقی کو غذائے روح سمجھ کر سنا جاتا تھا۔ ایک ماہر موسیقار جناب شمس کنول اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"موسیقی فنونِ لطیفہ میں سے ایک بڑا لطیف فن ہے جس سے قلب انسانی پر مختلف کیفیتیں طاری ہوتی ہیں، کبھی دل حسرت و الم میں ڈوب جاتا ہے اور کبھی اس میں جوش و سرور پیدا ہوتا ہے اور اس طرح انسان کے مختلف جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں، صوفیائے کرام اور سنت سادھوں کا طبقہ موسیقی کو تزکیہ نفس اور تصفیۂ باطن کا ذریعہ سمجھتا ہے۔[۳۷] بڑے بڑے صوفیائے کرام نے موسیقی کی نوک پلک سنوارنے اور اسے بامِ عروج تک پہنچانے میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا ہے۔ اس ضمن میں مؤخر الذکر دونوں بزرگوں کے علاوہ امیر خسروؒ، صوفی بہاء الدین زیاویؒ، صوفی بشیر محمد، محمد غوث گوالیاریؒ، شیخ پیر میرٹھی، نظام الدین مدھ نائک،

---

[۳۴] محمد اشفاق علی خان، نغمات الہند، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ، ص ۷۷

[۳۵] ایضاً۔ [۳۶] شاہنواز خان، مرأت آفتاب نما، ورق ۲۹۴ الف

[۳۷] شمس کنول، "علم موسیقی" ماہنامہ آج کل دہلی، موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء، ص ۱۶

Marfat.com

میراں سید شاہ حسینؒ اور حضرت سید شاہ جمالؒ کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں
ہماری یہ رائے ہے کہ موسیقی جب تک رنڈی کے کوٹھے تک نہیں پہنچی
تھی اُس وقت تک اسے ایک پاکیزہ فن تصور کیا جاتا تھا، یہی وجہ تھی
کہ بڑے بڑے خدا رسیدہ درویشوں نے اسے پروان چڑھانے میں
اپنی عمریں صرف کر دیں اور اسے اپنے لیے بالکل عار نہ سمجھا۔

عہدِ ہمایوں میں حضرت محمد غوث گوالیاریؒ کی خانقاہ موسیقاروں
کا ملجا و ماویٰ تھی۔ تان سین کے والد مکرند پانڈے کو حضرت کے ساتھ
بڑی عقیدت تھی[۳۸]، اسی بنا پر اس نے تان سین کو بچپن ہی میں حضرت کے
پاس چھوڑ دیا تھا[۳۹]۔ حضرت نے کمال شفقت سے اس کی پرورش کی اور
ماہر اساتذہ کی نگرانی میں اُسے موسیقی کی تعلیم دلوائی، اور یہ حضرت
ہی کا فیضانِ نظر تھا کہ تان سین ہندوستان کا موسیقارِ اعظم کہلایا اور
ابوالفضل یہ لکھنے پر مجبور ہوا کہ گذشتہ ہزار سالوں میں اس کی نظیر ہندوستان
میں نہیں ملتی[۴۰]۔ تان سین کے علاوہ بیجو باورے کی تربیت میں بھی حضرت
محمد غوث گوالیاریؒ کا بڑا ہاتھ ہے۔

راجہ مان سنگھ تنوار والیٔ گوالیار کے درباری گویے نائک بخشو کا انتقال
ہو چکا تھا، البتہ اس کی بیٹی عہدِ ہمایوں میں بقیدِ حیات تھی۔ وہ فنِ موسیقی

۳۸؎ ایضاً، ص ۸۷

۳۹؎ پروفیسر محمد مسعود احمد نے تان سین کا شمار حضرت محمد غوثؒ کے مریدوں میں کیا ہے
ملاحظہ ہو ان کی تالیف، شاہ محمد غوث گوالیاریؒ مطبوعہ میر پور خاص ۱۹۶۴ء، ص ۱۳۰

۴۰؎ ابوالفضل، آئین اکبری، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۳ء، ص ۲۶۳

Marfat.com

میں اپنے باپ کی صحیح جانشین سمجھی جاتی تھی۔ اس کے ماہر فن ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کا موسیقارِ اعظم تان سین اس کا شاگرد تھا۔[۱۴۱]

ہمایوں کے عہدِ حکومت میں بندرابن میں دریائے جمنا کے کنارے ایک خدا رسیدہ ہندو باباہری داس رہتا تھا، اسے موسیقی پر مکمل دسترس حاصل تھی اور بڑے بڑے موسیقار اُسے اُستادِ فن تسلیم کرتے تھے۔ اس کے ماہر موسیقی ہونے کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوگا کہ اس کے تلامذہ میں تان سین کا نام بھی نظر آتا ہے۔[۱۴۲]

موسیقی کی تاریخ میں ہمایوں کا دورِ حکومت اس لئے بھی اہم ہے کہ اس کے عہد میں ایران سے کئی نامور موسیقار ہندوستان آئے اور وہ اپنا طرزِ اسلوب بھی ساتھ لائے۔ شمالی ہندوستان کے موسیقاروں نے ان کے ساتھ مل کر ہندوستانی موسیقی کو ایرانی سانچے میں ڈھال کر جدید ہندوستانی موسیقی کی بنیاد رکھی۔ اور اسی بنیاد کو بعض ہندو موسیقاروں نے "ایک تاریخی اتفاق" کا نام دیا ہے۔[۱۴۳]

ہمایوں کی ہندوستان سے جلا وطنی کے دوران اسلام شاہ سوری کے جانشین محمد عادل شاہ نے موسیقی کی شمع کو بجھنے سے بچا لیا۔ وہ موسیقی کا سرپرست ہونے کے علاوہ خود بھی بڑا اچھا گویا تھا۔ اس نے اپنے پایۂ تخت

---

[۱۴۱] محمد اسلم، شاہجہان کا ذوقِ موسیقی، مطبوعہ روزنامہ امروز، ۹ مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۷

[۱۴۲] عطیہ بیگم فیضی، دی میوزک آف انڈیا، مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء، ص ۲۳

[۱۴۳] بی سمجھا مورتی، آج کل دہلی موسیقی نمبر، ص ۸۷

Marfat.com

گوالیار میں راجہ مان سنگھ تنوار کی روایت کو زندہ رکھا اور گویّوں کی تربیت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے ماہر موسیقی ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ سلطان باز بہادر[۱۴۴] اور تان سین جیسے موسیقاروں نے اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔

اکبر کا دربار تو موسیقی کا گہوارہ معلوم ہوتا تھا۔ ابوالفضل رقمطراز ہے کہ قبلہ عالم اس فن پر خاص توجہ فرماتے اور ہر موسیقی دان کے سرپرست و مربی ہیں۔ بیشمار ہندی، ایرانی، تورانی اور کشمیری نغمہ پرداز بارگاہ عالی میں جمع ہیں جن میں مرد و عورت دونوں داخل ہیں۔ جہاں پناہ نے درباری گویّوں کو سات گروہوں میں تقسیم فرمایا ہے اور ہر گروہ ہفتے میں ایک روز حاضر ہو کر اپنے کمالات دکھاتا اور سامعین کے قلوب کو کانوں کے ذریعے سے بادۂ معرفت کا متوالا بنا کر کسی کو مست اور کسی کو ہشیار کرتا[۱۴۵]۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق چھتیس گویّے اور سازندے شاہی دربار میں ملازم تھے، ان میں سے گانے والوں میں میاں تان سین اور اس کا بیٹا تان ترنگ خان، سبحان خان اور اس کا بھائی بجتر خان، ملا اسحٰق اور اس کا بھائی رحمت اللہ، بابا رام داس اور اس کا بیٹا سور داس، سرود خان، داؤد، سرگیان خان، میاں چاند، محمد خان، میاں لال، چاند خان، نانک جارجہ اور رنگ سین خاص طور پر مشہور ہیں، اسی طرح طنبورہ بجانے میں اُستاد محمد حسین، اُستاد یوسف،

---

[۱۴۴] نظام الدین احمد، طبقات اکبری، جلد ۲، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۱ء، ص ۲۵۲ ــ "باز بہادر اپنے وقت میں ہندی موسیقی میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا اور اس کا زیادہ تر وقت رقاصوں اور کنچنیوں کی صحبت میں ہی گذرتا تھا۔"

[۱۴۵] ابوالفضل، آئین اکبری، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۷ء، ص ۲۶۳

Marfat.com

سلطان ہاشم اور اُستاد محمد امین، قانون بجانے میں میر عبداللہ، سارنگی بجانے میں میر سید علی اور بہرام قلی، سرمندل بجانے میں میر مندل خان، بنسری بجانے میں استادہ ست، بھاؤ بنانے میں پیرزادہ، حافظ خواجہ علی اور سلطان بیگ، بین بجانے میں صاحب خان اور پر بین خان، سرنا بجانے میں اُستاد شاہ محمد، تنبور نوازی میں تاش بیگ اور کرنا پھونکنے میں شیخ داد ثانی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ قاسم نامی ایک موسیقار نے قنبر اور رباب کے درمیان ایک ساز ایجاد کیا تھا جسے وہ شاہی دربار میں بجایا جاتا تھا۔

"آئین اکھاڑہ" کے تحت ابوالفضل رقمطراز ہے کہ اس آباد مملکت کے ذی عزت و ثروت افراد کے گھروں میں مجالسِ عیش منعقد کی جاتی ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ اندرونی کنیزوں کو ساز و نغمہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور چار خوش رنگ عورتیں ناچتی ہیں اور عجیب اصول ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسری چار عورتیں نغمہ سرائی کرتی ہیں، ان میں سے دو پکھاوج بجاتی ہیں اور باقی دو اپنگ، اسی طرح ایک عورت رباب، دوسری ڈھولک، تیسری بین اور چوتھی چنز بجاتی ہے۔ اسی طرح دو عورتیں ہاتھوں میں چراغوں کے تھال لیکر ان کے اردگرد گھومتی رہتی ہیں[۱۴۶]۔

اسی ضمن میں ابوالفضل رقمطراز ہے کہ قبلہ عالم کو سنگیت اور اس کے علاوہ دیگر امور میں بیشمار واقفیت حاصل ہے اور جو امور تمام عالم کے لئے کمالِ غفلت کا موجب ہو سکتے ہیں وہ گیتی خداوند کے لئے بیداری کا باعث ہیں[۱۴۷]۔

---

[۱۴۶] ایضاً، جلد ۲، ص ۲۲۶ [۱۴۷] ایضاً۔

Marfat.com

شاہی تقریبات اور جشنوں کے موقع پہ راگ و رنگ کو بڑی اہمیّت دی جاتی تھی۔ ابوالفضل رقمطراز ہے کہ ان موقعوں پہ ہر پہر کے آغاز پہ نقارے بجائے جاتے تھے اور ارباب نشاط اپنی نغمہ سرائی اور ساز نوازی سے ہنگامۂ عیش برپا کر دیتے تھے۔[۴۸] عہدِ اکبر کا شہرہ آفاق مؤرخ ملّا نظام الدین احمد جشنِ نوروز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بادشاہ روز و شب میں دو بار اس جشن میں شرکت کرتا اور اس کے ساتھ ایرانی اور ہندوستانی گویئے ہوتے تھے۔[۴۹] طبقاتِ اکبری کے اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جشن کے موقع پہ موسیقار پیش پیش ہوتے تھے جشن نوروز پہ اکبر کا فرنگیوں سے "موسیقیٔ فرنگ" سن کر محظوظ ہونا بھی ثابت ہے۔[۵۰]

ہندوستانی، ایرانی اور کشمیری موسیقی کے علاوہ فرنگیوں کی آمد و رفت کے بعد اکبر نے "موسیقیٔ فرنگ" سننے کا ذوق بھی پیدا کر لیا تھا۔ عبدالقادر بدایونی رقمطراز ہے کہ حاجی حبیب اللہ فرنگستان سے ارغنون[۵۱] نامی ایک باجہ لایا جو عجائب مخلوقات میں شمار ہوتا ہے۔ بادشاہ نے یہ باجا اہلِ دربار کو دکھایا اور اسے سن کر بے حد محظوظ ہوا۔ یہ باجا ایک قدِ آدم صندوق

۴۸؎ ایضاً، جلد اوّل، حصّہ اوّل، ص ۱۱۴۔

۴۹؎ ملّا نظام الدین احمد، طبقات اکبری، جلد ۲، ص ۲۵۵

۵۰؎ محمد حسین آزاد، دربار اکبری، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۷ء، ص ۱۵۲

۵۱؎ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کے خیال میں جس ساز کو بدایونی ارغنون لکھتا ہے وہ پیانو ہے۔ تذکرہ مجدد الف ثانیؒ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ص ۵۵

Marfat.com

تھا جس پر مور کے پر لگے ہوئے تھے۔ ایک فرنگی اس کے اندر بیٹھ کر اس کے تار ہلاتا اور دو فرنگی باہر بیٹھ کر موروں کے پروں کی جڑوں پر انگلیاں مارتے تھے۔ اللہ اللہ، اس میں سے کیسی کیسی روح پرور آوازیں نکلتی تھیں[۵۲]

موسیقی سن کر اکبر پر کیا گذرتی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۹۶۸ھ میں اکبر دار الحکومت سے شکار کے ارادہ سے نکلا۔ فتح پور سیکری کے قریب منڈاکر نام کے ایک گاؤں میں قوالی ہو رہی تھی اور قوال خواجہ غریب نوازؒ کی منقبت گا رہے تھے۔ قوالوں کی زبان سے خواجہؒ کی منقبت سن کر اکبر پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہیں سے اجمیر کی طرف باگ موڑ لی۔

اکبر کے ذوقِ موسیقی کے ضمن میں اس بات کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ تان سین کی صحبت میں رہ کر اکبر نے کلاسیکی موسیقی کا بڑا اعلیٰ ذوق پیدا کر لیا تھا۔ اکبر کے ذوق کے پیشِ نظر تان سین نے درباری کانہرہ، دربار کلیان، درباری اساوری اور سہانہ جیسے راگ مرتب کئے[۵۳]۔ ڈاکٹر عبدالحلیم کی تحقیق کے مطابق میاں کی ملہار، میاں کی ٹوڈی اور میاں کی سارنگ بھی تان سین کے ہی مرتب کردہ راگ ہیں[۵۴]۔ خوش قسمتی سے تان سین کے مرتب کردہ راگوں کے مسودات رضا لائبریری رام پور میں

---

۵۲ بدایونی، منتخب التواریخ، مطبوعہ نولکشور ۱۲۸۴ھ، ص ۲۳۴

۵۳ محمد اشفاق علی خان، نغمات الہند، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ، ص ۷۸۔

۵۴ ڈاکٹر عبدالحلیم، الیسینز آن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۲۹۔

Marfat.com

محفوظ ہیں اور ایتھل روز نتھال نے اپنی تصانیف میں ان سے پوری طرح فائدہ اُٹھایا۔[۵۵]

تان سین کے متعلق سید عابد علی عابدؔ تحریر فرماتے ہیں کہ اس نے کلاسیکی سنگیت کو ایک نیا رس، نئی حلاوت اور نیا بانکپن بخشا۔ اس نے راگوں میں نہایت دلکش تصرفات کئے اور یہ راگ ان تصرفات کے ساتھ اب اُسی کے نام سے منسوب ہیں، مثلاً میاں کی ٹوڈی، میاں کی ملہار، لیکن جس راگ کی بدولت تان سین کا نام کلاسیکی سنگیت میں ہمیشہ زندہ رہے گا، وہ درباری ہے، جسے سن کر بقول اکبر کہا کرتا تھا کہ دل کی سوئی ہوئی تمنائیں جاگ اُٹھتی تھیں اور بڑے بڑے کام کرنے کے ولولے بیدار ہوتے تھے۔[۵۶]

درباری کے متعلق پروفیسر خادم محی الدین لکھتے ہیں کہ یہ اوّل شب گذر جانے اور آدھی رات شروع ہونے سے کچھ عرصہ پیشتر گایا جاتا ہے جونہی اس کے دھیمے ابتدائی سُر۔ نی سارے سادھا، نی پا گانے۔ شروع کئے جائیں، سن کر طبیعت میں سکون پیدا ہوتا ہے۔ اس راگ کے سروں کے بیشتر حصّے کا زور نیچے کے سپتک پر رہتا ہے۔ شہنشاہ اکبر کا یہ مرغوب راگ تھا، امورِ سلطنت کے خرخشوں اور جھمیلوں میں دن بھر مصروف رہنے کے بعد شاہ کو امن اور سکون مطلوب تھا، اسی لئے تان سین یہ راگ پیش کرتا تھا۔[۵۷]

---

۵۵ ایتھل روز نتھال، وی سٹوری آف انڈین میوزک اینڈ اِٹس انسٹرومنٹس، مطبوعہ لندن ۱۹۲۸ء ص ۸۰

۵۶ سید عابد علی عابد، ماہنامہ قندِ مردان، موسیقی نمبر مئی جون ۱۹۶۰ء، ص ۸۲۔

۵۷ خادم محی الدین، بحوالہ ایضاً، ص ۱۰

Marfat.com

ہندوستانی موسیقی کو پروان چڑھانے میں تان سین نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کی وجہ سے اس کا نام قیامت تک زندہ رہے گا۔ ابوالفضل نے، جو خود بھی موسیقی کا بڑا ماہر تھا، یونہی نہیں لکھ دیا تھا کہ گذشتہ ہزار سال میں اس جیسا گویا اس سرزمین میں پیدا نہیں ہوا جہانگیر نے اپنی تزک میں تان سین کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

تان سین کلاونت کہ در خدمت پدرم بے نظیر زمان خود بودہ بلکہ در ہیچ عہد و قرن مغنی مثل او نگذشتہ[۵۸]

تان سین کلاونت جو میرے والد کا ملازم تھا اپنے زمانے میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ (اپنے زمانے کی تو بات ہی کیا) کسی زمانے میں بھی اس جیسا گویا پیدا نہیں ہوا۔

تان سین چونکہ مسلمان تھا اور اس نے ہندوستانی موسیقی میں کچھ تصرفات بھی کئے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ اس نے موسیقی کو ذریعہ معاش بنا لیا تھا، اس لئے ہندو اس سے خوش نہیں ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ تان سین ہندوؤں کی موسیقی کے زوال کا سبب بنا ہے۔[۵۹]

الناس علیٰ دین ملوکھم کے مصداق اکبر کے مصاحب اور حواری بھی موسیقی میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ عہدِ اکبر کے مشہور مؤرخ ملّا عبدالقادر بدایونی اکبر کے پیش امام تھے۔[۶۰] اس کے باوجود وہ موسیقی کے بڑے دلدادہ تھے۔ محمد حسین آزاد بدایونی کے متعلق لکھتا ہے "ملا صاحب

---

۵۸ تزکِ جہانگیری، سرسید ایڈیشن، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۲۰۴

۵۹ فاکس سٹرینج ویز، دی میوزک آف ہندوستان، مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۱۴ء، ص ۸۴۔

۶۰ منتخب التواریخ، جلد ۲، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء، ص ۲۲۷

Marfat.com

خود رو کھے سوکھے عالم تھے مگر طبیعت ایسی شگفتہ و شاداب لائے تھے جو انشاء پردازی کی جان تھی، باوجود علم و فضل اور مشیخت فقر کے گاتے بجاتے تھے، بین پر بھی ہاتھ دوڑاتے تھے۔[۶۱] بدایونی خود اپنے متعلق منتخب التواریخ میں رقمطراز ہے۔

رقوف در نغمہ ولایت و ہندی
وخبری از شطرنج صغیر و کبیر دارد
ومشق بین بقدری کردہ[۶۲]

میں ہندوستانی اور غیر ملکی نغموں سے بخوبی واقف ہوں، اس کے علاوہ شطرنج کی چھوٹی بڑی بازی بھی لگا لیتا ہوں اور بین بجانا بھی جانتا ہوں۔

اس زمانے میں فنِ موسیقی کو بڑا پاکیزہ فن تصور کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ گانے بجانے کا شوق بدایونی کی امامت کے راستے میں حائل نہ تھا۔ بدایونی تو خیر پھر بھی پیش امام تھے، اکبر کے صدر الصدور شیخ گدائی کے متعلق مشہور ہے کہ ان کی طبیعت موزوں تھی، ہندی گیت اور دوہروں کی لَے آپ رکھتے تھے۔ قوالوں سے گواتے تھے اور آپ بھی گاتے تھے اور اس کے ذوق و شوق میں لٹو تھے اور دیوانے تھے۔[۶۳]

شیخ گدائی کے والد شیخ جمالی سلطان سکندر لودھی کے اُستاد اور بڑے نغز گو شاعر تھے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انہیں موسیقی سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ شیخ موصوف کی ایک غزل جس کے ابتدائی شعر درجِ ذیل

---

۶۱ محمد حسین آزاد، دربارِ اکبری، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۷ء، ص ۴۲۲

۶۲ منتخب التواریخ، جلد ۳، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء، ص ۳۰۴

۶۳ محمد حسین آزاد، دربار اکبری، ص ۳۷۷

Marfat.com

ہیں، عہدِ اکبر میں بڑے ذوق وشوق سے گائی جاتی تھی اور کہتے ہیں کہ انھوں نے خود ہندوستانی راگ میں اس کی لے رکھی تھی۔

طال شوقی الی لقائکم　　ایھا الغالبون من نظری

روز و شب مونسم خیال شما　　فاسئلوا عن خیالکم خبری[۶۴]

شیخ مبارک ناگوری علومِ شریعت کے ساتھ ساتھ فنِ موسیقی میں بھی کامل دسترس رکھتا تھا، بدایونی شیخ موصوف کی علمیت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے۔ "ملائی باین جامعیت بنظر نیامده[۶۵]" شیخ کا ذوق موسیقی اس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ:۔

بکدم بی استماع صوتی ولغتشی وسرودی　　وہ آواز، گانے، راگ اور ساز کے

دسازی آرام نمی گرفت[۶۶]۔　　بغیر ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتا تھا۔

پروفیسر علم الدین سالک شیخ مبارک کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ اُسے موسیقی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، ایک دفعہ اکبر سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی، بادشاہ نے کہا کہ اس فنِ لطیف کے سلسلے میں ہم سے جو سامان بہم پہنچا ہے وہ کسی اور جگہ نہیں ہے، کسی دن ہم دکھائیں گے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد شیخ منجھو، میاں تان سین اور دیگر کلاونتوں کو بلا بھیجا اور انہیں کہا کہ وہ شیخ کے گھر جا کر اپنے کمال فن کا مظاہرہ کریں۔ شیخ نے سب سے سنا، آخر میں میاں تان سین سے مخاطب

---

۶۴ ایضاً، ص ۷۷

۶۵ بدایونی، منتخب التواریخ، جلد ۳، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء، ص ۷۴

۶۶ ایضاً، ص ۷۳

ہوئے اور کہا "شنیدم تو ہم چیزے میتوانی گفت" اس پر میاں تان سین نے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا، جسے سن کر آپ نے کہا "ہاں کچھ جانوروں کی طرح بولیاں بول لیتے ہو"۔ اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مبارک کا ذوقِ موسیقی اتنا بلند تھا کہ وہ بڑے سے بڑے گویے کو خاطر میں نہ لاتے تھے، وہی تان سین جس کے متعلق ابوالفضل لکھتا ہے کہ گذشتہ ہزار برس میں اس سرزمین میں اس جیسا کوئی گویّا پیدا نہیں ہوا، اس کے متعلق ابوالفضل کے والد کہتے تھے کہ وہ جانوروں کی طرح کچھ بھائیں بھائیں کر لیتا ہے۔

شیخ مبارک کے ذوقِ موسیقی سے اس کے بیٹوں کو بھی وافر حصّہ ملا تھا، چنانچہ فیضی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ موسیقی کا ماہر تھا۔[۶۸] شیخ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں جس طرح موسیقی کے زیر و بم پر بحث کی ہے وہ خود اس کے ماہرِ فن ہونے کی دلیل ہے۔

اکبر کے اتالیق بیرم خان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ موسیقی کا بڑا دلدادہ اور موسیقاروں کا سرپرست تھا۔ اس کا ایک واقعہ محمد حسین آزاد نے دربارِ اکبری میں نقل کیا ہے۔ آزاد لکھتا ہے کہ "رام داس لکھنوی، سلیم شاہی زمانہ کا گویّا تھا کہ موسیقی میں دوسرا تان سین کہلاتا تھا۔ وہ اس کے دربار میں آیا اور گایا۔ خزانہ میں اس وقت کچھ نہ تھا، اس پر لاکھ

---

[۶۷] پروفیسر علم الدین سالک، نقوش لاہور نمبر ۱۹۶۲ء، ص ۴۶۸، ۴۶۷۔ بدایونی نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو منتخب التواریخ، جلد ۲، ص ۲۶۵

[۶۸] شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد ۳، مطبوعہ ظفر بکڈپو، لاہور، ص ۱۴۱۔

Marfat.com

روپیہ دیا۔ اس کا گانا بہت پسند تھا۔ چنانچہ خلوت و جلوت میں محرم اور ہمدم تھا۔ جب وہ گاتا تھا خانخانان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ ایک جلسہ میں نقد جنس جو اسباب موجود تھا سب دے دیا اور آپ الگ اٹھ گیا[۹۶]۔ بیرم خان کے فرزند عبدالرحیم خانخانان کو اس فنِ لطیف کے ساتھ جو مناسبت تھی اس کے ذکر کے لئے ایک الگ دفتر درکار ہے۔ جس کی اس مضمون میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

عہد اکبر کے موسیقاروں میں سورداس اور تلسی داس کا بھی بہت اونچا مقام ہے۔ ان کا چونکہ دربار سے کوئی تعلق نہ تھا اس لئے فارسی تذکروں اور تاریخوں میں ان کا ذکر نہیں آیا۔ یہ دونوں تارک الدنیا سادھو سنت تھے اس لئے ہندوؤں کی روایات میں ان کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ آیا ہے، بلکہ ہندو لوگ ان کے سامنے تان سین کو بھی طفلِ مکتب ہی سمجھتے ہیں۔ اسی ضمن میں چتوڑ کی شہزادی میرابائی کا ذکر بیجا نہ ہوگا۔ میرابائی رانا سانگا کے ولی عہد کی دھرم پتنی تھی، لیکن عین نوجوانی کے عالم میں بیوہ ہوگئی۔ میرابائی نے دنیاوی لذات سے منہ موڑ کر ایشور کے ساتھ لو لگالی اور فقیرانہ بھیس میں راجستھان کے قریہ قریہ میں گھومنے لگی۔ وہ بڑی اچھی شاعرہ تھی اور اس پہ طرہ یہ کہ موسیقی کا ذوق بھی کما حقہٗ پایا تھا۔ اس پہ خاوند کی موت کا صدمہ مستزاد تھا۔ ان سب عوامل نے مل کر اسے بڑی اچھی گلوکارہ بنا دیا۔ میرابائی کے بھجن آج تک گائے جاتے ہیں اور وہ ہندی لٹریچر کا بہترین سرمایہ ہونے کے علاوہ فنِ موسیقی

۹۶۔ محمد حسین آزاد، دربارِ اکبری، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۷ء، ص ۱۹۴

Marfat.com

کا بھی بیش بہا سرمایہ ہیں۔ عطیہ بیگم فیضی نے میرا بائی کی بحیثیت موسیقار بڑی تعریف کی ہے[۷۰]

اکبر کے عہد میں گوالیار اور بلگرام موسیقی کے مرکز مانے جاتے تھے۔ اکبر کے دربار کے اٹھارہ گوّیوں میں سے گیارہ گوالیار کے رہنے والے تھے[۷۱] ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ مان سنگھ تنوار نے گوالیار میں ایک میوزک اکیڈمی قائم کی تھی، جہاں سے بڑے بڑے گوّیے تربیت پاکر نکلے۔ مان سنگھ کے بعد محمد عادل شاہ اور پھر حضرت محمد غوث گوالیاری نے اس کی روایات کو برقرار رکھا۔ وہ دن اور آج کا دن، گوالیار دنیا موسیقی کی راجدھانی سمجھا جاتا ہے۔ بلگرام کے متعلق ابوالفضل رقمطراز ہے کہ وہاں کے باشندے اپنی فہم و فراست میں مشہور اور موسیقی کے دلدادہ ہیں[۷۲]

جہانگیر بھی اپنے باپ کی طرح موسیقی کی سرپرستی کرتا رہا۔ اس کے دربار میں اُستاد محمد نائی، شوقی طنبورہ نواز، باتیا، جہانگیر داد، چتر خان، حافظ عبداللہ، حافظ نادعلی، نصیرا، حافظ چیلہ، حافظ کیب فتحا، رحیم داد خان، پرویز داد، خرم داد، ماکھو اور حمزہ جیسے نادر روزگار ماہرین موسیقی موجود تھے۔ ان میں سے اکثر کے کمالِ فن کا اعتراف اس نے اپنی تزک میں کیا ہے۔ جہانگیر اُستاد محمد نائی کا بڑا قدردان تھا۔ ایک موقع پر

---

۷۰ دی میوزک آف انڈیا، مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء، ص ۲۳

۷۱ ٹی۔ ڈبلیو۔ ہیگ، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مطبوعہ لیڈن، آرٹیکل "تان سین"

۷۲ آئین اکبری، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۷ء، ص ۴۳۲

Marfat.com

وہ اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

استاد محمد نائی را کہ در فنِ خود از بے نظیران بود، فرزند خرم موجب طلب فرستادہ بود، چند مجلس سازِ او شنیدہ شد و نقشی کہ در غزل بنامِ من بستہ بود گذرانید، در دوازدہم ماہ مذکور فرمودم کہ او را بروپیہ وزن نمودند، شش ہزار و سیصد روپیہ و فیل حوضہ داری نیز باو عنایت نمودہ، مقرر فرمودم کہ بر آن فیل سوار شدہ و زرہا بر اطراف و جوانب خود چیدہ و پاشیدہ بمنزل خود برد[۷۳]

اُستاد محمد نے نواز کو، جو اپنے فن میں یکتا تھا، میرے کہنے پر خرم نے میرے پاس بھیج دیا۔ چند مجلسوں میں میں نے اُس سے ساز سنا اور اس نے جس غزل کی لے میرے نام سے تیار کی تھی، اس کا بھی مظاہرہ کیا۔ ماہ مذکور کی بارہ تاریخ کو میں نے حکم دیا کہ اسے روپوں کے برابر تولا جائے۔ چھ ہزار تین سو روپے اور ایک ہاتھی معہ ہودج اُسے عنایت کیا۔ میں نے اُسے حکم دیا کہ وہ اس ہاتھی پر سوار ہو کر اپنے گھر جائے، اور راستے میں دونوں طرف رُپے پیسے برساتا جائے۔

اکبر نے بھی بڑی دریا دلی کے ساتھ موسیقاروں کی سرپرستی کی تھی، لیکن جس انداز سے جہانگیر نے ایک نے نواز کو نوازا تھا اس کی مثال عہدِ اکبر میں دیکھنے میں نہیں آتی۔ جہانگیر شوقی طنبورہ نواز کے کمالِ فن کا بھی بڑا معترف تھا، اس نے اپنی تزک میں اُسے ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

شوقی طنبورہ نواز را کہ از نادرہائے

شوقی طنبورہ نواز کو، جو زمانے بھر میں

---

[۷۳] تزک جہانگیری، سرسید ایڈیشن، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۱۸۶

روزگار است و نغمات ہندی وپارسی رابروشی مینوازد کہ زنگ از دلہا زداید ، بخطاب آنند خانی دلخوش ومسرور ساختم، آنند بزبان ہندی خوشی وراحت را می گویند[۷۴]

اپنے فن میں یکتا ہونے کے علاوہ ہندوستانی اور ایرانی نغمات اس انداز سے گاتا ہے کہ انہیں سن کر دلوں کا زنگ اتر جاتا ہے، میں نے آنند خان کا خطاب دے کر خوش اور مسرور کیا۔ ہندی زبان میں آنند، خوشی اور راحت کو کہتے ہیں۔

معتمد خان نے اقبال نامہ جہانگیری میں دربارِ جہانگیر کے تیرہ سو موسیقاروں کا ذکر کیا ہے جو اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے[۷۵]۔ جہانگیر کے درباری موسیقاروں میں رحیم داد خان کا بڑا اونچا مقام تھا، وہ تلونڈی کا رہنے والا اور اپنے فن کا امام مانا جاتا تھا۔ جہانگیر کے حکم سے اس نے شہزادوں کو موسیقی کے زیر و بم سے متعارف کروایا تھا[۷۶]۔

اکبر کے عہد میں یعقوب نام کا ایک عیسائی تاجر حلب سے بسلسلۂ تجارت آگرہ آیا۔ وہ کئی زبانوں کا ماہر تھا۔ پرتگیزوں کے ساتھ مذہبی مذاکرات کے سلسلہ میں اکبر کو فارسی اور پرتگیزی زبانیں جاننے والے مترجم کی ضرورت تھی، چنانچہ اکبر نے یعقوب کو ملازم رکھ لیا، روایت ہے کہ یعقوب نے دینِ الٰہی قبول کر لیا تھا۔ یعقوب کی وفات کے بعد اکبر نے اس کے دو[۷۷] بیٹوں ذوالقرنین اور سکندر کی تربیت اپنی نگرانی میں کی اور اول الذکر کو

---

۷۴ ایضاً، ص ۱۶۲

۷۵ اقبال نامہ جہانگیری، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء، ص ۳۰۸

۷۶ آغا صادق، ماہنامہ قند مردان، موسیقی نمبر مئی جون ۱۹۶۰ء، ص ۶۱

Marfat.com

موسیقی کی تعلیم دلائی۔ ذوالقرنین کو موسیقی پر مکمل دسترس حاصل تھی اور وہ جہانگیر اور بعد ازاں شاہجہان کے دربار میں اساتذۂ فن کی موجودگی میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتا تھا[۷۷]۔ شاہنواز خان نے بھی ذوالقرنین کو بحیثیت موسیقار خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

عہد جہانگیر میں ٹھٹھہ کا گورنر عیسیٰ خان ترخان بھی موسیقی کا بڑا اونچا ذوق رکھتا تھا۔ شاہنواز خان اس کے متعلق لکھتا ہے۔

دل دادہ راگ و رنگ بود، و در نغمہ خوانی و ساز نوازی خالی از کمال نبود[۷۹]	وہ راگ رنگ کا دلدادہ تھا، راگ گانے اور ساز بجانے میں بھی بڑا کمال رکھتا تھا۔

عہد اکبر کی طرح عہد جہانگیر میں بھی شاہی تقریبات اور جشنوں کے موقع پر گویئے اور سازندے پیش پیش ہوتے تھے۔ جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے بعد جب پہلا نوروز منایا تو نوروز کی تقریبات میں اہل ساز و نغمہ نے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا[۸۰]۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں گیارھویں سال جلوس میں نوروز کے موقعہ پر حافظ ناد علی کو انعام دینے کا ذکر کیا ہے[۸۱]۔

---

۷۷ ڈاکٹر عبدالحلیم، ایسیسنز آف ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۲۱، ۲۲

۷۸ مرأت آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۲۹۶ ب۔

۷۹ شاہنواز خان، مآثر الامراء، جلد ۳، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۱ء، ص ۴۹۲

۸۰ تزک جہانگیری، سرسید ایڈیشن، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۲۲

۸۱ ایضاً، ص ۱۵۵

Marfat.com

سولھویں سال جلوس میں جب جہانگیر طویل علالت کے بعد صحت یاب ہوا تو نورجہاں نے اس خوشی میں ایک جشن آراستہ کیا جس میں اہلِ نشاط موجود تھے۔[۸۲]

جہانگیر قوالی کا بھی دلدادہ تھا اور اس کی مجلس سماع میں صوفیان باصفا کو وجد آجاتا تھا۔ ایک بار دہلی کے قوال اس کے حضور میں قوالی پیش کر رہے تھے اور جب اُنھوں نے امیر خسروؒ کا یہ شعر پڑھا۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

تو ملّا علی احمد مُہرکن کو وجد آگیا۔ اُنھوں نے بھی اپنی ٹوپی ذرا ترچھی کر لی اور تڑپ کر زمین پر گرے۔ جہانگیر نے لپک کر ان کا سر اُٹھایا تو ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔[۸۳]

بادی النظر میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے مرنے کے ساتھ ہی موسیقی کو زوال آگیا تھا اور شاہجہان کی زر پاشیوں کی بدولت اسے دوبارہ عروج ہوا لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ جن گویوں نے شاہجہان کے عہد میں نام پایا ان کی تربیت جہانگیر کے عہد میں ہوئی تھی۔ اس لیے جہانگیر کے دور کو موسیقی کے زوال کا دور نہیں کہا جاسکتا۔ اب رہا یہ اعتراض کہ جہانگیر کا دور اگر موسیقی کے زوال کا دور نہیں تھا تو پھر اس عہد کے تذکروں میں موسیقاروں کا ذکر زیادہ کیوں نہیں ملتا۔

---

۸۲ ایضاً۔ ص ۳۲۵۔

۸۳ ایضاً۔ ص ۸۲۔

Marfat.com

اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اکبر کے ساتھ اس کے درباری گویئے تو نہیں مر گئے تھے، اس لئے جن گویّوں کا ذکر اکبر کے عہد کی تاریخوں اور تذکروں میں آچکا تھا، اسے عہد جہانگیری میں دہرانا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اسی طرح جو گویئے عہد جہانگیر میں ابھی مبتدی تھے اور انھوں نے عہدِ شاہجہان میں شہرت پائی، ان کا ذکر عہدِ شاہجہان میں لکھی جانے والی تاریخوں میں آیا ہے۔

شاہجہان اپنے آباؤ اجداد کے تمام اوصافِ حمیدہ سے متصف تھا اور اس کے دل میں علمی ذوق ہر وقت موجزن رہتا تھا، لیکن اس کا حسنِ ذوق علم و ادب یا نزک نویسی کی بجائے جامع مسجد دہلی کی ندرت اور نفاست میں ظاہر ہوا۔ ایک ماہرِ فن کے بقول اس نے محبت کا نغمہ شعر و شاعری میں نہیں بلکہ تاج محل میں منظوم کیا۔ اس کے تمام ہم عصر مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ اس نے زندگی بھر نماز باجماعت اور تہجد قضا نہیں کی، لیکن اس علم و فضل اور نیکی و تقویٰ کے باوجود وہ فنِ موسیقی کی سرپرستی میں اپنے باپ اور دادا سے بھی آگے بڑھا ہوا تھا۔

سر جدوناتھ سرکار اپنی تصنیف "سٹڈیز ان مغل انڈیا" میں رقمطراز ہے کہ شاہجہان کی اپنی آواز بڑی سریلی تھی اور خدا تعالیٰ نے اُسے لحن داؤدی عطا کیا تھا، جب وہ بات کرتا تو سننے والے بت بن جاتے تھے[۱]۔ اسی ضمن میں مؤرخ شہیر الیشوری پرشاد لکھتا ہے کہ بادشاہ نے خود کئی ہندی راگ ایجاد کئے تھے، جو اس قدر مدہوش کن اور دلکش تھے کہ سماع کی

---

[۱] سر جدوناتھ سرکار، سٹڈیز انِ مغل انڈیا، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۱۹ء، ص ۱۳

Marfat.com

محفلوں میں صوفیائے باصفا انہیں سن کر گھنٹوں وجد کے عالم میں رہتے تھے۔[۵۵]

پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں "قواعد السلطنت شاہجہان" نام کی ایک کتاب موجود ہے جو بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا فتح الملک بہادر کے کتب خانہ میں رہ چکی ہے۔ اس کا مصنف لکھتا ہے کہ شہنشاہِ معظم کو ایرانی، کشمیری اور ہندوستانی راگ راگنیوں سے خاص لگاؤ تھا اور وہ بسا اوقات نصف شب تک ان سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔[۵۶] سر جادو ناتھ سرکار کی تحقیق کے مطابق شاہجہان رات کے ساڑھے آٹھ بجے حرم میں چلا جاتا اور وہاں دو تین گھنٹے تک موسیقی سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔[۵۷] عہدِ حاضر میں شاہجہان کا مشہور سوانح نگار بنارسی پرشاد سکسینہ لکھتا ہے کہ بادشاہ سلامت امورِ سلطنت سے فارغ ہو کر تکان دور کرنے کے لئے غروب آفتاب سے قبل موسیقی سے محظوظ ہوا کرتے تھے اور معمول کے مطابق رات کو سونے سے پہلے بھی سماع سنتے تھے۔ رات کی محفلوں میں عام طور پر گانے بجانے پر کنیزیں مامور تھیں۔ اس کے علاوہ شاہی دربار میں بھی خاص جشنوں کے موقع پر راگ رنگ کا پروگرام پیش کیا جاتا تھا، جس میں اساتذۂ فن حصہ لیتے تھے۔[۵۸]

اسی ضمن میں شاہجہان کا ایک ہم عصر مؤرخ امین قزوینی رقمطراز ہے کہ

---

[۵۵] ایشوری پرشاد، اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا، مطبوعہ الٰہ آباد ۱۹۶۶ء، ص

[۵۶] قواعد السلطنت شاہجہان، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی، ورق ۱۴ ب

[۵۷] سٹڈیز ان مغل انڈیا، ص ۱۳

[۵۸] بنارسی پرشاد سکسینہ، ہسٹری آف شاہجہان آف دہلی، مطبوعہ الٰہ آباد ۱۹۶۲ء، ص ۳۳۷

Marfat.com

بادشاہ اکثر اوقات ساز و نغمہ سے جی بہلاتا ہے اُسے ہندی نغمات کے ساتھ ایک خصوصی لگاؤ ہے اور جو اس فن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ انہیں موسیقی سے زیادہ اور کسی چیز میں لذت محسوس نہیں ہوتی۔ ہندوستانی موسیقی پر بادشاہ کی بڑی گہری نظر ہے اور اس کے علاوہ ایرانی اور غیر ملکی موسیقی سے وہ بڑی حد تک واقف ہے۔ اس ضمن میں اس بات کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ دوسرے ممالک کے لوگ نغمہ و لحن پر زیادہ زور دیتے ہیں لیکن ہندوستانی نزاکت اور معانی کے قدردان ہیں۔ بادشاہ عموماً نماز مغرب کے بعد موسیقی سنتا ہے۔ اور مجلس موسیقی برخاست کر کے نماز عشاء باجماعت ادا کرتا ہے۔[۸۹]

ناٹک بخشو کو فوت ہوئے ایک زمانہ گذر چکا تھا لیکن شاہجہان کو اس کے کمالِ فن کا اعتراف تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں وقت گذرنے کے ساتھ اس نادر روزگار موسیقار کا فن بھی ختم نہ ہو جائے۔ شاہجہان نے ماہرینِ فن کو مامور کیا کہ وہ بخشو کے گائے ہوئے دھرپد راگ جمع کریں۔ انھوں نے شب و روز کی محنت شاقہ کے بعد "ہزار دھرپد ناٹک بخشو" کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ حسنِ اتفاق سے یہ کتاب زمانہ کی دست برد سے بچ کر بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں محفوظ ہے۔[۹۰] شاہجہان کے عہد کے اکثر گویوں کا مدار بخشو کی تصانیف پر تھا۔

---

۸۹ قزوینی، پادشاہنامہ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۷۳، ورق ۱۴۱ الف

۹۰ زخاؤ اینڈ ایتھے، فہرست مخطوطات فارسیہ و ترکیہ وغیرہ، جلد اوّل، مطبوعہ آکسفورڈ ۱۸۸۹ء، مخطوطہ فارسی ۱۸۴۶

Marfat.com

اس حقیقت کا اعتراف شاہجہان کے درباری مؤرخ عبدالحمید لاہوری نے
ان الفاظ میں کیا ہے۔

امروز مدار خنیاگران ہندوستان بہشت نشان بر تصانیف بخشو و تصانیف او ست[91]	آج کل ہندوستان بہشت نشان کے گویوں کا دارومدار نائک بخشو اور اس کی تصانیف پر ہے۔

بادشاہنامہ میں قزوینی نے بھی بخشو نائک کو دل کھول کر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس دور میں بخشو کی طرز خاص و عام میں مقبول ہے تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ اس جیسی — صورت و صدا و حسن و ادا — کے ساتھ کوئی نہیں گا سکتا۔[92] اس بات کا اعتراف عبدالحمید لاہوری نے بھی کیا ہے کہ عہد شاہجہان میں بخشو جیسی ٹیپ دوسرے نغمہ سرا ادا نہیں کر سکتے۔[93]

شاہجہان کے ذوق موسیقی کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ لال قلعہ کے نوبت خانہ میں گوئیے موجود رہتے تھے جو دن کے پہر دل کو راگوں اور راگنیوں کے ذریعے بتایا کرتے تھے۔ شاہجہان کے عہد حکومت میں شادی بیاہ کی تقریبات اور درباری جشن بڑے تزک و احتشام سے منعقد ہوتے تھے۔ بادشاہ کی تخت نشینی کی سالگرہ، جشن نوروز، جشن وزن قمری جشن وزن شمسی کے موقعوں پر جو تقریبات منعقد ہوا کرتی تھیں ان میں موسیقی کے پروگرام خصوصیت کے ساتھ پیش کیے جاتے تھے۔

---

[91] عبدالحمید لاہوری، بادشاہ نامہ، جلد دوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۷ء، ص ۷۔

[92] محمد امین قزوینی، بادشاہنامہ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۷۳، ورق ۳۳ ب

[93] بادشاہنامہ، جلد ۲، ص ۶۔

Marfat.com

محمد صالح کنبوہ ۱۰۴۲ھ کے واقعات کے ضمن میں رقمطراز ہے کہ جب شہزادہ دارا شکوہ کا عقد شہزادہ پرویز کی بیٹی نادرہ بیگم سے ہوا تو اس موقع پر "مطربانِ ہفت کشور" موجود تھے اور انھوں نے اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کیا[94] اس جشن کی تفصیل ذرا قزوینی کی زبانی سنئے۔

جشنے عظیم بود و آواز خوش و آہنگ دلکش مطربان و خنیاگران ہوش از سرِ ناہید می ربود[95]	یہ بڑا عظیم جشن تھا۔ سازندوں اور گویوں کی دلکش اور سریلی آواز نے ناہید ستارے کے بھی ہوش اُڑا دیے تھے۔

دارا شکوہ کے عقد کے چند روز بعد ہی شہزادہ شجاع کی شادی رستم میرزا صفوی کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تو اس موقعہ پر آتشبازی کا بہترین مظاہرہ ہوا اور مشہور و معروف گویوں نے موسیقی کا رنگارنگ پروگرام پیش کیا۔[96] لطف کی بات یہ ہے کہ جب ۱۰۴۶ھ میں شاہجہان نے اپنے دلی صفت بیٹے اورنگ زیبؒ کا عقد شاہنواز خان کی بیٹی دلرس بانو سے کیا تو اس تقریب پر موسیقاروں نے موسیقی کا ایسا عمدہ پروگرام پیش کیا کہ بقول عبدالحمید لاہوری آسمان والوں نے کئی روز تک زمین سے سوائے نغمات کے اور کوئی آواز نہیں سنی۔[97]

---

[94] شاہجہان نامہ، جلد اوّل، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۴۰۶۔

[95] پادشاہ نامہ، ورق ۲۶۴ الف [96] شاہجہان نامہ، جلد دوم، ص ۴۱۴

[97] پادشاہنامہ، جلد دوم، ص ۲۶۸ ؛ از نغمہ و ساز مطربان سحر پرداز عیش و طرب را روز بازاری و سرور و انبساط را سر دکاری دیگر شد، بگوش آسمانیان جز صدای کامرانی نمی رسید و سامعۂ زمینیان جز آوای شادمانی نمی شنید۔"

۱۶۲۴ء میں جب شہزادی جہاں آرا نے غسل صحت کیا تو اس خوشی میں ایک شاہانہ جشن منایا گیا جس پر بلا مبالغہ لاکھوں روپیہ صرف ہوا، اس موقعہ پہ تمام شعراء اور موسیقاروں کو خلعت عطا کئے گئے اور نقد انعام سے بھی نوازا گیا۔ عبدالحمید لاہوری نے خصوصیت کے ساتھ لعل خان کلاونت اور اس کے بیٹوں کا ذکر کیا ہے جنہیں دو ہزار روپے مرحمت ہوئے تھے۔[۹۸]

شاہجہان کے عہد میں دکن، کرناٹک، تلونڈی اور گوالیار موسیقی کے بڑے مرکز تسلیم کئے جاتے تھے، اکبر کے دربار کے اکثر و بیشتر گویئے گوالیار سے ہی آئے تھے، شاہجہان کے درباری گویوں کی اکثریت بھی گوالیار ہی کی رہنے والی تھی۔ اودھ میں بلگرام موسیقی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بلگرام کے باشندے اپنی فہم و فراست میں مشہور اور موسیقی کے دلدادہ ہیں۔[۹۹] مشرقی پنجاب میں تلونڈی موسیقی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور اس قصبہ کی خاک سے بڑے بڑے ماہرین فن پیدا ہوئے جنہوں نے موسیقی کی نوک پلک سنوارنے اور اسے عروج پہ پہنچانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ رحیم داد خان جس نے جہانگیر کے حکم سے شہزادوں کو موسیقی کے زیر و بم سے متعارف کروایا تھا، تلونڈی ہی کا رہنے والا تھا۔[۱۰۰]

---

[۹۸] ایضاً، ص ۴۰۰

[۹۹] آئین اکبری، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۳ء، ص ۴۳۲

[۱۰۰] آغا صادق، ماہنامہ قند مردان، موسیقی نمبر مئی جون ۱۹۳۶ء، ص ۶۱

Marfat.com

سیف خان رقمطراز ہے کہ شاہجہان کی تخت نشینی کے بعد ہی قلمرو موسیقی کی تخت گاہ گوالیار سے بہت سے فن کار شاہی دربار میں چلے آئے اور ان میں سے اکثر فنکار موسیقی کی جدید دھنوں اور گوالیار کی نئی بندشوں اور ترکیبوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس طرح مغلوں کے دربار میں ایرانی موسیقی کے ساتھ ہندوستانی موسیقی بھی جگہ حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گئی۔ اکبر کے زمانہ اقتدار میں ہی ہندوستانی موسیقی کو کافی اونچا مقام مل گیا تھا۔ ہندی اور ایرانی موسیقی کے اختلاط سے ایک نیا فن پیدا ہو رہا تھا جس میں ایرانی ترکیبوں اور ہندوستانی بندشوں نے مل کر دلکشی پیدا کر دی تھی۔ شاہجہان نے کشمیری دھنیں بھی اس میں شامل کر کے ایک نیا مکتب موسیقی قائم کیا۔[۱۰۱]

الناس علیٰ دین ملوکھم کے مصداق شاہجہان کی دیکھا دیکھی اس کے درباری امراء بھی موسیقی میں دلچسپی لینے لگے۔ صاحبِ مآثر الامراء، شاہنواز خان صفوی کے متعلق لکھتا ہے :-

ہم دلی دادۂ راگ و نغمہ، خواندہ و سازندہ، کہ نزد او فراہم آمدہ بودند در ہیچ سرکارے در آنوقت نبود۔[۱۰۲]

وہ راگ و نغمہ کا دلدادہ تھا، اور جتنے گویئے اور سازندے اس نے اپنے ہاں جمع کئے تھے، اتنے اس زمانے میں کسی دوسرے کے پاس نہ تھے۔

اسی تذکرہ نویس نے شاہجہان کے ایک درباری امیر حسام الدین خان

---

[۱۰۱] محمد اسلم، شاہجہان کا ذوق موسیقی، امروز سنڈے ایڈیشن ۹ مارچ ۱۹۶۸ء، ص ۷۔

[۱۰۲] شاہنواز خان، مآثر الامراء، جلد دوم مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۰ء، ص ۶۷۵۔

Marfat.com

کے سوانح حیات مرتب کرتے وقت اس بات کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

در فنِ موسیقی بسیار ماہر، خوش محاورہ، بدیہہ گوئی سخندان بود۔ [۱۰۳]

وہ فنِ موسیقی میں مہارت رکھنے کے علاوہ اپنی خوش کلامی اور حاضر جوابی کے لئے بھی مشہور تھے۔

یہی تذکرہ نگار زین خان کوکہ کے فرزند مغل خان کے متعلق لکھتا ہے۔

شکار دوست بود و بنغمہ و سرود شیفتگی داشت، سازندہ و نوازندہ بسیار فراہم آورد۔ [۱۰۴]

وہ شکار کے علاوہ نغمہ و سرود کا بھی بڑا دلدادہ تھا اور اس نے بہت سے گویے اور سازندے جمع کر لئے تھے۔

بدھ سنگھ ہاڈہ راجہ بوندی کا فرزند شاہزادہ مکرم و معظم کا مصاحب تھا اور وہ کابل میں رہتا تھا۔ اس کے متعلق شاہ نواز خان رقمطراز ہے۔

در اقسامِ نغمہ قدرت تمام داشت [۱۰۵]

وہ نغمہ کی مختلف اقسام پر کامل دسترس رکھتا تھا۔

شاہجہان کے درباری امراء میں ذوالقرنین فرنگی بھی اپنے ذوقِ موسیقی کی وجہ سے بڑا مشہور تھا، اس کا ذکر اس مضمون میں جہانگیر کے عہد میں ہو چکا ہے۔

راجہ روزافزوں کا بیٹا عیدے سنگھ بھی موسیقی کا بڑا ماہر تسلیم کیا جاتا تھا۔

---

[۱۰۳] ایضاً، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۸ء، ص ۵۸۶

[۱۰۴] ایضاً، جلد سوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۱ء، ص ۴۹۲

[۱۰۵] مرآت آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۲۹۶ ب

Marfat.com

شاہجہان نے اُسے دولت افزوں کا خطاب عطا کیا تھا۔ اساتذۂ موسیقی کا یہ کہنا ہے کہ وہ امیر خسروؒ اور سلطان حسین شرقی کے علم و فن میں بڑی دسترس رکھتا اور خیال و ترانہ خوب گاتا تھا[۱۰۶]

شاہجہان کے درباری اُمراء میں سیف خان بلاشبہ سب سے بڑا موسیقی دان تھا اور اُس نے اس فن پر۔ راگ درپن۔ کے نام سے ایک قابلِ قدر کتاب بھی تالیف کی ہے۔ یہ کتاب بدقسمتی سے ابھی تک زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی تاہم اس کے مخطوطے پنجاب یونیورسٹی لائبریری، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد اور انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہیں اور ان میں سے اوّل الذکر تینوں مخطوطے راقم السطور کی نظر سے گذر چکے ہیں۔ یہ وہی سیف خان ہے جس کے متعلق ناصر علی سرہندی نے کہا تھا۔

گفتگوئے طوطی از آئینہ می خیزد علے
گر نباشد سیف خان یار النفس در کار نیست[۱۰۷]

اسی سیف خان کے متعلق شاہنواز خان لکھتا ہے۔

ہمواره در حضور پادشاہی دولت بار می افروخت و بدوام روشناسی خود را در خور نوازش می ساخت[۱۰۸]

وہ ہر وقت بادشاہ کے حضور میں رہتا تھا اور اسی حضور دوام کی وجہ سے انعام و اکرام سے سرفراز ہوتا رہتا تھا۔

۱۰۶؎ محمد اکرم امام خان، معدن موسیقی، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۲۵ء، ص ۲۸۔
سیف خان نے اس کا نام عدیل سنگھ لکھا ہے جو صحیح معلوم ہوتا ہے (راگ درپن ورق ۴۷ب)

۱۰۷؎ دیوان ناصر علی سرہندی، مطبوعہ نظامی پریس دہلی ۱۲۹۲ھ، ص ۲۲۔

۱۰۸؎ مآثر الامراء، جلد ۲، ص ۲۸۰

Marfat.com

ایک دوسرے موقع پر شاہ نواز خان نے اس کے کمالِ فن کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :۔

در فن راگ و نغمہ بسیار ماہر بود۔[۱۰۹]	وہ راگ و نغمہ کے فن میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔

اس کی تالیف ۔راگ درپن ۔ بذاتِ خود سیف خان کے ماہرِ موسیقی ہونے پر دال ہے ۔

شاہی دربار کے علاوہ صوفیائے کرام کی خانقاہیں بھی اس دور میں موسیقی کا گہوارہ بن گئی تھیں ۔عہدِ شاہجہان میں قادریہ سلسلہ کی ترویج کے ساتھ سماع کو بھی فروغ ہوا اور اس سلسلہ کے بزرگوں نے دل کھول کر گویوں کی سرپرستی کی۔ قادری بزرگوں کے علاوہ شطاریہ سلسلہ کے درویشوں نے بھی موسیقی کی ترویج و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اس جگہ ایک شطاری بزرگ شیخ پیر کا ذکر بیجا نہ ہوگا جو عہدِ شاہجہان میں میرٹھ میں رہتے تھے ۔انہیں قدرت نے ذوقِ موسیقی ودیعت کیا تھا۔ اور ان کی خانقاہ میں ہر وقت شعر و نغمہ کی محفل جمی رہتی تھی۔ شاید اسی سبب سے ان کے ہم عصر انہیں ۔ سبب رونقِ ارباب غنا ۔ کہتے تھے ۔طبقاتِ شاہجہانی[۱۱۰] کا مؤلف ان کے متعلق رقمطراز ہے ۔

بوجد و سماع میلانِ خاطر عظیم داشت و نقشہائے ہندی می بست و غرسہائے بزرگان خود می کردہ و مجلس ہا عالی برپا	وجد و سماع کی طرف ان کا میلان بہت زیادہ تھا اور وہ خود بھی ہندی راگ ترتیب دیا کرتے تھے ۔ وہ اپنے بزرگوں کے

۱۰۹ه ایضاً، ص ۴۸۴

۱۱۰ه محمد صادق، طبقات شاہجہانی ،مخطوطہ برٹش میوزیم لندن ،اورینٹل ۱۶۷۳، ورق ۳۱۲ب

مؤذ ونقشہائے وی تاثیر عجب
دارد ۱۱۱؎

عرس مناتے اور اس موقع پر بڑی بڑی مجالس منعقد کرتے تھے۔ ان کے مرتب کردہ راگوں میں ایک عجیب اثر ہوتا تھا۔

شیخ پیر میرٹھی کے انتقال پر محمد صادق نے یہ تاریخ کہی تھی ۱۱۲؎

گفت تاریخ وفاتش خرد دور اندیش
دہ کہ از مردانِ وی بی سر و پا شد نغمہ

اگر نغمہ کے سر اور پاؤں یعنی "ن" اور "ہ" حذف کر دیے جائیں تو "غم" باقی رہ جاتا ہے اور حروفِ ابجد کے حساب سے اس کے عدد ۱۰۴۰ ہوتے ہیں اور یہی ان کا سالِ وفات ہے۔

راگ درپن میں سیف خان نے عہدِ شاہجہان کے جن ۳۳ موسیقاروں کا ذکر کیا ہے ان میں صوفی بہاؤالدین سرِفہرست ہیں۔ آپ جھنجھانہ کے ایک قریہ گاؤں برناوہ کے رہنے والے تھے لیکن سیر و سیاحت کا شوق انہیں اوائل عمر میں ہی دکن لے گیا۔ وہاں آپ نے ۲۵ سال درویشوں کی خدمت میں گزارے اور ان کی صحبت میں رہتے ہوئے خود بھی درویش کامل بن گئے۔ آپ ہمیشہ سبز رنگ کا لباس زیب تن کرتے تھے۔ سیف خان رقمطراز ہے کہ دکن میں رہتے ہوئے آپ نے سنگیت میں کمال حاصل کیا۔ شاہجہان کے دور میں اس فن میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ آپ ترانہ اور خیال بہت اچھا گاتے تھے اور رباب اور بین امرتی بجانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔

۱۱۱؎ ایضاً۔

۱۱۲؎ ایضاً، ورق ۳۱۳ الف۔

Marfat.com

آپ نے — خیال — نامی ایک ساز بھی ایجاد کیا تھا۔ پچاس سال کی عمر میں آپ دکن سے واپس لوٹے اور بقیہ عمر اپنے آبائی وطن میں فقر و تجرد میں گذار دی۔ سیف خان کی روایت کے مطابق آپ نے ۱۱۷ سال کی عمر پائی[۱۱۳]

شیخ شیر محمد بھی اس دور میں ایک نامور موسیقار اور صاحبِ دل درویش ہوئے ہیں۔ ان کی تربیت صوفی بہاالدین اور شیخ نصیرالدین نے کی تھی۔ شیخ نصیرالدین کی دعا سے انہوں نے نغمہ و سرود میں خوب ترقی کی اور سلطان حسین شرقی کی طرز کو مقبول بنانے میں پوری تندہی سے مصروف رہے۔ سیف خاں نے انہیں سنا تھا اور اس کے خیال میں وہ "خیال" خوب گاتے تھے اور اس پہ طرہ یہ کہ ان کے گانے میں درد ہوتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ درویشوں کی مجالس میں بڑے مقبول تھے۔ وہ خیال کے علاوہ ترانہ اور تلکانہ بھی گا لیتے تھے۔ ع

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

انہوں نے پٹنہ میں بمرض استسقا وفات پائی اور اس وقت ان کی عمر پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان تھی[۱۱۴]۔ عنایت خان راسخ شیخ شیر محمد کو اکبرآباد کے رہنے والے بتاتا ہے اور اس کے خیال میں وہ نوالی کے بھی بڑے ماہر تھے اور گاہ گاہے شاہجہان کے حضور میں اس فن کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے[۱۱۵]

---

۱۱۳ سیف خان، راگ درپن، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، نمبر ۴۱ علوم فارسیہ، ورق ب ۴۲ الف، ۴۳

۱۱۴ ایضاً، ورق ۴۳ الف، ب ۴۳ - ۴۴ الف

۱۱۵ عنایت خان راسخ، رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۱ء، ص ۳۶۔

Marfat.com

میاں ڈالو ڈاڈھی[۱۱۶] شیخ شیر محمد کے ہم قوم اور اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے وہ درویشانہ وضع رکھتے تھے اس لئے اہلِ دولت سے ملنا جلنا انہیں ناپسند تھا۔ سیف خان نے ان کا راگ سن کر یہ کہا تھا۔

در دہرپد خواندن ہمچو او دیگری شنیدہ نشد[۱۱۷] — ان جیسا دہرپد اور کوئی گویا نہیں گا سکتا۔

سیف خان جیسے فنکار کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ:۔

دی سبو ہمچو می نواخت کہ مثل او دیگری نسشدہ و در ہیچ عصری نشنیدہ[۱۱۸] — وہ گھڑا بجانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے اور کسی دور میں بھی ان جیسا فنکار سننے میں نہیں آیا۔

میاں ڈالو نے اکبر آباد میں ذات الجنب کے مرض سے وفات پائی۔ ان کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوئی۔

شیخ شیر محمد کا بھائی بوجا بھی اچھا گویا تھا وہ بعارضہ بھگندر اکبر آباد میں فوت ہوا۔ وفات کے وقت اس کی عمر پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان تھی[۱۱۹]

شیخ شیر محمد کا پوتا معین الدین بھی اپنے آبائی فن میں کامل دسترس رکھتا تھا۔ شاہنواز خان کا بیان ہے کہ وہ خیال بہت ہی اچھا گاتا تھا[۱۲۰] عنایت خان راسخ نے اُسے — رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان — کی تدوین کے وقت احمد شاہ کے پانچویں سال جلوس میں دیکھا تھا، اس وقت وہ کافی معمر ہو چکا تھا۔

---

[۱۱۶] ابوالفضل لکھتا ہے کہ ڈاڈھی پنجابی گو یوں کو کہتے ہیں اور وہ ڈہڈہ اور کنگرہ بجا کر گاتے ہیں:۔ آئین اکبری، جلد ۲، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۷ء، ص ۱۴۲

[۱۱۷] راگ درپن، ورق ۴۴ ب

[۱۱۸] ایضاً

[۱۱۹] ایضاً، ورق ۴۷ الف

[۱۲۰] مرأت آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۲۹۷ الف

Marfat.com

اس کا یہ کہنا ہے کہ اپنے زمانے میں وہ قوالی اور ترانہ گانے اپنی مثال آپ تھا۔[۱۲۱]

میاں ڈالو ڈاڈھی کا شاگردِ رشید شیخ کمال بھی بڑا اچھا گویّا تھا۔ سیف خان کے ساتھ اس کی اکثر صحبت رہتی تھی۔ ۱۰۷۶ھ میں راگ درپن کی تصنیف کے وقت شیخ کمال لقیدِ حیات تھا لیکن نغمہ و سرود سے کنارہ کش ہو کر فوج میں بھرتی ہو چکا تھا۔[۱۲۲]

کبیر قوال شیخ شیر محمد کا شاگرد تھا اور قوالی کے فن میں اپنے اُستاد سے بھی گوئے سبقت لے گیا تھا۔ اس نے قوالی کی ایک نئی طرز وضع کی تھی۔ شاہی دربار میں بھی اُسے بڑی عزت کا مقام حاصل تھا۔[۱۲۳] راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ زندہ تھا اور سیف خان کو اکثر راگ اور قوالی سے محظوظ کرتا رہتا تھا۔[۱۲۴]

باقیائی نائی بڑی اچھی طبیعت کا مالک تھا۔ اور اس نے ہندوستانی اور ایرانی نغموں کو ملا کر ایک نئی طرز نکالی تھی۔ ماہرینِ فن کا یہ کہنا ہے کہ باقیائی نائی کے راگ میں بڑی تاثیر تھی۔ ایک موقع پر اس نے شاہجہان کی مدح میں قصیدہ پڑھا جس کے صلہ میں اُسے اپنے وزن کے برابر پانچ ہزار روپے ملے۔[۱۲۵] سیف خان نے روڑا قوال کے فن کی بھی تعریف کی ہے

---

[۱۲۱] رسالہ ذکرِ مغنیان ہندوستان، ص ۳۶

[۱۲۲] راگ درپن، ورق ۴۵ ب

[۱۲۳] رسالہ ذکرِ مغنیان ہندوستان، ص ۳۶،

[۱۲۴] راگ درپن، ورق ۴۷ الف

[۱۲۵] برہان الدین، شاہجہان نامہ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری آف کلکشن نمبر ۷۶۲، ورق ۱۰۶۳ ب۔

Marfat.com

وہ بھی شاہجہان کے حضور میں قوالی پیش کیا کرتا تھا۔[۱۲۶] شاہجہان کے عہد میں شیخ نثیر محمد، کبیر، روڑا اور میر صالح بڑے اونچے پایہ کے قوال تھے اور اس فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت درویشوں کی خانقاہوں میں ہی گذرتا تھا، بلکہ حق تو یہ ہے کہ انہیں کے دم قدم سے کئی خانقاہوں کی رونق قائم تھی۔ پیشہ ور گویوں میں سے جہانگیر کا درباری طنبورہ نواز شوقی ہنوز زندہ تھا۔ وہ ہندی اور ایرانی راگ سے کماحقہٗ واقف تھا۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں اور سیف خان نے راگ درپن میں اس کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے۔[۱۲۷]

جگن ناتھ کلاونت شاہجہان کا درباری گویا تھا اور دھرپد گانے میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ سیف خان کا کہنا ہے کہ تان سین کے بعد اس جیسا گویا سرزمینِ ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ جب تان سین نے جگن ناتھ کو گاتے ہوئے دیکھا تو بلبیاختہ کہا کہ اس کے بعد وہ اس فن پر کام کرے گا۔[۱۲۸] قزوینی ساتویں سالِ جلوس کے واقعات کے ضمن میں اس کے متعلق لکھتا ہے:-

جگنات کلاونت کہ بخطاب مہاکب رائے نامور است و در ساختن تصنیف ہندی	جگن ناتھ کلاونت، جو مہاکب رائے کے لقب سے مشہور ہے، بلند پایہ اور معنی خیز

---

۱۲۶ راگ درپن، ورق ۴۷ الف

۱۲۷ i۔ تزک جہانگیری، سرسید ایڈیشن، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۱۸۶۔
ii۔ راگ درپن، ورق ۴۹ ب

۱۲۸ ایضاً، ورق ۴۵ الف۔

Marfat.com

و پیدا کردن مذاق بلند و مضامین عالی
همواره نظیر ندارد و بیندگان حیرت او
را واسطه بستن تصانیف که به نشان
آنرا درپت گویند در دار السلطنت
لاہور گذاشته بودند سعادت
اندوز ملازمت گشته دوازده تصانیف
که بنام همایون آنحضرت بمضامین
تازه در نغمات مختلف ساخته بود
بحضور اشرف خواند و پسند خاطر
مشکل پسند بادشاه دانش ور نکته
دان افتاد و بر حسب اشاره علیه
اورا بزر وزن کرده چهار هزار و
پانصد روپیه که هم سنگ او بر
آمد باو مرحمت فرمودند [۱۳]

ہندی راگ تصنیف کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ بادشاہ سلامت نے اُسے ہندی راگ جنھیں دھرپد کہتے ہیں تصنیف کرنے کے لیے لاہور میں چھوڑا ہوا تھا۔ حضور میں باریاب ہوا۔ اس نے وہ بارہ راگ جو بادشاہ کے نام پر مرتب کیے تھے حضور میں پیش کیے جو دانشور اور نکتہ ور بادشاہ کی مشکل پسند طبیعت کو پسند آئے۔ بادشاہ کے حکم سے اُسے روپوں کے عوض تولا گیا اور اس کے وزن کے برابر چار ہزار پانچ سو روپے اُسے مرحمت ہوئے۔

عہد شاہجہان کے تمام مؤرخین نے جگن ناتھ کے کمال فن کا بڑی فراخدلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہی "متعصب" شاہجہان ہے جس نے خطۂ بنارس میں ۷۶ مندر مسمار کروا دیے تھے شاہجہان نے جہاں قاضی محمد اسلم ہروی اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی جیسے جید اور مستند علما کو روپوں کے عوض تلوایا تھا وہاں اس نے جگن ناتھ جیسے

۱۳۔ محمد امین قزوینی، بادشاہنامہ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۷۳، ورق ۳۰ ب

ہندو موسیقی دان کی بھی ویسی ہی عزت افزائی کی ہمارے خیال میں جہاں تک علم و فن کا تعلق ہے ہندو اور مسلمان دونوں اس کی نظر میں مساوی تھے۔

مسلمان موسیقاروں میں دربارِ شاہجہان میں لعل خان کلاونت کا بڑا اونچا مرتبہ تھا۔ لعل خان ابھی نو عمر ہی تھا جب وہ تان سین کی خدمت میں اکتسابِ فیض کی غرض سے حاضر ہوا۔ تان سین نے کمال توجہ سے اس کی تربیت شروع کی۔ ابھی یہ نو آموز ہی تھا کہ تان سین کو پیغامِ اجل آ پہنچا۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کے فرزند بلاس خان نے اُسے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ جب وہ اس فن میں خوب طاق ہو گیا تو بلاس خان نے اپنی بیٹی اس کے حبالۂ نکاح میں دے دی۔ سیف خان نے اُسے اپنے وقت کا سب سے بڑا دھرپد راگی لکھا ہے [۱۳۰] عبد الحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ سے بھی سیف خان کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ [۱۳۱]

شاہجہان کے دربار میں اس کا بڑا عالی رتبہ تھا اور وہ تان سین کی جگہ پر کھڑا ہو کر اپنا راگ پیش کیا کرتا تھا۔ شاہجہان کو چونکہ دھرپد راگ بے حد مرغوب تھا اس لیے وہ لعل خان کی بڑی قدر کیا کرتا تھا اور ہر جشن کے موقع پر اُسے انعام و اکرام سے لاد دیا کرتا تھا۔ عبد الحمید لاہوری کی روایت کے مطابق ایک بار بادشاہ نے اس کا راگ سن کر اُسے گن سمندر کا خطاب اور ایک ہاتھی بطور انعام دیا تھا۔ [۱۳۲]

۱۳۰؎ راگ درپن، ورق ۴۴ ب

۱۳۱؎ بادشاہنامہ، جلد ۲، ص ۵ ــ "در عہد سعادت مہد سرآمد نغمہ سرایان ہندوستانی زبان است و در خواندن دھرپد ہمای او بروش او عدیل ندارد"

۱۳۲؎ ایضاً، ص ۳۱۱

لعل خان نے سنہ ۱۰۶۲ھ میں بعارضہ فالج انتقال کیا، بقول سیف خان وفات کے وقت اس کی عمر اسّی برس کے لگ بھگ تھی۔

لعل خان کے بیٹے خوشحال خان اور بسرام خان بھی شاہی دربار میں ملازم تھے۔ ان میں سے اوّل الذکر کا راگ شاہجہان کو بہت پسند تھا۔ لعل خان کے مرنے کے بعد اس کا منصب خوشحال خان کو ملا اور اُسے بھی تان سین کے مقام پر کھڑے ہو کر گانا پیش کرنے کا شرف حاصل تھا۔[۱۳۳]

عنایت خان راسخ اور شاہنواز خان نے خوشحال خان کے متعلق ایک بڑا ہی دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مرشد قلی خان دربار سے رخصت چاہتے تھے۔ لیکن شاہجہان کسی طرح بھی اُسے رخصت دینے پر آمادہ نہ تھا۔ مرشد قلی خان نے امیرالامراء کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ کسی خاص موقع پر اس کی درخواست شاہجہان کے حضور میں پیش کر دے گا۔ کئی روز تک یہ دونوں بادشاہ کا موڈ دیکھتے رہے۔ لیکن شاہجہان کا موڈ ہی درست ہونے میں نہ آتا تھا۔ بالآخر ان دونوں نے خوشحال خان کو ایک بڑی رقم کا لالچ دے کر بادشاہ کے حضور میں ایک سحر آفرین راگ پیش کرنے پر آمادہ کر لیا۔ خوشحال خان نے تان سین کے مقام پر کھڑے ہو کر راگ چھیڑا اور جب شاہجہان راگ سننے میں ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا، امیرالامراء نے مرشد قلی خان کی عرضی بادشاہ کے حضور میں پیش کر کے اس پر بادشاہ کے دستخط کروا لئے۔ جب بادشاہ

---

[۱۳۳] عنایت خان راسخ، رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان، مطبوعہ پٹنہ سنہ ۱۹۶۱ء، ص ۴۵

Marfat.com

ہوش میں آیا اور اُسے حقیقت حال معلوم ہوئی تو اس نے خوشحال خان کو تان سین کے مقام پہ کھڑا ہونے سے منع کر دیا۔[۱۳۴]

جگن ناتھ، لعل خان، خوشحال خان اور بسرام خان کا ذکر کرتے ہوئے عہدِ شاہجہان کے مؤرخوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ گوئیے تان سین کے بالواسطہ یا بلا واسطہ شاگرد تھے اور تان سین کی طرز میں خوب گاتے تھے۔ محمد امین قزوینی اور عبدالحمید لاہوری، دونوں عہد شاہجہان کے نامور مؤرخ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شاہجہان کے عہد میں بھی تان سین کی طرز خواص و عوام میں بہت مقبول تھی۔ قزوینی کے الفاظ ہیں۔

بالفعل طرز تان سین درمیان مردم متداول است چون مدتہا در خدمت حضرت عرش آشیانی بوده طرز و روش و تصانیف او شیوع تمام یافته و اکثر کلاونتان این عصر دھرپت ہائی او را می خوانند و بر روش تصنیف می سازند۔[۱۳۵]

ان دنوں تان سین کی طرز عوام میں کافی مقبول ہے۔ وہ چونکہ مدت دراز تک اکبر کی خدمت میں رہا تھا اس لیے اس کی طرز، روش اور تصانیف نے خوب رواج پایا۔ اس زمانے کے اکثر کلاونت اس کے مرتب کردہ دھرپد گاتے ہیں یا پھر اس کی لے میں خود مرتب کرتے ہیں۔

گن خان کلاونت بھی شاہجہان کا درباری گویا تھا اور بقول سیف خان وہ علم راگ میں استاد تھا۔ شہزادہ شجاع کو اس کا راگ بے حد مرغوب تھا،

۱۳۴۔ ایضاً، ص ۴۶، ۴۵، ۱۱۔ مرأت آفتاب نما، ورق ۲۹۵ ب

۱۳۵۔ پادشاہنامہ، ورق ۳۳۰، ۳۳۱ الف

Marfat.com

اس لئے اُس نے اُسے شاہجہان سے مانگ لیا تھا۔ گُن خاں کی بقیہ عمر بنگال میں شہزادہ کی خدمت میں گزری اور وہیں اس کا انتقال ہوا[۱۳۶]۔ شہزادہ شجاع کا ایک اور مصاحب مصری خان، جو پنجاب کا رہنے والا اور بلاس خان کا شاگرد تھا، اپنے وقت کا بہترین گویا تھا۔ ۱۰۷۶ھ میں راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ ہنوز زندہ تھا اور اس کی عمر اسی سال سے متجاوز تھی[۱۳۷]۔

ہندو گویوں میں سے اکبر کا ایک ہم عصر گویا جمہر سین شاہجہان کے عہد میں تقریباً اسی سال کی عمر میں فوت ہوا تھا۔ سیف خان نے اس کا شمار کلاونتوں کے زمرہ میں کیا ہے۔ اس کا بیٹا سُبل سین عہدِ شاہجہان کے گنے چنے موسیقاروں میں شمار ہوتا ہے۔ بقول سیف خان چالیس برس کی عمر میں اُس کے تمام دانت نکل گئے تھے اور چند سال بعد عقل بھی جاتی رہی تھی۔ شاہجہان کے عہدِ حکومت میں ہی پچاس سال کی عمر میں وہ رام جی کو پیارا ہوا[۱۳۸]۔

ایشوری پرشاد کی روایت کے مطابق جنار دھن بیکانیری بھی بڑا اچھا گویا تھا اور وہ گاہ گاہے شاہجہان کے حضور میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتا رہتا تھا[۱۳۹]۔

---

۱۳۶ راگ درپن، ورق ۴۶ ب

۱۳۷ ایضاً، ورق ۴۵ الف

۱۳۸ ایضاً، ورق ۴۸ الف ۱۳۹ اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا، مطبوعہ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء، ص ۶۶۷۔

Marfat.com

تلسی رام اور دہرم داس نام کے دو گویئے، جن کا شمار سیف خان نے کلاونتوں کے زمرہ میں کیا ہے، شاہجہان کے دربار میں ملازم تھے۔ یہ دونوں دین و دھرم سے بیگانہ یا با لفاظ دگر "زندگی برائے فن" کے قائل تھے۔ اول الذکر نے شاہجہان کے عہد میں ہی انتقال کیا لیکن مؤخر الذکر راگ درپن کی تالیف کے وقت زندہ تھا۔ سیف خان لکھتا ہے کہ اب وہ ضعیف ہو چکا ہے اور اس کی آواز بھی خراب ہو گئی ہے۔[۱۴۰]

ان ہندو گویوں میں راقم الحروف کا ہم وطن کب جوت پھلوری بھی بڑا نامور فن کار تھا۔ سیف خان نے بھی اس کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے۔ اس نے اسّی اور نوّے برس کے درمیان عمر پائی اور اپنے وطن مالوف میں ہی فوت ہوا۔[۱۴۱] شاہجہان کے عہد میں سُندر گھن نامی ایک موسیقار کی بڑی شہرت تھی۔ شاہجہان نے اُسے اپنے درباری گویوں میں شامل کر لیا تھا۔ تلسی رام اور دہرم داس کی طرح وہ بھی مذہب سے بیگانہ تھا۔[۱۴۲]

سور داس نکھاد جی بھی اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ سیف خان لکھتا ہے کہ اس نے اکبر کا عہد دیکھا ہوا تھا اور وہ تان سین کے ساتھیوں

---

[۱۴۰] راگ درپن، ورق ۴۷ الف، ب۔ [۱۴۱] ایضاً، ورق ب۴۷

[۱۴۲] ایضاً۔ ورق ب۴۸ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سندر گھن اس کا لقب تھا، کیونکہ گھُن ایک ساز کا نام ہے وہ گھن بجانے میں ماہر تھا اس لئے اس نے سندر گھن کا لقب پایا۔ اس کا اصل نام معلوم نہیں ہو سکا۔ سیف خان نے بھی اس کا ذکر اسی لقب کے تحت کیا ہے۔

Marfat.com

ہیں سے تھا۔ جب تان سین گاتا تو بہ اس کے سامنے پکھاوج بجایا کرتا تھا۔ آخر عمر میں وہ گانے بجانے سے معذور ہو گیا تھا۔ سیف خان نے اُسے دیکھا ہوا تھا اور بقول اُس کے اُس نے سو سال کے قریب عمر پائی۔[۱۴۳]

کرپائی نامی ایک درباری گویا بھی اسی - از دین بیگانہ - گروہ سے تعلق رکھتا تھا، اور بقول سیف خان وہ بادشاہ کا منظورِ نظر تھا۔ شاہجہان نے اس سے مردنگ سن کر اُسے مردنگ رائے کے خطاب سے نوازا تھا۔ سیف خان لکھتا ہے کہ مردنگ بجانے میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا۔[۱۴۴]

تارا چند کلاونت شوقی طنبورہ نواز کا شاگرد تھا لیکن اس نے زیادہ عمر نہیں پائی، اس لئے وہ زیادہ نام نہیں پا سکا۔ سیف خان نے اس کا ذکر عہدِ شاہجہان کے گنے چُنے فنکاروں میں کیا ہے۔[۱۴۵] ہندو گویوں میں سے سالم چند ڈاگر بھی اچھا گویا تھا اس کا شمار بھی شاہجہان کے درباری گویوں میں ہوتا ہے۔[۱۴۶]

رس بین کا شمار بھی شاہجہان کے منظورِ نظر گویوں میں ہوتا ہے۔ اس کا باپ بھی بڑا اچھا گویا تھا اور وہ جہانگیر کی خدمت میں رہا کرتا تھا۔ رس بین راقم السطور کو اس کا لقب معلوم ہوتا ہے، سیف خان نے اس کا نام نہیں لکھا حالانکہ وہ گاہ گاہے رس بین سے راگ سنتا رہتا تھا۔[۱۴۷]

---

[۱۴۳] ایضاً، ورق ۴۹ ب
[۱۴۴] ایضاً، ورق ۴۹ الف
[۱۴۵] ایضاً، ورق ۴۹ ب
[۱۴۶] ایضاً، ورق ۴۶ ب
[۱۴۷] ایضاً، ورق ۴۸ ب

مسلمان گویوں میں بابزید بڑا اچھا فن کار تھا اور رباب بجانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ نوجوانی کے عالم میں اُسے شراب کی لت پڑ گئی اس لئے جلد ہی مر گیا۔ اس کا ایک ہندو شاگرد دُسکھ سین کلاونت بھی رباب بجانے میں ماہر تھا۔ سیف خان نے اس کا ذکر عہدِ شاہجہان کے ممتاز فن کاروں میں کیا ہے۔[۱۴۸]

البنوری پرشاد کی روایت کے مطابق شاہجہان کا درباری مؤرخ محمد صالح کنبوہ اور اس کا بھائی ہندی راگ میں کامل دسترس رکھتے تھے۔[۱۴۹] مسلمان فن کاروں میں فیروز ڈاڈھی پکھاوج بجانے میں، الہداد ڈاڈھی ساکن اُڑمڑ ٹانڈہ سارنگی بجانے میں، الوالوفا طنبورہ بجانے میں طاہر ڈاڈھی دُف بجانے میں اور صالح رباب بجانے میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔[۱۵۰] ان میں سے موخر الذکر سیف خان کی سرکار میں ملازم تھا۔ عہدِ شاہجہان میں محمد نامی ایک فنکار بین بجانے میں ملک کے طول و عرض میں مشہور تھا۔ بادشاہ نے ازرہِ قدردانی اُسے ـــ رس بین ـــ کا خطاب دیا تھا۔[۱۵۱]

غلام محی الدین نامی ایک موسیقار فوج میں ملازم تھا۔ آخر عمر میں اس نے فوج کی ملازمت ترک کر کے درویشی اختیار کر لی تھی۔ سیف خان نے اس کے مرتب کردہ راگوں کی بڑی تعریف کی ہے۔

---

۱۴۸ ایضاً ۱۴۹ اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا۔ مطبوعہ الہ آباد ۱۹۳۰ء، ص ۲۰۶ ۱۵۰ راگ درپن، ورق ۴۹ الف، ۴۹ ب
۱۵۱ ایضاً۔ ورق ۴۹ الف۔

Marfat.com

راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ ابھی بقیدِ حیات تھا۔ سیف خان کا کہنا ہے کہ وہ لوگوں کی پرواہ نہیں کرتا اس لئے لوگ بھی اس سے چنداں متعارف نہیں ہیں۔[152]

شیخ سعد اللہ لاہوری بھی کسی زمانے میں بڑا اچھا گویا سمجھا جاتا تھا لیکن کثرتِ افیون خوری سے اس کا گلا خراب ہو گیا تھا۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت اس کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز تھی اس لئے بوجہ کبرسنی اس کے ذہن میں فتور پیدا ہو گیا تھا۔[153] شیخ موصوف کی طرح محمد باقی مغل بھی کسی زمانے میں اچھے گویوں میں شمار ہوتا تھا لیکن شیخ کی طرح افیون کھانے سے اس کی آواز بھی خراب ہو گئی تھی۔ جب سیف خان راگ درپن لکھنے بیٹھا تو اس وقت اس کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی۔[154]

مسلمان گویوں میں بازید خان لوجھاروی بڑا اچھا فنکار تھا۔ سیف خان نے اس کا ذکر کلاونتوں کے زمرہ میں کیا ہے۔ اس نے زیادہ عمر نہیں پائی تاہم اس کا نام خدمتِ فن کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔[155] ولی ڈاڈھی بھی اپنے دور میں بڑا اچھا موسیقار مانا جاتا تھا۔ بقول سیف خان اس نے اسی سال سے زیادہ عمر پائی اور آگرہ میں فوت ہوا۔[156]

شاہجہان کے درباری گویوں میں رنگ خان کلاونت کا بڑا اونچا

---

١٥٢ ایضاً۔ ١٥٣ ایضاً، ورق ٤٦ ب

١٥٤ ایضاً، ورق ٤٦ ب، ٤٧ الف ١٥٥ ایضاً، ورق ٤٧ الف

١٥٦ ایضاً، ورق ٤٦ ب

Marfat.com

رتبہ تھا۔ سیف خان لکھتا ہے کہ وہ اسم بامسمّٰی اور اپنے فن میں اُستاد تھا اور اس نے اکبر کا عہد دیکھا ہوا تھا۔ وہ شاہجہان کا منظورِ نظر تھا اس لئے شاہی تقریبات کے موقع پہ بادشاہ اُسے انعام واکرام سے نوازتا رہتا تھا۔ اورنگ زیب کی شادی کی تقریب پہ اور ۱۰۴۵ھ میں نوروز کے موقع پہ اس کا نام انعام یافتگان کی فہرست میں موجود ہے۔[۱۵۷] سیف خان لکھتا ہے کہ دربار شاہی کے باہر اس کا زیادہ تر وقت اللہ والوں کے ساتھ گزرا کرتا تھا۔ اس نے اسّی اور نوّے برس کے درمیان عمر پائی۔[۱۵۸]

بلاس خان کے شاگردوں میں لجت خان گجراتی نے بڑا نام پایا تھا۔ سیف خان نے اس کا ذکر کلاونتوں کے زمرہ میں کیا ہے۔ سیف خان لکھتا ہے کہ لوگ اس کے راگ کی بہت تعریف کرتے ہیں لیکن مجھے اس سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ میں نے اس کے ایک شاگرد بسنتی کلاونت کو سنا ہے، وہ خوب گاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ لجت خان کتنا اچھا گوّیا ہوگا۔[۱۵۹]

مسلمان گوّیوں میں نایک بھنّو کا پوتا نایک افضل بھی بڑا اچھا گویا تسلیم کیا جاتا تھا۔ شاہجہان نے اس کے کمالِ فن کا اعتراف کرتے

---

۱۵۷ i۔ محمد صالح کنبوہ، شاہجہان نامہ، جلد دوم، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۱۲۳، ۱۸۶، ۲۱۸

ii۔ عبدالحمید لاہوری، بادشاہنامہ، جلد دوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۲ء، ص ۱۴۲

۱۵۸ راگ درپن، ورق ۴۶ الف

۱۵۹ ایضاً، ورق ۴۵ ب۔

Marfat.com

اُسے گُن سین کا خطاب دیا تھا۔ نایک افضل کا انتقال کشمیر کے سفر کے دوران ہوا اور وفات کے وقت اس کی عمر پچاس سال سے متجاوز تھی۔ سیف خان[۱۶۰] نے راگ درپن میں حسین خان نوہار کا ذکر بھی عہدِ شاہجہان کے ممتاز گویّوں میں کیا ہے۔ اس کی عمر بھی کوئی زیادہ نہیں ہوئی۔[۱۶۱]

عہدِ شاہجہان میں سبحان خان کا شمار بڑے نامی گرامی گویّوں میں ہوتا تھا۔ ان کی طبیعت درویشی کی طرف مائل تھی۔ اس لئے ان کا زیادہ وقت درویشوں کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ آخر عمر میں تو اُنہوں نے دنیا سے بالکل ہی منہ موڑ لیا تھا۔ عنایت خان راسخ اور شاہنواز خان کی روایات کے مطابق وہ آخر عمر میں مدینہ منورہ چلے گئے تھے اور وہیں روضۂ رسولؐ پر نعتیں پڑھا کرتے تھے۔[۱۶۲] ان کا فرزند سیّد خان بھی بڑا اچھا گویّا تھا۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ کافی ضعیف العمر ہو چکا تھا۔ سیف خان کا کہنا ہے کہ وہ امیر خسروؒ کے علم کا ماہر تھا۔ راگ خوب گاتا تھا تاہم دُھرپد بھی بُرا نہیں گاتا۔[۱۶۳]

سید طیّب بڈھ بھی عہدِ شاہجہان کے نامی گرامی گویّوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ آگرہ کا رہنے والا تھا اور "بات" خوب گاتا تھا۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوئی۔[۱۶۴] میر عماد سادات ہرات سے تعلق رکھتا تھا، اس کا شمار بھی شاہجہان کے عہد کے مشاہیر گویوں میں ہوتا ہے۔ راگ درپن کی تصنیف

---

۱۶۰ ایضاً ۱۶۱ ایضاً۔

۱۶۲ ا۔ رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان، ص ۴۶ ۱۱۔ مرأت آفتاب نما، ورق ۲۹۶ ب

۱۶۳ راگ درپن، ورق ۴۸ الف ۱۶۴ ایضاً۔

Marfat.com

کے وقت میر عماد حیات تھا۔ سیف خان نے اس کے راگ کی بڑی تعریف کی ہے۔[۱۶۵] اسی طرح رحیم داد ڈاڈھی کا شمار بھی اس وقت کے اچھے گویوں میں ہوتا تھا۔ سیف خان نے اس کے استادِ کامل ہونے کا اعتراف کیا ہے۔[۱۶۶] ان گویوں کے علاوہ بیانہ کے ایک سورنا نواز کی بھی سیف خان نے بڑی تعریف کی ہے۔ سیف خان راگ درپن کی تصنیف کے وقت اس کا نام بھول چکا تھا، اس لئے اس نے اس کا ذکر ــــ "یک سورنا نواز بیانہ ــــ" کے عنوان کے تحت کیا ہے۔ اسی طرح ایک اور سورنا نواز جو داراشکوہ کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اپنے فن کا استاد مانا جاتا تھا، سیف خان کے ذہن سے اس کا نام بھی محو ہو چکا تھا۔[۱۶۷]

شاہجہان کا عہدِ حکومت ہر لحاظ سے مغلوں کا عہدِ زریں کہلانے کا مستحق ہے۔ فنِ تعمیر، موسیقی، مصوّری، خطاطی اور دوسرے علوم و فنون کو اس عہد میں نمایاں ترقی ہوئی۔ بعض اہلِ معرفت ان سب فنون کو ایک ہی چیز تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں "فنِ تعمیر کا حسن وہی حسن ہے جو شاعری، موسیقی، مصوّری اور سنگ تراشی میں نظر آتا ہے"۔[۱۶۸] جس طرح اقبال کو ہر چیز میں جلوۂ عشق نظر آتا ہے اور وہ بدر و حنین اور معرکۂ کربلا کو بھی عشق ہی کا نام دیتے ہیں اُسی طرح ہمارے فنافی الفن قسم کے فن کاروں کو شاہجہان کے ہر رگ و ریشے اور اس کے ہر قول و فعل سے نغمہ ہی سنائی دیتا ہے۔ ان کے نزدیک جامع مسجد دہلی، لال قلعہ اور تاج محل کی تعمیر کے

---

۱۶۵ ایضاً۔ ۱۶۶ ایضاً، ورق ۴۷ ب ۱۶۷ ایضاً، ورق ۴۹ ب

۱۶۸ پروفیسر محمد مجیب، مضمون "قطب صاحب کی عمارتیں"، مشمولہ "نذرِ عرشی" مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء، ص ۱۰۵

Marfat.com

پیچھے بھی شاہجہان کا ذوقِ موسیقی ہی کارگر نظر آتا ہے۔ پروفیسر محمد مجیب تاج محل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

تاج محل میں معمار کا تصور ان بلندیوں تک پہنچ گیا ہے جہاں عمارت، شعر اور نغمہ مل کر وجد کی کیفیت بن جاتے ہیں [١٦٩]

ہمارے خیال میں یہ فن موسیقی کی CLIMAX (انتہا) ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے تخت نشین ہوتے ہی اپنی مملکت سے غیر اسلامی آثار مٹانے پر کمر باندھی۔ اسی پروگرام کے تحت اس نے اپنے گیارہویں سال جلوس میں تمام موسیقاروں اور سازندوں کو اپنے دربار سے نکال دیا۔ ایک دن یہ اہل فن ایک جھوٹ موٹ کا جنازہ لے کر شاہی محل کے قریب سے آہ و بکا کرتے ہوئے گزرے تو اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اپنے ایک مصاحب سے دریافت کیا کہ یہ کس کا جنازہ ہے؟ اس نے دست بستہ عرض کیا کہ موسیقی کا، اس جواب پر اورنگ زیبؒ ہنس دیا اور اس نے موسیقاروں کو کہلا بھیجا کہ مردود مردہ کو خوب گہرا کر کے دفن کرنا کہ کہیں پھر باہر نہ نکل آئے۔

---

[١٦٩] پروفیسر محمد مجیب، مضمون "فن تعمیر" مشمولہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے، مطبوعہ اعظم گڑھ ١٩٦٣ء، ص ٣٢

مُسلمانوں کی جغرافیائی خدمات

اموی حکومت کے خاتمہ تک مسلمانوں کی فتوحات مکمل ہو چکی تھیں اور عہد عباسی کے آغاز کے ساتھ ہی ان کی توجّہ علم و ادب، سیر و سیاحت اور تجارت کی طرف مبذول ہوئی۔ مسلمانوں میں اپنی عظیم مملکت کو جاننے کا شوق پیدا ہوا تو اُنھوں نے جغرافیہ پر خاص توجہ دی۔ علاوہ ازیں بڑھتے ہوئے تجارتی تعلقات کے پیشِ نظر بھی انہیں ملک کے مختلف صوبوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے ہزارہا ہزار اشخاص عازمِ حجاز ہونے لگے، تو ان کی رہنمائی کے لئے بھی جغرافیہ دانوں نے قلم اُٹھائے۔ اس طرح نویں صدی عیسوی کے اختتام سے قبل مسلمانوں میں کئی نامور جغرافیہ دان پیدا ہوئے جو دیکھتے ہی دیکھتے افقِ اسلام پر مہر و مہ بن کر چمکے۔

تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مامون الرشید نے اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے مشہور یونانی فاضل بطلیموس کی شہرۂ آفاق تالیف المجسطی کا عربی میں ترجمہ کروایا۔ اس دور کے اکثر و بیشتر مسلمان جغرافیہ دانوں

Marfat.com

نے اس کتاب کو اپنی تحقیق کی بنیاد قرار دیا اور پھر اپنے مشاہدات
و تجربات سے اس کتاب میں اضافے کئے۔

عہد مامون میں محمد بن موسیٰ الخوارزمی ایک مشہور ریاضی دان، جغرافیہ
دان ماہر نجوم اور مہندس ہو گزرا ہے۔ مامون نے اُسے اپنے قائم کردہ بیت الحکمت
میں تحقیق و تجسس میں لگایا وہاں اس نے علم جغرافیہ پر "صورۃ الارض" نام کی
ایک کتاب لکھی جس میں اس نے زمین کو کرّہ (GLOBE) تسلیم کیا ہے۔
حالانکہ سولہویں صدی تک یورپ کے فضلاء زمین کو چپٹی قرار دیتے
تھے۔ اور اس "عقیدہ" کا منکر کلیسا کی نظر میں مباح الدم سمجھا جاتا تھا۔

مامون کے زمانے میں ہی شام کے صحرا میں جغرافیہ دانوں نے تجربات
شروع کئے اور زمین کی پیمائش کے جغرافیائی درجات متعین کئے۔

مسلمانوں نے موسموں کے اعتبار سے کرّہ ارض کو سات طبقات میں
تقسیم کیا اور الفرغانی (م ۸۶۰ء) البتّانی (م ۹۰۰ء) ابن یونس (م ۱۰۰۹ء)
اور البیرونی (م ۱۰۴۸ء) نے مقامات کے ساتھ طول بلد اور عرض بلد لکھنے
کے طریق کو رواج دیا۔

ابن خرداذبہ کو بجا طور پر "بابائے جغرافیہ" کہا جا سکتا ہے وہ پہلا مسلمان
جغرافیہ دان تھا جس نے جغرافیہ نویسی کے لئے عربی زبان میں قواعد مرتب
کئے۔ اس کی بلند پایہ تالیف "کتاب المسالک" بعد میں آنے والے جغرافیہ
دانوں کے لئے مشعل راہ کا کام دیتی رہی۔ اس کتاب میں اس نے مختلف
ممالک کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف
شہروں کے درمیانی فاصلے بھی دیئے ہیں۔

احمد بن ابی یعقوب واضح الکاتب الیعقوبی (م ۸۹۰ء) نے بھی نویں صدی

Marfat.com

میں دنیائے اسلام کی جی بھر کر سیاحت کی تھی۔ علاوہ ازیں اس نے سرحدات کی طرف جانے والی شاہراہوں سے بھی کماحقہٗ واقفیّت پیدا کر لی تھی۔ اس کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مملکت اسلام کی سرحدات پر دشمنان اسلام کی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور اس مقصد کے تحت اس نے سرحدی علاقوں کی سیاحت پر زیادہ توجہ دی اور اپنا حاصل مطالعہ ایک کتاب کی صورت میں پیش کیا۔ یعقوبی نے افریقہ کے متعلق "افریقیہ" نام کی ایک الگ کتاب لکھی ہے۔

قدامہ بن جعفر الکاتب دسویں صدی عیسوی میں ایک نامور کاتب ہو گذرا ہے۔ اس نے اپنی تصنیف "کتاب الخراج وصنعت الکاتب" کے گیارہویں باب میں عہد عباسی کی ڈاک چوکیوں اور شاہراہوں کا بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں کو بازنطینی حکومت سے ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا تھا اور اس خطرہ کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنی سرحدات سے چوکس رہنے اور سرحدی علاقوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی ضرورت رہتی تھی۔ قدامہ نے اسی دفاعی نقطۂ نظر سے یہ معلومات جمع کی تھیں۔

اسی دور میں ابن رستہ (م ۹۱۰ء) بھی ایک مشہور جغرافیہ دان ہو گذرا ہے جس نے قدامہ کی طرز پر "اعلاق النفیسہ" نام کی ایک معرکۃ آراء کتاب قلمبند کی ہے۔ اس کتاب میں شاہراہوں کے ذکر پر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے متعلق جغرافیائی معلومات کو مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد تمام عالم خصوصاً مملکت اسلام کے متعلق بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں۔

اسی عہد کے ایک نامور جغرافیہ دان ابن الفقیہ الہمذانی نے اپنی جغرافیائی معلومات کو ۹۰۳ء میں "کتاب البلدان" میں پیش کیا ہے۔ اس نے بھی

Marfat.com

ابن رستہ کی طرح مکہ مکرّمہ اور مدینہ منوّرہ کے متعلق اپنی معلومات کتاب کے آغاز میں تحریر کی ہیں اور اس کے بعد دوسرے شہروں اور صوبوں پر قلم اُٹھایا ہے سلیمان نامی تاجر اپنے دَور کا ایک نامور ملّاح تھا اور اس نے تجارت کی غرض سے ہندوستان اور چین تک بحری سفر کیا تھا۔ سلیمان کا سفرنامہ تو اب ضائع ہو چکا ہے لیکن الہمذانی نے اس کے اقتباسات اپنی کتاب میں جا بجا دے کر اہل علم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ جس طرح ہندوستان کے متعلق البیرونی نے تحقیق کی تھی اسی طرح جزیرہ نما عرب پر الہمذانی کی تحقیق آخری سند تسلیم کی جاتی ہے۔

۹۲۱ء میں عباسی خلیفہ المقتدر نے ابن فضلان کو سفیر بنا کر بلغاریہ بھیجا تو اس نے اپنے سفر کے حالات قلم بند کر لئے ابن فضلان کے سفرنامہ کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہیں۔

علم فقہ کی طرح جغرافیہ میں بھی مختلف مکاتب فکر پائے جاتے ہیں اور ان میں سے بلخی مکتب کا بانی ابو زید احمد بن سہل بلخی (م ۹۳۴ء) تھا جس کی کتاب "صور الاقالیم" نے شہرت دوام پائی۔ بلخی نے آٹھ برس عراق میں الکندی کی خدمت میں رہ کر جغرافیہ پر عبور حاصل کیا اور اس کے بعد سیر و سیاحت کے لئے نکلا۔ بلخ واپس لوٹ کر اس نے اپنا حاصل مطالعہ مذکورہ بالا کتاب کی صورت میں پیش کیا۔ بلخی کے مقلدین میں الاصطخری، ابن حوقل اور المقدسی بڑے اُونچے پایہ کے جغرافیہ دان ہو گزرے ہیں۔ یورپ کے مستشرقین کو اس بات کا اعتراف ہے کہ ان کے بنائے ہوئے نقشے اس زمانے میں یورپ میں بنائے ہوئے نقشوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ بلخی مکتب کے جغرافیہ دانوں نے جغرافیائی نظریات کو قرآن و حدیث سے تطبیق دینے کی جو کوشش کی تھی علمائے اسلام

Marfat.com

اس کے لئے ان کے ممنونِ احسان ہیں۔

ابواسحٰق الاصطخری، ایران کے قدیم پایہ تخت پرسی پولس کا رہنے والا تھا، جسے عرب الاصطخر اور ایرانی تخت جمشید کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کی مشہور عالم کتاب "المسالک والممالک" کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دنیائے اسلام کی سیر و سیاحت بھی خوب کی تھی اور اثنائے سفر سیاحوں اور ملاحوں سے ملنے کے مواقع بھی اسے ملتے رہے تھے۔ اُس نے اپنی تصنیف میں تمام اسلامی ممالک کے نقشے بنانے کے علاوہ مختلف شہروں کے درمیانی فاصلے بھی درج کیے ہیں۔ الاصطخری نے دسویں صدی عیسوی میں اپنے مشاہدہ کی بنا پر جو دنیا کا نقشہ تیار کیا تھا اس پر ہم حیرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ بھی حال ہی میں شہنشاہ ایران کے حکم سے شائع ہوا ہے۔

ابوالقاسم محمد بن حوقل کا نام تو ہم میں سے اکثر نے سنا ہوگا وہ بغداد کا رہنے والا تھا اور بچپن ہی سے اُسے علمِ جغرافیہ سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ ابن خرداذبہ، جیہانی اور قدامہ کی تصانیف اس کے مطالعہ میں رہنے لگیں۔ ۹۴۳ء سے ۹۶۸ء تک اس نے دنیائے اسلام کی سیاحت کی اور اثنائے سفر بھی مذکورہ بالا کتب کو حرزِ جان بنائے رکھا۔ اس سیر و سیاحت کے دوران اس نے اپنی مشہور عالم تصنیف "صورۃ الارض" کے لئے مواد جمع کیا اور اس کتاب کی مقبولیت اور قدر و منزلت کا اسی بات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ابن حوقل کے بعد آنے والے اکثر و بیشتر جغرافیہ دانوں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔

ابوالحسن علی بن حسین المسعودی (م ۹۵۶ء) صاحبِ مروج الذہب ایک

Marfat.com

نامور مؤرخ اور سیّاح ہو گذرا ہے۔ جس نے دسویں صدی میں تمام دنیائے اسلام کی سیر کر کے اہلِ علم سے "جہانگشت" کا خطاب پایا ہے۔ اپنے سفر کے دوران اُسے چین جانے کا بھی اتفاق ہوا اور افریقہ کے مشرقی ساحل کے متعلق تو اس کی فراہم کردہ معلومات علم کا ایک بیش بہا خزانہ سمجھی جاتی ہیں۔ اتنائے سفر اُسے تجربہ کار اور نڈر مسلمان ملّاحوں سے تبادلۂ خیال کرنے کا خوب موقع ملتا رہا اور مسعودی نے بحر ہند اور خلیج فارس کے متعلق ان کی معلومات کو عام جغرافیہ دانوں سے کہیں زیادہ پایا۔ مسعودی نے بھی قدامہ اور ابن رُستہ کی طرح عباسی مملکت کی شاہراہوں اور ڈاک چوکیوں کی تفصیل اپنی تالیفات میں دی ہے اور ان کے مفروضات کو بے نقاب بھی کیا ہے۔ مسعودی کی تالیفات میں مروج الذہب، اخبار الزمان اور عجائب الدنیا بڑے قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔!

اسی سلسلے میں سامانیوں کے مایۂ ناز وزیر ابو عبداللہ محمد بن احمد الجیہانی کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ ہر چند اس کی تالیف "کتاب المسالک والممالک" اب ضائع ہو چکی ہے۔ تاہم اس کی اہمیّت کا اندازہ مسعودی اور دوسرے جغرافیہ دانوں کے بیانات سے لگایا جا سکتا ہے۔ الجیہانی کا وقت چونکہ بخارا میں سامانیوں کے دربار میں گذرا تھا اس لئے وسط ایشیا کے متعلق اس کی معلومات عرب میں بسنے والے جغرافیہ دانوں کی نسبت زیادہ صحیح تھیں۔

علاوہ ازیں عہدۂ وزارت پر فائز رہ کر اس نے سرکاری ذرائع سے کافی معلومات حاصل کی ہوں گی، جن کی فراہمی دوسروں کے لئے اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ یہ کتاب اگر کسی کتب خانہ سے دستیاب ہو جائے تو اہلِ علم اُسے حرزِ جان بنا کر رکھیں اور اس کے مطالعہ سے اپنی آنکھوں کو جلا بخشیں۔

Marfat.com

۹۸۲ء میں حدود العالم نام کی ایک کتاب فارسی زبان میں جغرافیہ پہ لکھی گئی۔ اس کے مصنف کا نام تاحال معلوم نہیں ہو سکا۔ فارسی زبان میں اس کتاب کی تالیف میں متعدد عربی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پروفیسر مینورسکی آنجہانی نے لندن سے شائع کی ہے۔ اس میں لاہور کے متعلق تحریر ہے کہ یہاں سیاہ مرچ خوب اُگتی ہے۔ میں نے اس بات کا فاضل مُرتب سے ذکر کیا تو فرمانے لگے کہ مصنّف کے زمانے میں لاہور کی منڈی میں سیاہ مرچ بکثرت ہوتی ہو گی جس سے اس نے یہ اندازہ لگایا ہو گا کہ اس شہر میں سیاہ مرچ پیدا ہوتی ہے ویسے یہ بات بھی بعید از امکان نہیں کہ اس زمانے میں لاہور کی آب و ہوا گرم ہو اور یہاں سیاہ مرچ اُگتی ہو۔

ابو عبداللہ محمد بن احمد المقدسی (م ۱۰۰۰ء) جیسا کہ اس کی نسبت سے ظاہر ہے، بیت المقدس کا رہنے والا تھا راقم الحروف نے اسی سال[1] کے آغاز میں بیت المقدس کے مشہور تاریخی باغ گیتھسے مینی کے دامن میں لب سڑک اس کے مزار کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو جلا بخشی ہے۔ اس نے جغرافیہ نویسی کے قواعد و ضوابط مُرتب کئے اور کسی ملک پہ قلم اُٹھاتے ہوئے وہاں کے باشندوں کے اخلاق و اطوار، قومی خصوصیّت، پیداوار، مذہب و عقائد، اوزان اور لین دین کے طریقوں پہ بحث کا آغاز کیا یہ چیز عرب جغرافیہ دانوں کے ہاں بالکل نئی بات تھی۔ اسی بات سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ المقدسی کے نزدیک جغرافیہ دانی کا مفہوم کتنا وسیع تھا۔ اس کی تصنیف "احسن التقاسیم فی معرفتہ الاقالیم" آج بھی بڑے قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔

بزرگ بن شہریار (م ۱۰۰۹ء) اپنے دور کا نامور ملّاح اور سیّاح ہو گزرا ہے۔ اس کی کتاب "عجائب الھند" میں بحر ہند کے متعلق بہت سی دلچسپ

---

[1] یہ جنوری ۱۹۶۷ء کا ذکر ہے۔

Marfat.com

معلومات پائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں جزائر مشرق الہند یا موجودہ انڈونیشیا کے متعلق بھی بہت سی دلچسپ حکایات اس کتاب میں مندرج ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں اس طرح کی کتابوں کی مانگ بڑھ رہی تھی اور بزرگ نے اسی چیز کو دورانِ تالیف پیشِ نظر رکھا۔

ناصر خسرو علوی بھی پانچویں صدی ہجری میں ایک مشہور سیاح ہو گذرا ہے جس نے اپنے آبائی وطن قبادیان سے لے کر مصر تک سیاحت کی تھی۔ اس کا سفر نامہ سلیس فارسی نثر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ ناصر خسرو اثنائے سفر ہر چیز کا بغور مطالعہ کرکے پھر اُسے اپنے سفر نامہ میں درج کرتا تھا۔ اس کا سفر نامہ اُس دور کی اسلامی دنیا کا ایک بہترین مرقع ہے۔

ابوالحسن علی بن عبدالرحمٰن المعروف بہ ابن یونس (م ۱۰۰۹ء) فاطمی خلیفہ العزیز کے عہد میں قاہرہ کی رصدگاہ کا انچارج تھا۔ اس نے پنڈولم کی حرکات سے وقت کو شمار کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔ اور اپنے مشاہدہ سے انحراف شمس کو ۲۳ درجہ ۳۵ دقیقہ پایا، جو موجودہ تحقیق کے عین مطابق ہے۔ ابن یونس نے کسی مقام کا طول بلد اور عرض بلد معلوم کرنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔

شرف الدولہ بویہ کے عہد میں ابوسہل ویجان بن رستم الکوہی بڑا نامور جغرافیہ دان اور ماہر نجوم ہو گذرا ہے۔ ابوسہل بغداد کی رصدگاہ میں تجربات کیا کرتا تھا، اور وہیں اس نے اعتدالین ربیعی و خریفی تیار کیں۔ اندلس میں الزرقالی ایک مشہور آفاق ہیئت دان اور ماہر جغرافیہ ہو گذرا ہے۔ اس نے آلات ہیئت تیار کئے اور استقبال نقطۂ الاعتدالین کی صحیح مقدار بتائی اسی طرح ابوعبداللہ محمد البتانی نے "زیج البتانی" تیار کی اور یہ کتاب یورپ میں بے حد مقبول ہوئی اور وہاں جدید ترقی میں اس سے بہت مدد لی گئی البتانی

Marfat.com

نے چاند اور دوسرے سیاروں کی گردش کا مطالعہ کیا اور زمین کے متعلق یہ نظریہ قائم کیا کہ وہ ایک جزیرہ ہے جو چاروں طرف سے سمندر میں گھرا ہوا ہے۔

ابوریحان محمد بن احمد البیرونی (م ۱۰۴۸ء) سلطان محمود غزنوی کا درباری اور اپنے دور میں ریاضی، جغرافیہ، ہیئت اور سنسکرت کا زبردست عالم تھا۔ البیرونی نے یہ ثابت کیا ہے کہ کسی زمانے میں پنجاب اور سندھ کی جگہ سمندر ٹھاٹھیں مارا کرتا تھا بعد ازاں دریاؤں نے اس سمندر کو پہاڑوں سے مٹی لاکر پاٹ دیا اور کچھ جغرافیائی تبدیلیاں بھی اس طرح ہوئیں کہ سمندر پیچھے ہٹ گیا اور زمین اوپر اُبھر آئی۔ البیرونی نے آتش فشانی کی وجوہات مدّ و جزر کے اسباب، سورج اور چاند گرہن، زلزلے کے اسباب موسموں کی تبدیلی ہیروں کی پیدائش، چشموں کے اجراء اور سطح زمین پر ہونے والی تبدیلیوں پر بہت کچھ لکھا ہے۔ البیرونی نے مساحت الارض کے قواعد مرتب کئے اور زمین کے محیط کو ۲۴۷۷۹ میل بتایا جو موجودہ پیمائش سے صرف ۸۷ میل کم ہے۔

ابن جبیر اندلسی (م ۱۲۱۷ء) ایک مشہور سیاح ہو گذرا ہے جس نے بحیرۂ روم اور فلسطین کی سیاحت کی اور نقشے تیار کئے۔ اس کی تصنیف "رحلۃ" آج بھی بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہے۔

یاقوت الحموی (م ۱۲۲۹ء) نے اپنی مشہور عالم تصنیف "معجم البلدان" میں دنیائے اسلام کے ہر چھوٹے بڑے قصبے اور شہروں کے نام، محل وقوع اور ان کی تاریخی اہمیت حروفِ تہجی کے لحاظ سے جمع کر دی ہے۔ اس کتاب سے ہمیں قرونِ وسطیٰ کے ان شہروں اور قصبوں کے محل وقوع بھی معلوم ہو جاتے ہیں جو منگولوں کے حملوں سے نیست و نابود ہو گئے۔ بعض لحاظ

Marfat.com

سے اس کتاب کو انسائیکلو پیڈیا کہنا بے جا نہ ہوگا۔ یاقوت الحموی کے بعد القزوینی (م ۱۲۷۵ء) اور الدمشقی (م ۱۳۲۵ء) نے بھی اسی طرز پر کتابیں لکھیں لیکن ان کی شہرت معجم البلدان کے مقابلہ میں ماند پڑ گئی۔

ابن المجاور نے ۱۲۳۰ء میں تاریخ المستنصر" کے نام سے جنوبی عرب کی تاریخ لکھی۔ اس کتاب میں جغرافیائی اور تمدنی معلومات بھی عام ملتی ہیں۔ تاریخ ثغرِ عدن کے تحت ابن المجاور نے عدن میں بردہ فروشی کے متعلق جو شرمناک معلومات دی ہیں میرے خیال میں انہیں پڑھنے کے بعد ایک بار تو عربوں کے سر ندامت سے جھک جاتے ہوں گے۔

ابن فاطمہ (م ۱۲۵۰ء) بھی ایک نامور عرب سیاح ہو گذرا ہے۔ جس نے افریقہ کی سیاحت کے بعد اپنا سفرنامہ مرتب کیا تھا۔ یہ سفرنامہ تو مدت ہوئی نابود ہو چکا ہے البتہ اس کے حوالے ابنِ فاطمہ کے بعد آنے والے جغرافیہ دانوں نے اپنی کتابوں میں بڑی فراخدلی سے دیئے ہیں۔ ابنِ فاطمہ کے سفرنامہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ افریقہ کے متعلق مسلمانوں کی معلومات کافی تھیں اور وہ بحر اوقیانوس میں بھی سفر کے عادی تھے۔

بحیرۂ روم، خلیج فارس، بحیرۂ قلزم، بحیرۂ عرب اور بحر ہند تو مسلمانوں کی آماجگاہ تھے۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا کہ مسلمانوں کے خوف سے رومی مچھلی پکڑنے والی کشتیاں بھی بحر روم میں نہ ڈال سکتے تھے۔ سلیمان بن احمد مین کے شہر مہرہ کا رہنے والا اور مشہور ملاح ہو گذرا ہے۔ اس نے سولہویں صدی کے نصف اوّل میں سمندروں میں اپنے تجربات اور مشاہدات پر پانچ کتابیں لکھی تھیں۔

احمد بن ماجد بھی ایک مشہور ملاح ہو گذرا ہے، جو مشرقی افریقہ کی بندرگاہ مالندی سے واسکوڈے گاما کو ۱۴۹۸ء میں کالی کٹ لایا تھا۔ پرتگیزوں کا بیان

Marfat.com

کہ اس کے پاس ایک گائیڈ بھی تھی جس میں اس نے خلیج فارس، بحیرہ عرب، بحیرہ قلزم اور بحر ہند کے متعلق معلومات جمع کر رکھی تھیں اور اس کی عمر کے پچاس برس سمندر ہی میں گزرے تھے۔ بقول بعض، قطب نما کی ایجاد کا سہرا بھی اسی احمد کے سر ہے۔

اکثر کتابوں میں سلیمان سیرافی نام کے ایک بحری کپتان کا ذکر بھی ملتا ہے، جس نے چین تک سفر کیا تھا۔ عرب ملاح عموماً چین سے ریشمی کپڑے انڈونیشیا اور ملایا سے گرم مصالحے اور قلعی، ہندوستان سے صندل، خوشبویات، عمارتی لکڑی اور ناریل عرب لیجاتے اور وہاں سے یہ مال اٹلی کی بندرگاہوں میں پہنچ جاتا اور پھر ہاتھوں ہاتھ یورپی تاجر اُسے دوسرے ممالک میں پہنچا دیتے۔

ابنِ بطوطہ (م ۱۳۷۷ء) مراکش کے مشہور شہر طنجہ کا رہنے والا اور بلاشبہ مسلمانوں میں سب سے بڑا سیاح ہو گذرا ہے اس نے مصر، شام، حجاز، عراق، ایران، ہندوستان، مالدیو، سیلون اور چین کے علاوہ وسط افریقہ تک سیاحت کی۔ سلطان محمد بن تغلق کے زمانے میں وہ کئی برس تک دہلی میں قاضی کے فرائض انجام دیتا رہا۔ سلطان نے اسے سفیر بنا کر چین کے سفر پر روانہ کیا لیکن راستہ میں اس کا جہاز تباہ ہوا اور وہ بدقت تمام مالدیو اور سیلون ہوتا ہوا چین پہنچا۔ آخر عمر میں ابنِ بطوطہ اپنے وطن واپس ہوا اور وہاں اس نے "عجائب الاسفار" کے نام سے اپنا سفر نامہ مرتب کیا۔ یہ کتاب اس دور کی اسلامی دنیا پر معلومات کی ایک کان ہے۔

علامہ ابن خلدون ہر چند کہ تاریخ اور عمرانیات کا ماہر تھا تاہم جغرافیہ پر بھی اس کی بڑی گہری نظر تھی۔ علامہ نے جو نقشہ تیار کیا تھا اسے پروفیسر روزن تھال نے مقدمہ ابنِ خلدون کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ ہی شائع

Marfat.com

کر دیا ہے۔ نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ کو مرکزی مقام حاصل ہے، اور کرۂ ارض کو بحر محیط (ENCIRCLING OCEAN) نے گھیرا ہوا ہے۔ اس نقشہ میں سدِّ سکندری بھی واضح کی گئی ہے جو علامہ موصوف کے خیال میں کوہ ریا کے قریب واقع ہے۔

Marfat.com

خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ

خواجہ محمد ہاشم کشمی ولایتِ بدخشاں کے رہنے والے تھے لیکن آپ کا نصیبِ طالع آپ کو ہندوستان لے آیا۔ ان دنوں آپ کے ہم وطن اور حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے خلیفۂ اوّل میر محمد نعمان کشمیؒ برہانپور میں مقیم تھے اس لئے آپ قدیمی تعلقات کی بنا پہ سیدھے ان کی خدمت میں جا حاضر ہوئے۔ آپ نے سلوک کی ابتدائی منازل میر موصوف کی نگرانی میں طے کیں اور پھر ان ہی کے مشورہ سے ۱۶۲۱ء میں سرہند جا کر حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے اور دو سال تک سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہے۔ آخری ایّامِ زندگی میں جب حضرت مجدد صاحبؒ نے عزلت اختیار کی تو صاحبزادوں کے علاوہ جن خاص خاص مریدوں کو ان کے حضور میں باریابی کی اجازت تھی ان میں خواجہ محمد ہاشمؒ کا نام بھی آتا ہے۔ جس تن دہی اور خلوص سے آپ نے اپنے مُرشد کی خدمت کی اس کا ثبوت حضرت مجدّد الف ثانیؒ اور ان کے صاحبزادوں کی تحریروں میں عام ملتا ہے۔ اسی خلوصِ نیت کی بنا پر حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنی وفات سے سات ماہ قبل آپ کو

Marfat.com

خلافت دے کر برہانپور روانہ کیا۔ آپ نے وہاں پہنچتے ہی بحکم مرشد رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا اور جلد ہی خاص و عام میں مقبول ہوئے۔ تا حال آپ کا مزار پُر انوار، جو سیوا سدن کالج کے احاطہ میں ہے، مرجع خلائق ہے۔ راقم السطور نے جولائی ۱۹۶۸ء میں مولوی معین الدین صاحب، استاذ سیوا سدن کالج، کی معیت میں مزار پر حاضری دی اور کتبہ کی عبارت نقل کی جو درج ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مزار قدس خواجہ ہاشم کشمی رحمۃ اللہ علیہ

خواجہ ہاشم حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ کے مرید اور خلیفۂ خاص تھے، آپ شہر کشم علاقۂ بدخشاں کے باشندے تھے۔ ۱۰۲۹ھ ہجری میں دار السرور برہانپور تشریف لائے اور مجددیہ سلسلے کے ایک بزرگ حضرت میر محمد نعمان بدخشی رحمۃ اللہ علیہ سے فیض روحانی حاصل کیا۔ ۱۰۳۱ھ میں سرہند شریف جاکر مجدد صاحب سے مقامات سلوک کی تکمیل کی، واپسی پر برہانپور میں مع اہل و عیال سکونت اختیار کی۔ ۱۰۴۵ھ ہجری آپ کا سن وفات ہے۔ پہلے آپ کا مزار اقدس عیدگاہ کے قریب پانڈہ رول ندی کے کنارے پر تھا۔ ۱۲۷۲ھ ہجری میں سیلاب کی وجہ سے مزار شریف کے منہدم ہونے کا خطرہ تھا اس لئے خود خواجہ صاحب نے عالم خواب میں شہر برہانپور کے ایک بزرگ محمد طاہر صاحب کو مزار شریف کے دوسری جگہ منتقل کرنے کی ہدایت فرمائی۔ حسب ارشاد آپ کے جسم اطہر کو موجودہ مقام پر دفنایا گیا۔ حضرت خواجہ ہاشم صاحب کے مزار اقدس کے پاس ہی آپ کے فرزند ارجمند حضرت میر محمد قاسم اور دختر نیک اختر بی بی صفیہ کے مزارات بھی ہیں اور آپ کے خلیفہ مخلص حضرت شاہ عبد اللطیف رحمۃ اللہ حصاری کی قبر بھی ہے۔ خواجہ ہاشمؒ درویش باصفا ولی کامل اور

Marfat.com

عالم و شاعر تھے آپ کی تصانیف مکتوبات امام ربّانی جلد سوم اور کتاب زبدۃ المقامات فارسی مطبوعہ ہیں، کلیات نظم فارسی کا قلمی نسخہ ملّا فیروز پارسی کے کتب خانہ آر، کے، کاما لائبریری بمبئی میں محفوظ ہے۔

مکتوبہ مورخہ ۴ ربیع الاول ۱۳۸۷ھ ہجری مطابق ۱۴ جون ۱۹۶۷ء خواجہ محمد ہاشمؒ نے شعر و سخن کا بڑا عمدہ ذوق پایا تھا۔ آپ کے دیوان کے قلمی نسخے لندن، ایڈنبرا، کلکتہ، حیدر آباد اور علی گڑھ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں آپ نے زبدۃ المقامات میں جابجا اپنے اشعار اور رُباعیات نقل کی ہیں اور ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو غزل، مثنوی اور رُباعی کہنے پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ آپ کے اسی ذوق کے پیشِ نظر آپ کے مُرشد نامدار حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات کی تیسری جلد کی ترتیب آپ کے ذمہ سونپی تھی۔ آپ کی علمیّت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ حضرت مجدّد صاحبؒ کی حیات ہی میں ان کے صاحبزادوں نے ان کی سوانح حیات اور ان کے کلماتِ شریفہ اور انفاس لطیفہ قلمبند کرنے کے لئے آپ کا انتخاب کیا اور جس محنت و کاوش سے آپ نے یہ خدمت انجام دی اس کا منہ بولتا ثبوت خود زبدۃ المقامات ہے۔

زبدۃ المقامات

کتاب کا اصل نام ۔ برکات الاحمدیہ الباقیہ ۔ ہے لیکن یہ اپنے تاریخی نام زبدۃ المقامات سے مشہور ہے۔ تاہم اس سنہ کے بعد بھی اس میں ترمیم اور اضافہ ہوتا رہا۔ ایک جگہ آپ نے خواجہ حسام الدین کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے "اب سنہ ۱۰۴۰ھ ہجری ہے۔ آپ کی عمر شریف ساٹھ سال کو پہنچی ہے"۔ اس کتاب کی علمی قدر و قیمت یہ ہے کہ اس میں آپ نے حضرت امام ربانیؒ

Marfat.com

کے وہ فوائد جو مکتوبات میں نہیں آسکے ان کے صاحبزادوں کی فرمائش پر قلم بند کر دیئے ہیں۔ اس لحاظ سے اسے ایک طرح سے مکتوبات کا تکملہ ہی سمجھنا چاہیئے۔ اس کتاب کے حصہ اوّل میں آپ نے حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے سوانح حیات، ملفوظات اور مکتوبات کے اقتباسات بھی تحریر فرمائے ہیں اس لئے اسے خواجہ باقی باللہ کی پہلی سوانح عمری بھی سمجھنا چاہیئے چونکہ خواجہ بزرگ کا انتقال آپ کے ورودِ ہندوستان سے کئی سال پیشتر ہو چکا تھا اس لئے آپ نے ان کے متعلق معلومات ان کے خلفا اور متوسلین سے فراہم کی تھیں۔ خواجہ بزرگ کے حالات جس شرح و بسط کے ساتھ اس کتاب میں ملتے ہیں ویسے کسی اور تذکرہ میں میں نہیں ملتے اس طرح اس کتاب کی علمی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے علاوہ ازیں خواجہ محمد ہاشمؒ کے بعد آنے والے جتنے بھی تذکرہ نویسوں نے خواجہ بزرگ کے حالات تحریر فرمائے ہیں ان سب کا ماخذ زبدۃ المقامات ہے۔

یک چراغست درین خانہ کہ از پرتوِ آن ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

خواجہ باقی باللہؒ کے دونوں صاحبزادوں کے حالات جس تفصیل کے ساتھ زبدۃ المقامات میں ملتے ہیں ویسے کسی دوسری کتاب میں میری نظر سے نہیں گزرے۔ خواجہ محمد ہاشمؒ کے پاس خواجہ کلاں عبید اللہؒ کے مکتوبات کافی تعداد میں موجود تھے اور آپ کے خیال کے مطابق یہ بڑے "فصیح و بلیغ" تھے۔ خواجہ خرد عبداللہؒ کے متعلق بھی بہت سی اہم معلومات اسی کتاب میں ملتی ہیں۔

فوائدِ علمی

زبدۃ المقامات کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت مجدّد

Marfat.com

الف ثانیؒ کی ایک نامکمل شرح عوارف المعارف خواجہ ہاشمؒ کی نظر سے گذری تھی، علاوہ ازیں آپ ان کی ایک "بیاضِ خاص" سے بھی متعارف تھے۔

خواجہ محمد ہاشمؒ نے خواجہ محمد سعیدؒ کی تعلیقات مشکوٰۃ المصابیح کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اس کتاب میں آپ نے ان احادیث پر تحقیق کی تھی جو فقہ حنفی کا ماخذ ہیں۔

خواجہ ہاشمؒ نے ایک موقعہ پر "چراغ ہفت محفل خواجہ معصومؒ" کی ایک — بیاض — کا بھی ذکر فرمایا ہے جس سے آپ نے زبدۃ المقامات کی تالیف کے دوران استفادہ کیا تھا، آپ کے بیان کے مطابق اس بیاض میں اُنھوں نے حضرت امام ربانیؒ کے وہ اسرار و معارف قلم بند کر لئے تھے جو خلوتوں میں ان کی زبانِ گوہر افشاں سے سنے تھے۔ اب یہ بیاض ضائع ہو چکی ہے اگر کہیں موجود ہوتی تو عارضِ حور سے زیادہ دلکش ہوتی اور اصحابِ معرفت اور اربابِ دانش اسے حرزِ جان بنا کر رکھتے۔

زبدۃ المقامات کی ورق گردانی سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ شیخ تاج الدین سنبھلیؒ کے ایک خلیفہ محمد علاءؒ نے جو حرم مکہ میں قیام پذیر تھے، رشحات عین الحیات کا عربی میں ترجمہ کیا تھا اور اس کتاب کے مطالعہ کے بعد عراق و عرب میں بے شمار لوگ نقشبندیہ سلسلہ میں داخل ہوئے۔

خواجہ ہاشمؒ کے پاس خواجہ حسام الدین کے مکتوبات کا بھی ایک اچھا خاصا مجموعہ موجود تھا۔ علاوہ ازیں آپ نے خواجہ باقی باللہؒ کے بڑے صاحبزادے خواجہ عبید اللہؒ کے مکتوبات بھی محفوظ کر لئے تھے۔ آپ نے اپنے ہم وطن اور پیر بھائی خواجہ محمد صدیق کشمیؒ کے متعلق بھی تحریر فرمایا ہے

Marfat.com

کہ اُنھوں نے مولانا رومیؒ کی مثنوی کی طرز پہ ایک مثنوی حقائق صوفیہ کے موضوع پہ لکھی تھی۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے خسرو شیریں کی طرز پہ بھی اپنی ایک یادگار چھوڑی ہے۔ مصنف چونکہ خود اہلِ علم تھے اس لئے دوسروں کے علمی آثار کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ بہت سی ایسی کتابوں کا ذکر فرما گئے ہیں جو اب ناپید ہیں۔

زبدۃ المقامات کے متعلق شیخ محمد اکرام صاحب ارمغان پاک میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ کتاب باسلیقہ فن سوانح نگاری کا ایک قابل قدر نمونہ ہے، اور اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک روحانی بزرگ کے حالات ہونے کے باوجود یہ خرق عادت واقعات سے قریب قریب خالی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

عوام میں یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ آخری عمر میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ خود کو حضرت مجدد صاحبؒ کا طفیلی سمجھنے لگے تھے۔ نقشبندی حلقوں میں اس بات کا اس زور و شور سے پروپاگنڈا کیا گیا ہے کہ اب یہ بات خواص کے ذہنوں میں بیٹھ چکی ہے۔ زبدۃ المقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ "افواہ" اس زمانے میں بھی عوام میں پھیل چکی تھی۔ ہمارے خیال میں یہ غلط فہمی اس وجہ سے پھیلی کہ جب حضرت مجدد الف ثانیؒ انتہائے کمال کو پہنچے تو خواجہ بزرگؒ ان کا احترام کرنے لگے تھے اور یہ ایک فطری امر تھا۔ ہم نے خود اپنے زمانے میں دیکھا ہے کہ جب کسی شاگرد میں خاص قابلیت کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے تو اساتذہ بھی اس کا دل و جان سے خاص خیال رکھنے لگتے ہیں۔ بالکل اسی طرح خواجہ بزرگ اپنے مرید خاص کی قابلیت، استعداد

Marfat.com

اور ترقی مقاماتِ سلوک دیکھ کر ان کا خاص خیال رکھنے لگے تھے۔ خواجہ ہاشمؒ رقم طراز ہیں کہ بارہا خواجہ بزرگ، حضرت مجددؒ الف ثانیؒ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کرتے تھے کہ آپ جیسے لوگ ہماری صحبت سے نکلے ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر آپ رقم طراز ہیں کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ خواجہ بزرگؒ کے "یمن و برکت" سے درجۂ کمال کو پہنچے ہیں۔ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مجددؒ الف ثانیؒ کے صاحبزادوں اور خلفا کا ایسا نظریہ نہ تھا کہ خواجہ بزرگؒ آپ کے طفیلی تھے۔ صرف چند کوتاہ بینوں کو خواجہ صاحب کے مزاج میں تواضع اور انکسار دیکھ کر یہ غلط فہمی ہو گئی تھی۔

دیوان

آپ کے دیوان کے متعدد نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ انڈیا آفس لائبریری لندن کے نسخہ کی مائیکروفلم میرے پاس موجود ہے اور مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے مجموعہ ابو محمد کا نسخہ میں نے بغور پڑھا ہے، اور اس میں سے کافی کچھ نقل بھی کیا ہے۔ علی گڑھ کا نسخہ شاہجہان کے آخری ایامِ حکومت میں ۱۰۶۶ھ میں ورطۂ تحریر میں آیا تھا۔ اس نسخہ کے ۱۸۵ اوراق ہیں اور ہر صفحہ میں ۱۷ سطریں ہیں۔ دیوان کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے۔

اگر بر سیِ زقدس سرو باغ راستان آمد ستون بارگاہ بادشاہ لامکان آمد
الف بود و سر آغاز حروف ابجد ہستی نشان وحدت پروردگار بی نشان آمد

اس کے بعد حمد ہے اور اس کے بعد چند نعتیں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں لکھی ہیں اور ان کے ابتدائیہ اشعار یہ ہیں۔

دلہا چہ بود خانہ سودائی محمدؐ جانہا صدفِ گوہر یکتائی محمدؐ

Marfat.com

سلسلۂ اہلِ جنون موی محمدؐ محرابِ عبادت خمِ ابروی محمد
وحدت چہ بود غنچۂ خندانِ محمدؐ کثرت چہ بود زلفِ پریشانِ محمد
یوسف چہ بود زال خریدارِ محمدؐ عیلی کہ بود عاشقِ بیمارِ محمدؐ
اشیا نقطی چند ز اقلامِ محمدؐ این نامہ نمو بافتہ از نامِ محمدؐ
اخلاقِ رسل جا کہ آئینِ محمدؐ دینہا ہمہ تنظار گہِ دینِ محمدؐ

اس کے بعد ایک چالیس ابیات کی مثنوی ہے جس کا مطلع ہے۔

چون جمالِ خواجہ بود اوّلِ بہار از گلستانِ ظہور کرد گذار

اس کے بعد ۹۹ رباعیات ہیں جن میں آپ نے احادیث منظوم کی ہیں۔ اس کے بعد ۷ غزلیات ہیں جن کے بعد ساقی نامہ مسمیٰ لبعبہ سیارہ مرغان آتشخور ہے، جہاں ساقی نامہ ختم ہوتا ہے وہاں خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ کی منقبت ہے جس میں ۱۳۱ ابیات ہیں۔ اس کا مطلع ہے۔

بستہ از قدرتِ نقاشِ ازل نقشِ دگر کلکِ رنگین زبان بر ورقِ لختِ جگر

اس کے بعد "قصیدہ در مدح حضرت شیخ احمد فاروقیؒ" ہے جس میں ۲۴۷ ابیات ہیں۔ قصیدہ کا مطلع ہے۔

سحر خفتہ بودم در آغوشِ خویش بر سمِ دل و خواب خرگوشِ خویش

اس کے بعد ایک طویل نظم ہے اور پھر حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی منقبت میں ۴۰ اشعار تحریر کئے ہیں۔ منقبت کے بعد میر محمد نعمانؒ کی خدمت میں ۱۳ ابیات کا ایک منظوم خط لکھا ہے جس میں تاخیر جواب پر معذرت چاہی ہے۔ اس کے بعد ۱۴۷ اشعار میں ایک درویش کا قصہ قلم بند کیا ہے، اور اس کے بعد غزلیات کا حصہ شروع ہوتا ہے جس میں ۲۵۰ غزلیات ہیں، پہلی غزل ہدیۂ قارئین ہے۔

Marfat.com

بسملِ دلہا بود بسم اللہ عنوانِ ما — بابرُ دیوانگی موی سرِ دیوانِ ما
ہر الف الفی و ہر بی ہزاران رازنہ — شیخ ہمچو طفل حیران در دبیرستانِ ما
ہست ہر سطری ز ما ابروی معشوقِ سخن — گوشۂ ابرو اشارتہای بی پایانِ ما
زان درین ابرو کجی ننود گر مست اما کہ بیت — خود کجی در طبع و در گفتار و در پیمانِ ما
بسکہ در ہر لفظ ما صد معنی آواز کیست — نقطۂ ما ہمچو پرکار است سرگردانِ ما
حرفہا سیخ کباب و نقطہا جام شراب — ہوش گیر د گوش چون حرفی رود ز خوانِ ما
ہر کہ دید آن خندۂ پنہان نمکہای و گر — باید از زار نہفت و قصۂ پنہانِ ما
از ملاحت حرفِ ما بشکست بازار نمک — کس نگیرد در قیامت جز نمکدانِ ما

رشحِ کلک ماست ہاشمؔ سیل و دلہا پر کاہ
کافر از مومن نداند موجۂ طوفانِ ما

ایک دوسری غزل ملاحظہ فرمائیے :-

شب تب کاہش بسوخت برگ نوا را — میلی خود کردہ ایم دست دعا را
راز نہانی بلب رساند دل امروز — خوی کبوتر کہ داد بلبل ما را
خلق بمحراب ابروی او سجود ند — شیشۂ دل بشکند قبلہ نما را
بس رخ خواب آب دیدہ نشانی — گوش کنی گر شبی فسانہ ما را
بود صبای میان ما و تو جبریل — حیرت این راز بست پای صبا را

ہر چہ رسد ہاشمؔ از جہانت مزن دم
راہ درین شہر نیست چون و چرا را

ایضاً

خیز تا جانؔ[1] بہ رہگذار کنیم — خویش را چشم انتظار کنیم

---

[1] شیخ محمد اکرم صاحب نے ارمغان پاک میں پہلا شعر یوں تحریر فرمایا ہے۔
خیز تا جا بہ رہگذار کنیم — خویش را چشم انتظار کنیم
اور شیخ صاحب نے خواجہ ہاشم کی جو غزل نقل فرمائی ہے اس میں پانچواں، چھٹا اور آٹھواں شعر غائب ہے۔

Marfat.com

تا بدامانِ آن سوار رسیم — ہستی خویش را غبار کنیم
از تمنا می گرد راہ کسی — اشک را در ثنا ہموار کنیم
یوسفِ ما عزیزِ ہر شہریست — جست و جوئش بہر دیار کنیم
جملہ عالم نوید وصل و دید — خویش را بر ہمہ نثار کنیم
حرفِ موی کنیم و خوش ہمہ را — چون خود آشفتہ روزگار کنیم
خلق محمل بکار دل بستند — ما نداریم دل چکار کنیم
چون جرس سر بپای ناقہ نہیم — نوحہ بر جانِ بیقرار کنیم
از جگر قطرۂ بادہ بریم — مژہ را گلبنِ بہار کنیم

در ناسبت نقطہ ہاشم
گوش جوئیم و گوشوار کنیم

ردیف "س" کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیے اس میں شیخ فخرالدین عراقیؒ کے کلام کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

از برہمن و شیخ تو کیشِ بدران پرس — از عشق پرستان غم شیرین پسران پرس
گم شد ز شرابِ لبِ این مغ بچگان دل — بنشین خبر گم شدہ از گم شدگان پرس
تا کی ملبِ غنچہ نہی باد صبا چشم — این قصہ سر بستہ ز خونین جگران پرس
ز افسانہ این طبع گران نوش گران کن — دستار سبک روحان از رطل گران پرس
رو خواب طرب از مژہ خار و خسک جو — بیداری آن خواب ز چشم نگران پرس
شد روز و ظلم شب چو بزلف تو نظر کرد — افسانہ این شب تو ز صاحب نظران پرس

پیدا شود از ظلمتِ شب روشنی شمع
ہاشم ہنر خویش ز عیبِ دگران پرس

ردیف "م" کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیے:-

Marfat.com

چل سال رفت ورہ بحقیقت نیافتیم | زین اربعین نتیجہ طاعت نیافتیم
درعمر نوح شیوۂ طفلی ز ما نرفت | لقمان شدیم و نبض طبیعت نیافتیم
دیدم بجلد ولیس قران را بگر یہ گفت | اینجا فراغ گوشہ عزلت نیافتیم
داؤد عشق دست بمضراب زد و گفت | بہ زین کلید قفل شریعت نیافتیم
در کاخ ذرہ نہادیم پای فکر | کنہ دی دری بکوچہ حیرت نیافتیم
گنجست کش لبہولسان خواندا ند گنج ، | گنجی فزول ز کنج قناعت نیافتیم

بس از سان آہ شکستیم قلب خویش
خوشتر زدرد ہیچ غنیمت نیافتیم

ردیف "ن" کی ایک غزل پیشِ خدمت ہے۔

بآب می وہائی آشنا کن | چو شستی کام ولب مارا دعا کن
نبوش ای شیخ می وز فیض مستی | چو می در شیشہ رقص بی ریا کن
ز مستی چون صراحی سر فرود آر | بعزت سجدۂ بہرِ خدا کن
دہان شو چون قدح زین راز دامروز | بزرق گریۂ دی خندہا کن
تیمم بود زہدِ خشک چل سال | وضوا ز می کن وعمرت قضا کن
زخاکی گر بمی انیوان تگندی | بہ وچون مردمک در دیدۂ جا کن
بی عیسٰی گہی رنجور دل باش | بن ہر مورا دار الشفا کن
من ای جان از لوام آخر از خویش | تو دانی خود جفا باخود وفا کن
فقیہہ از بہرِ من فتوٰی چہ جوئی | برو ساماں لفت و لوریا کن

بر از دل چو ہاشم لب کشاید
لب ہر موُ تو بہرِ ثنا کن

غزلیات کے بعد ۷۵۴ رباعیاں ہیں جن میں سے چند ہدیۂ قارئین ہیں۔

Marfat.com

رباعی

شمع شب غم کاشانهٔ تست — درکعبه روم قبله من خانهٔ تست
ازبسکه دلِ سوختهٔ دیوانهٔ تست — پروانهٔ آن شوم که پروانهٔ تست

ولہ

جانا سمت قبله بجز سوی تو نیست — محراب جهانیان جز ابروی تو نیست
دیدم سواد اعظم ملتها — سوگند بموی تو که موی تو نیست

ایضاً

انصاف بده ای فلک تلخ مذاق — رعد تو نکوست با نوای عشاق
وین برق تو به بانفس سوختگان — وآن ابر تو خوش با مژهٔ اهل فراق

ولہ

لعل تو شرابی که نمک تشنهٔ اوست — آبیست که در بحر سمک تشنهٔ اوست
هرچند نمک تشنه بی آرد بار — آنیست دران لب که نمک تشنهٔ اوست

ایضاً

ای دوست رخی بهجر کشان بنما — وز لب نمکی بسینه ریشان بنما
سررشتهٔ جمعیت دل می طلبم — یک یار ازان موی پریشان بنما

ولہ

چون یار بدست بازگیسو بگشاد — صد نافه چین زچین هر مو بگشاد
بشکست هزار دل چو خم داد ز زلف — بگشاد هزار جان چو ابرو بگشاد

ایضاً

با تشم همه غم شنو که مسرت اینست — خاک رهِ عشق باش عزت اینست
یارا هدف تیر جفا ساخت دلت — مخروش نشانِ محبت اینست

Marfat.com

ایضاً

جسمِ من و چشمِ تست بیمار اے دوست
مژگانِ من و تیغ خونبار اے دوست

بر بادِ ترا بوی و مرا خرمنِ صبر
آشفتۂ ترا موی و مرا کار اے دوست

رباعیات کے بعد ایک طویل غزل ہے جس کا عنوان ہے "غزل مشتمل بر بیان دوازدہ مقام و بلبیت و چہار شعبہ و شش آوازہ و اوقات ہر یک و انواع تغنی"

اس کے بعد تین اشعار ہیں جو آپ نے اپنے دادا کو لکھ کر بھیجے تھے۔

ان کے بعد چار اشعار میں حضرت مجدد صاحبؒ کے نام کے "رموز" بیان کئے ہیں۔ ان کے بعد ۱۵ ابیات میں شجرۂ نقشبندیہ منظوم کیا ہے۔ ان کے بعد دو ابیات میں خواجہ امکنگیؒ، تین ابیات میں خواجہ باقی باللہؒ اور ۲۵ ابیات میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تاریخ ہائے وفات نکالی ہیں۔ اس کے بعد ۶۳ اشعار میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی عمر کے لحاظ سے ۶۳ تاریخہائے وفات نکالی ہیں اسی طرح سات دیگر اشعار سے مادۂ تاریخ بر آمد ہوتا ہے۔ اسی ضمن میں دو رباعیاں بھی لکھی ہیں جن سے حضرت کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ اس کے بعد ۴ اشعار میں مکتوبات امام ربانی کے دفتر اوّل کی تاریخ تدوین کہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کہنے میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا اور آپ نے مندرجہ بالا بزرگوں کے علاوہ ان بزرگوں کی تاریخیں بھی کہی ہیں۔

صاحبزادہ محمد صادقؒ، خواجہ محمد علیؒ، سید میرکؒ، علم اللہ محدثؒ، مولانا دانش سند بدخشانیؒ، میر مومن بلخیؒ، شیخ طاہر لاہوری، میر عبداللہ احرارؒ، قاضی شکرؒ، مولانا معصومؒ، والد خود مولانا محمد قاسمؒ، خواجہ عثمانیؒ، شیخ حسن قادریؒ، سید محمودؒ عصمت اللہ لاہوریؒ اور خانخانان۔

Marfat.com

ان کے مربی خاص میر محمد لغمان نے ایک عوض بنوایا تو آپ نے تاریخ کہی، شاہجہان کے جلوس کی تاریخ کہی، اسی طرح قصر شاہجہانی، جامع مسجد شاہجہانی مسجد خانجہانی، مسجد فخر الدین احمد اور تجدید مسجد بہ بانپور کی تاریخیں کہی ہیں۔

مرثیہ گوئی میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ آپ کے دیوان میں مراثی کثرت سے ساتھ ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادقؒ جو آپ کے ورود ہندوستان سے پیشتر ہی وصال فرما چکے تھے، ان کا مرثیہ بھی آپ نے بڑے زوردار الفاظ میں لکھا ہے۔

چشمم براہ ماندہ وگوشم بہ بانگ در — کس نیست تا خبر دہد از یار نو سفر
گفتم تو کیستی غم ہجران منان کلک شکست — بسمل شد از حبلہ مرغان نامہ بر
از ہر مسام آہ وز ہر موی خون روا — ہجران اوست آتش و ما ہیمہای تر
شبہا نسانہ غم او با خیال او — گویم کہ جز خیال ندارد باد گذر
چون نور شمع از تہ قندیل جسم او — باشد ز زیر خاک بہر دیدہ جلوہ گر
شمع مزار او ہمہ نور غفور بود — دلہای زائران درش غرق نور بود

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وصال پر آپ نے ایک رباعی کہی جس کے آخری مصرعہ سے مادۂ تاریخ ۱۰۳۴ھ برآمد ہوتا ہے۔

تا عیسیٰ جانہا نہان از عالم خاک — دلہا شدہ خون پیرہن یوسف چاک
چون رفت بسوی روضۂ پاک بہشت — تاریخ وصال او بگو روضہ پاک

ایضاً

بہار باغ عرفان ابر رحمت — کزین گلشن بتعجیل صبا رفت
نگہ صبح قیامت سر بر آرد — کہ از مشکوٰۃ دین شمع ہدیٰ رفت
چو شاہ اولیا عہد خود بود — خرد گفتا کہ شاہ اولیا رفت

Marfat.com

اسی طرح آپ نے جن ترکیبِ مصرعوں سے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تاریخ وفات نکالی ہے ان میں سے چند ایک قابلِ توجہ ہیں ۔

سراج وجود طرف بست ۔ خیر الاولیا ناماذ ۔ معرفت مُرد ۔ احمد زبدۂ مشائخ بود ۔ ابر نیسان رحمت بود ۔ شہسوار محبت بود ۔ شمسِ حقیقت بود ۔ شاہِ طریقت بود ۔ جانِ شریعت ہمہ اتباع سنت ۔ جبلت تربیت ، رفیع المراتب ، خیر المناقب ۔ مرآت جمال اللہ اکبر ۔ بحار اسرار قرآنی ۔ منور دین بالف ثانی ۔ نور چمن زار عزت ۔ سراج اکابر اہل سنت ۔

اس کے بعد چار غزلیں ہیں جن کے متعلق آپ رقمطراز ہیں " این چہار غزل راکہ در اوّل بیت ہمان حرف آخر است در ردیف مشکل باشارہ شاہزادہ ہای عالی مرتبہ مدظلہم نظم نمودہ ام " ۔ ان میں سے ایک غزل کا مطلع یہ ہے ۔

ثابت از نیست در کار دولت کار عبث　　کیسہ چون ہست تہی رفتن بازار عبث

یہاں شاہزادہ ہائے عالی مرتبہ سے شجاع اور اورنگ زیبؒ مراد لیے جا سکتے ہیں کیونکہ وہ دونوں ہی برہانپور میں رہ چکے ہیں ۔ اس سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ انھیں شاہزادوں کی بارگاہ میں بار تھا یا انھیں ان کے سامنے عقیدت تھی ۔

اس کے بعد پنج بند اور نو رباعیاں اپنے بھائی اسحاقؒ کے مرثیہ میں لکھی ہیں اور آخر میں ۳۹ اشعار اور دو رباعیوں میں اپنے بھائی محمد قاسم خضرؒ کا مرثیہ لکھا ہے ۔ یہاں آکر دیوان ختم ہو جاتا ہے ۔ میں ان کا ذکر ان کی رباعی پر ہی ختم کرتا ہوں ۔

بس ہستی من سست نہاد است اے دل　　کاہست تن و آہ تو بادست اے دل
آری بہ عنکبوت و شاد روانش　　نیمی نفس صرصر عادست اے دل

فتوحات فیروز شاہی

Marfat.com

ملّا نظام الدین احمد صاحبِ طبقات اکبری کی روایت ہے کہ سلطان فیروز تغلق (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء) نے اپنے عہدِ حکومت کے اہم ترین واقعات اور اپنی اصلاحات کو "فتوحات فیروز شاھی" کے نام سے قلمبند کیا تھا۔ اس خیال سے کہ زمانہ کے ظالم ہاتھوں سے کہیں اس کی یہ مختصر سی تالیف ضائع نہ ہو جائے، سُلطان نے اُسے لفظ بلفظ جامع مسجد فیروز آباد کے ہشت پہلو گنبد پہ کندہ کروا دیا۔ اسے قدرت کی ستم ظریفی کہیے کہ سلطان فیروز تغلق نے اپنی تالیف کو زندہ و جاوید رکھنے کے لئے جس سنگین گنبد پہ کندہ کروایا تھا وہ تو مدت ہوئی تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ البتہ اس کی تحریر بے جان سے کاغذ پہ آج بھی محفوظ ہے۔

فتوحات فیروز شاھی کے دو مخطوطے ہمارے علم میں ہیں، ان میں سے ایک مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے اور دوسرا برٹش میوزیم لندن میں۔ ۱۸۸۵ء میں دہلی سے کسی صاحب نے اسے شائع کیا تھا لیکن چھپنے کے ساتھ ہی یہ رسالہ چھپ گیا۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

Marfat.com

نے بھی ایک بار اسے چھاپا تھا۔ لیکن وہ ایڈیشن بھی اب ناپید ہے۔
۱۹۵۴ء میں پروفیسر شیخ عبدالرشید نے ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں کی مدد سے متن تیار کر کے علی گڑھ سے اسے بڑے خوبصورت ٹائپ میں شائع کیا اور اس کے بعد اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا۔ لیکن اس رسالہ کے اردو ترجمہ کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔

فتوحات فیروز شاہی کا مطالعہ فیروز شاہ کے ذہن کو سمجھنے کے علاوہ اس دور کے مذہبی افکار اور تصوف کے رجحانات کو جاننے کے لئے اشد ضروری ہے۔

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا فتاح

اس خالق غفور و شکور کو حمد بے حد اور شکر بے حد سزاوار ہے جس نے مجھ بیچارے مسکین فیروز بن رجب غلام محمد شاہ بن تغلق شاہ کو احیاء سنّتِ رسول بیخ کنی بدعات، دفعِ منکرات، منع محرمات اور فرائض و واجبات ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اس سیّد کائنات پر بے شمار رحمتیں ہوں جو رسم و رواج کے خاتمہ کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ (حضورؐ کا فرمان ہے کہ "میں (جاہلیت کے) رسم و رواج ختم کرنے کے لئے مبعوث ہوا ہوں") ان پر اور ان کی آل اور اصحاب پر، جن کی مساعیٔ جمیلہ سے جاہلیت کے رسم و رواج ختم ہوئے تھے، درود اور سلام ہو۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

اما بعد۔ اس معطی حقیقی کے انعام و اکرام کا اظہارِ شکر واجبات میں سے ہے، اس لئے اس کا شکر احسن طریقے سے کرنا چاہیئے۔ آدم علیہ السلام کی اولاد کے سردار (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور "اما بنعمتِ ربک فحدث" (میں اسی

Marfat.com

طرف اشارہ ہے)۔ اس مسکین و بیکس کو بھی خدا تعالیٰ نے بہت سی نعمتیں عطا کی ہیں ۔ میری یہ خواہش ہے کہ میں ان عطیات الٰہی کا، جو اس نے مجھے بخشے ہیں، طاقتِ بشری کے مطابق شکر ادا کروں ۔ شاید اسی طرح میں اس کے شکر گزار بندوں میں داخل ہو جاؤں ۔

اس خالقِ رازق جل جلالہٗ وعم نوالہٗ کے عطیات میں سے ایک عطیہ یہ ہے کہ ملک ہندوستان میں (بہت سی) بدعتیں اور خلاف شریعت باتیں مروج تھیں اور وہ عوام کی فطرت میں داخل ہو کر ان کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھیں اور لوگ راہ سنت سے منحرف ہو چکے تھے ۔ حق تعالیٰ نے اس بیچارے اور مسکین بندے کو یہ توفیق بخشی اور اس نے بدعتوں، خلافِ شریعت اور حرام کاموں کے خاتمہ کو اپنا فرض سمجھا۔ اس نے (اس سلسلے میں) بڑی جدّوجہد کی یہاں تک کہ خدا کی مدد اور نصرت سے باطل رسموں اور خلاف شرع امور کا بالکل خاتمہ ہو گیا، اور حق اور باطل میں تمیز ہو گئی ۔

۱۔ اولاً یہ کہ زمانۂ ماضی میں مسلمانوں کا بہت سا خون بہایا جاتا تھا اور انھیں طرح طرح کی سزائیں دی جاتی تھیں ۔ (مجرموں کے) ہاتھ، پاؤں، کان اور ناک کاٹے جاتے، آنکھیں نکال لی جاتیں، پگھلا ہوا سیسہ حلق میں انڈیلا جاتا، موگری کے ساتھ ان کے ہاتھ، پاؤں اور سینہ کی ہڈیاں توڑ دی جاتیں، جسم کو آگ کے ساتھ داغا جاتا، ہاتھ پاؤں اور سینہ میں میخیں ٹھونکی جاتیں، کھال اتاری جاتی، خاردار دُرّے لگائے جاتے اور پاؤں کاٹ دیئے جاتے تھے ۔ آرے کے ساتھ چیر کر دو ٹکڑے کر دینے کے علاوہ ان کا اور بھی کئی طریقوں سے مُثلہ کیا جاتا تھا ۔ اُس اکرم الاکرمین نے اور ارحم الراحمین نے اس بندۂ امیدوارِ کرم کے دل میں القا کیا اور اسے ہمت عطا فرما کر اس کام پر مامور کیا

Marfat.com

کہ مسلمانوں کا خون بلا وجہ نہ بہنے پائے اور انہیں کسی بھی قسم کی اذیت نہ پہنچنے دے اور کسی بھی شخص کا مُثلہ نہ ہونے دے۔

بیت

چگونہ شکر این نعمت گزارم
کہ زود مردم آزاری نہ دارم

(اگلے سلاطین) یہ سب کام کیا کرتے تھے تاکہ لوگوں پر رعب بیٹھ جائے اور ان کا خوف دلوں پر طاری ہو جائے اور انتظامِ سلطنت درست ہو جائے۔ وہ اس بات کی مثال دیا کرتے تھے۔

بیت

ملک را بہ قرار می خواہی
تیغ را بی قرار خواہی داشت

خدا کے فضل سے، جو اس مسکین کے شاملِ حال ہے، وہ سختیاں اور ڈراب مہربانی، کرم اور احسان میں بدل گئے ہیں اور خواص و عام کے دلوں میں خوف و رجا پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ اب کسی کو قتل کرنے، مارنے پیٹنے، تکلیف دینے، سختی کرنے یا شکنجے میں کسنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ (مجھے) یہ سعادت خدا کے فضل اور عنایت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

نظم

کرم کن چو دست تو بالاتر است
کہ بخشایش از خشم والاتر است

ترا چون زباری بزرگی عطاست
بہ تعجیل رسم سیاست خطاست

گر اول توقف کنی در قصاص
توان کشت اورا کہ بدہی خلاص

Marfat.com

ولیکن چو قالب پراگندہ گشت — نیارد بہ فرمان تو زندہ گشت
نگہ کن گہی مادر مہرسنج — بر آن طفل خود چند بر داشت رنج
مگو "مرد کشتم صد اندر نبرد" — یکی زندہ کن تات خوانند مرد
چو بر خود نداری روا نشتری — مکش تیغ بر گردن دیگری
مکوش اندر آن کز تنی خون رود — کہ جان باز ناید چو بیرون رود
بخون ریز خلقی مشو فتنہ دوست — ترا نیز خونیست آخر بہ پوست
ہزار آفرین بر چنان رہنمون — کہ پیشِ بزرگان نکو شد بخون
زدولاب چرخ آن کسان را ست آب — کہ الیشان نیارد در خون شتاب

چو دشمن زبون گشت احسان بکن
بہ قدرت جوان مردیٔ جان بکن

خدا کی مدد سے (میں نے اپنے) دل میں اس بات کا تہیہ کر لیا کہ ہر مسلمان کا خون اور ہر مومن کا جسم محفوظ و مامون رہے گا اور اگر کوئی شخص راہِ شریعت سے ہٹے تو کتاب اللہ اور قاضی کے فیصلے کے مطابق وہ جس سزا کا مستحق ہو، اُسے دی جائے۔ للہ الحمد علی توفیقہ

۲۔ اس کے علاوہ مجھ پر حق تعالیٰ و جلّ کا یہ فضل و کرم ہے کہ گذشتہ سلاطین کے القابات، جو جمعہ اور عیدین کے خطبوں سے حذف کر دئے گئے تھے، اور ان مسلمان بادشاہوں کے نام، جن کی ہمت اور برکت سے کافروں کے شہر فتح ہوئے جن کی فتوحات کے جھنڈے ہر ملک میں گڑے، صنم کدے برباد ہوئے، منبر تعمیر ہوئے، مسجدیں آباد ہوئیں، اعلائے کلمۃ الحق ہوا، اہلِ اسلام طاقتور اور حربی کافر ذمی بنے، بھلا دئے گئے تھے، میں نے حکم دیا کہ حسبِ سابق سب کے نام اور اوصاف خطبہ میں پڑھے جائیں اور انہیں

Marfat.com

دعائے مغفرت کے ساتھ یاد کیا جائے۔

بیت

چو خواہی کہ نامت بود جاودان
بکن نام نیک بزرگان نہان

۳۔ اس کے علاوہ اس ہادی عزاسمہٗ کی مدد سے، زمانۂ ماضی میں جو ٹیکس، غیر قانونی، غیر شرعی اور حرام طریقوں سے جمع کر کے بیت المال میں داخل کیے جاتے تھے، مثلاً منڈوی برگ[۱]، دلالت بازار[۲]، جزاری[۳]، امیری طرب[۴]، گل فروشی[۵]، جزیۂ تبنول[۶]، چنگی غلہ[۷]، کتابی[۸]، نیلگری[۹]، ماہی فروشی، ندافی[۱۰]، صابون گری، ریسمان فروشی، روغن گری[۱۱]، نخود بریاں[۱۲]، تہ بازاری، چھتہ[۱۳]

---

۱ منڈی کا ٹیکس
۲ دلالوں پر ٹیکس
۳ بڑے قصائیوں پر ٹیکس
۴ ناچ، گانوں اور تماشوں پر ٹیکس
۵ پھولوں کی فروخت پر ٹیکس
۶ پان پر ٹیکس
۷ غلہ پر چنگی۔

۸ ا۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب کے خیال میں کتابت پر جو ٹیکس لیا جاتا تھا اُسے کتابی کہتے تھے۔

ii۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے خیال میں یہ لفظ کتابی نہیں بلکہ کبابی ہے اور اس سے وہ ٹیکس مراد ہے جو کبابوں پر لگایا جاتا تھا۔

iii۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اسے کیابی پڑھا ہے، ان کے خیال میں یہ ٹیکس تولنے والوں پر عائد کیا جاتا تھا۔

۹ نیل کی صنعت پر ٹیکس
۱۰ دھننے پر ٹیکس
۱۱ تیل نکالنے پر ٹیکس
۱۲ بھُنے ہوئے چنوں پر ٹیکس
۱۳ چھتہ پر ٹیکس، بقول بعض کپڑے کی چھپائی پر ٹیکس۔

Marfat.com

قمار خانہ[۱۴]، داد بیگی[۱۵]، کوتوالی[۱۶]، احتسابی[۱۷]، قصابی[۱۸]، کوزہ خشت پزی[۱۹]، کہ ہی[۲۰]، چرائی[۲۱]
اور مصادرات[۲۲]، ان کے متعلق میں نے دیوان مالیات کو حکم بھیجا کہ انہیں
فی الفور ختم کر دیا جائے اور جو سرکاری آفیسر ایسے ٹیکس لوگوں سے لے کر
(خزانے میں) جمع کرلے اسے قرار واقعی سزا دی جائے۔

بیت

دل دوستان جمع بہتر کہ گنج
خزینہ تہی بہ کہ مردم بہ رنج

(میں نے یہ بھی حکم دیا کہ) جو مال بیت المال میں جمع ہو وہ انہی مدوں
سے آئے جنہیں شریعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روا رکھا ہے اور
دینی کتب میں بھی ان کا جواز موجود ہو، مثلاً زمین کا خراج، عشر، زکوٰۃ وغیرہ
یا پھر ہندوؤں سے لیا گیا جزیہ یا لاوارث جائداد، یا مالِ غنیمت اور کانوں
کی پیداوار کا خمس، ایسی مدوں کی آمدنی جو کتاب اللہ کی رُو سے جائز نہ ہو،
کسی طرح بھی بیت المال میں جمع نہ ہونے پائے۔

۴۔ اس کے علاوہ یہ کہ اس سے پہلے یہ رسم اور عادت، جو سراسر بدعت تھی،
رواج پاگئی تھی، کہ مالِ غنیمت کے چار حصے خزانے میں جاتے تھے اور

---

[۱۴] جوا خانہ پر ٹیکس
[۱۵] کورٹ فیس
[۱۶] پولیس سے متعلق فیس
[۱۷] احتساب کے متعلق فیس
[۱۸] عام قصائیوں پر ٹیکس
[۱۹] مٹی کے برتن اور اینٹیں بنانے پر ٹیکس
[۲۰] دیہات کے مکان پر ٹیکس
[۲۱] جانور چرانے پر ٹیکس۔
[۲۲] جرمانے۔

Marfat.com

پانچواں حصّہ غازیوں کو دیا جاتا تھا، حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ پانچواں حصّہ بیت المال میں داخل کیا جائے اور چار حصّے غازیوں میں تقسیم کئے جائیں۔ یہاں سرکاری حکم کے مطابق اس کے برعکس ہو رہا تھا، تقسیم کا یہ حکم چونکہ شریعت کے مطابق نہیں تھا۔ اس لئے مالِ غنیمت کو جو بھی اپنے تصرف میں لاتا وہ فعل حرام کا مرتکب ہوتا تھا۔ اس طرح اگر کوئی کنیز بچّے کو جنم دیتی تو وہ حرامی ہوتا تھا۔ اسے روکنے کے لئے ہم نے یہ حکم دیا کہ غنیمت کا پانچواں حصّہ بیت المال میں جمع کیا جائے اور چار حصّے غازیوں میں تقسیم کئے جائیں۔

۵۔ اس کے علاوہ یہ کہ شیعہ مذہب کے پیرو، جنھیں روافض کہتے ہیں، لوگوں کو مذہب رفض و تشیع کی دعوت دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے مذہب کے متعلق رسالے اور کتابیں لکھیں اور تعلیم و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ حضرات خلفائے راشدین، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور تمام صوفیائے کرام رضی اللہ عنہم کو اعلانیہ برا بھلا کہتے اور لوا طت کرتے تھے۔ وہ قرآن مجید کو "ملحقات عثمانی" کہتے تھے۔ میں نے ان سب کو گرفتار کر لیا، ان کی گمراہی اور ضلالت چونکہ ثابت ہو چکی تھی لہذا ان میں سے جو غالی تھے انھیں قتل کروا دیا اور دوسروں کو مار پیٹ، ڈانٹ ڈپٹ اور تشہیر کر کے چھوڑ دیا۔ ان کی کتابوں کو سرِعام جلا ڈالا، یوں، خدا کی عنایت سے، اس فرقہ کا شر مکمل طور پر ختم ہوا۔

۶۔ اس کے علاوہ یہ کہ ملحد اور اباحتی جمع ہو گئے اور وہ عوام کو الحاد اور اباحت کی طرف بلایا کرتے تھے۔ رات کے وقت وہ بلا تمیز محرم

Marfat.com

دغیر محرم ایک خاص جگہ جمع ہوتے اور کھانا اور شراب سامنے رکھ کر
کہتے کہ یہی ہماری عبادت ہے ، انھوں نے ایک بت بھی بنا لیا تھا
اور وہ لوگوں کو اس بات پہ مجبور کرتے تھے کہ وہ اُسے سجدہ کریں۔
اس رات وہ اپنی بیویوں ، ماؤں اور بہنوں کو جمع کرتے اور پھر جس
کا لباس ان کے ہاتھ لگتا اُسی کے ساتھ زنا کرتے۔ ان کے پیروں
کے ، جو شیعہ تھے ہم نے سر اڑا دئے اور بانیوں کو قید کیا ، جلاوطن کیا یا سزا
دی ، یہاں تک کہ ان کا شر اسلامی حکومت سے مکمل طور پہ ختم ہو گیا۔

۷۔ اس کے علاوہ یہ کہ ایک طبقہ دھریت اور ترک و تجرید کے
کے رنگ میں لوگوں کو گمراہ کر کے مرید بنا رہا تھا۔ وہ لوگ کلمات کفر
بھی بکا کرتے تھے۔ ان گمراہوں کا مرشد احمد بہاری نامی ایک شخص تھا
جو شہر (دہلی) میں رہتا تھا۔ بہاریوں کا ایک گروہ ، جو اُسے خدا
کہتا تھا ، گرفتار کر کے پابہ زنجیر ہمارے سامنے لایا گیا۔ یہ لوگ نبی اکرم
کی شان میں گستاخیاں کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جس شخص کی نو
بیویاں ہوں اُس کی نبوت کی بھلا کیا شان ہو سکتی ہے۔ اس کا ایک
مرید کہا کرتا تھا کہ دہلی میں خدا ، یعنی احمد بہاری ، ظاہر ہوا ہے۔ ان
کے خلاف چونکہ اس بات کا ثبوت مل چکا تھا اس لئے ان دونوں کو
میں نے گرفتار کر کے قتل کروا دیا اور دوسروں کو توبہ و استغفار کرنے
کا حکم دیا۔ ہم نے ان سب کو جلاوطن کر کے مختلف شہروں میں
بھیج دیا تاکہ شر بھی منتشر ہو کر ختم ہو جائے۔

۸۔ اس کے علاوہ یہ کہ شہر دہلی میں ایک شخص رکن (الدین) ملقب
بہ مہدی نے کہا کہ میں مہدی آخر الزمان ہوں اور مجھے علم لدنی حاصل

Marfat.com

ہو گیا ہے۔ میں نے کسی سے تعلیم اور فیض حاصل نہیں کیا اور مجھ کو تمام مخلوقات کے ناموں کا علم ہے جس کو سوائے آدم علیہ السلام کے اور کوئی پیغمبر نہیں جانتا۔ (اسی طرح) علم حروف کے راز جو کسی کو معلوم نہیں وہ مجھ پر ظاہر کر دیئے گئے ہیں۔ اس نے اس پر کتابیں لکھیں اور لوگوں کو گمراہی اور بے راہ روی کی دعوت دی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں "رکن الدین رسول اللہ" ہوں۔ بڑے بزرگوں نے میرے سامنے اس بات کی گواہی دی کہ وہ ایسا ہی کہتا ہے اور ہم نے اس سے یہی کچھ سنا ہے۔ جب اُسے ہمارے سامنے لایا گیا اور ہم نے اس کی گمراہی اور بے راہروی کے متعلق استفسار کیا تو اس نے اس بدعت اور گمراہی کا اقرار کیا۔ علمائے دین نے کہا، "وہ کافر ہو چکا ہے اور اس کا خون بہانا جائز ہے۔ یہ فتنہ چونکہ اس کے خبث باطن کی وجہ سے اسلام اور اہلِ سنت وجماعت میں سر اُٹھا رہا ہے، اس لئے اگر اس کے دفعیہ میں، معاذ اللہ، تاخیر کی گئی تو اس کا یہ اثر ہوگا کہ بہت سے مسلمان گمراہ ہو کر دینِ اسلام سے نکل جائیں گے۔ اس سے ایسا فتنہ پیدا ہوگا کہ بیشمار لوگ مارے جائیں گے۔" ہم نے کہا کہ دنیا بھر کے علماء میں اس خبیث کی گمراہی اور فتنہ و فساد کا اعلان کیا جائے۔ اور ہر کس و ناکس کے کانوں تک یہ بات پہنچائی جائے۔ بعد از آں علمائے دین اور آئمہ شریعت کے فتویٰ کے مطابق وہ جس سزا کا مستحق ہو اُسے دی جائے۔ اسے ان لوگوں کے ساتھ، جو اس کے معتقد، مددگار اور شریکِ کار تھے، قتل کیا گیا اور عوام میں خاص و عام نے جا کر اس کے گوشت، پوست اور اعضائے جسمانی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس طرح اس کا شر ختم ہوا جو دنیا والوں کے لئے باعث

Marfat.com

تنبیہ ہوا۔

خدا کی نصرت اور عنایت سے میں نے اس طرح کے شر اور اس قسم کی بدعات کا استیصال کیا اور حق تبارک و تعالیٰ نے اپنے اس مسکین بندے کو یہ توفیق دی کہ وہ سُنّت کا احیاء کرے۔ اس کے ذکر کی غرض محض اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے اس تحریر کو سُن کر یا پڑھ کر اگر کسی شخص کو اپنے دین کی فلاح مطلوب ہو تو وہ اسی طریقے پر عمل کرے اُسے اس کا اجر ملے گا، اور اُسے اس کارِ خیر کی طرف توجہ دلانے پر ہم بھی داخلِ ثواب ہوں گے۔ اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔

۹۔ اس کے علاوہ یہ کہ ملک گجرات میں عین ماہرو کے غلاموں میں ایک شخص شیخ بن بیٹھا اور اس نے بہت سے لوگوں کو اپنا مرید بنا لیا اور "انا الحق" کا نعرہ لگانے لگا۔ وہ اپنے مریدوں سے کہا کرتا تھا کہ جب میں "انا الحق" کہا کروں تو تم "تو ہی، تو ہی" کہا کرو۔ وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ میں وہ بادشاہ ہوں جس کو موت نہیں آتی۔ اس نے ایک رسالہ لکھا تھا جس میں کلماتِ کفر مندرج تھے۔ اُسے زنجیروں سے جکڑ کر ہمارے سامنے لایا گیا۔ اس کی گمراہی چونکہ ثابت ہو چکی تھی اس لئے ہم نے اُسے قتل کروا دیا اور اس نے جو رسالہ لکھا تھا وہ ہم نے جلا دیا۔ اس طرح خدا پرست مسلمانوں کے درمیان سے یہ فتنہ ختم ہوا۔

۱۰۔ اس کے علاوہ یہ کہ ایک رسم اور عادت، جس کا اسلام میں کوئی جواز نہیں لیکن شہر (دہلی) کے مسلمانوں کی فطرت میں داخل ہو چکی تھی، یعنی ایامِ متبرکہ میں عورتیں، ٹولیوں کی شکل میں، پالکیوں، بہلیوں اور ڈولیوں میں بیٹھ کر یا گھوڑوں اور گدھوں پر سوار، فوج در فوج اور گروہ

Marfat.com

درگزدہ پا پیادہ شہر سے باہر نکلتیں اور مزارات پر جاتیں (آوارہ مزاج) لونڈے اور اوباش جو خواہشاتِ نفسانی میں مبتلا اور صلاح وتقویٰ سے عاری ہیں ان کے پیچھے ہو لیتے، جو فتنہ وفساد ان کی حرکات سے ظاہر ہو سکتا ہے وہ (چشم بینا سے) پوشیدہ نہیں ہے۔ یوں بھی عورتوں کا اس طرح باہر نکلنا شرعاً منع ہے۔ ہم نے حکم دیا کہ کوئی عورت کسی مزار پہ نہ جائے اور اگر کوئی وہاں جائے تو اُسے سزا دی جائے۔ ان دنوں حق تعالیٰ کی عنایت سے کسی باپردہ مسلم خاتون یا عورت کی یہ مجال نہیں کہ باہر نکلے اور زیارت کو جائے۔ یہ بدعت بھی یوں ختم ہوئی۔

۱۱۔ اس کے علاوہ یہ بھی خدا کی دین ہے کہ ناپاک اور صنم پرست ہندوؤں نے، جنہوں نے عقد ذمت میں آکر جزیہ دینا قبول کیا ہے اور ان کے گھر بار محفوظ ہیں، شہر کے اندر اور گرد ونواح میں نئے بتخانے تعمیر کر لئے تھے۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں چونکہ بتخانے تعمیر کرنے جائز نہیں ہیں اس لئے ہم نے حق تعالیٰ کی توفیق سے ان کی تعمیر کردہ غلط بنیاد عمارتوں کو برباد کر دیا۔ ہم نے ان کافروں کے سرغنے، جو دوسروں کو گمراہ کیا کرتے تھے، قتل کر ڈالے اور عام لوگوں کو مختلف قسم کی سزائیں دے کر متنبہ کیا۔ اس طرح یہ فساد بھی ختم ہوا۔

اس کے علاوہ ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ موضع ملوہ میں ایک تالاب ہے جسے کُنڈ کہتے ہیں اور وہاں بت خانے بنے ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کا ایک طبقہ اپنے متعلقین کے ساتھ ایک خاص دن، اپنی عادت کے مطابق، اسلحہ سجائے ہوئے کافی ساز وسامان کے ساتھ سوار ہو کر نکلتا ہے۔ ان کی عورتیں اور بچے پالکیوں اور بہلیوں میں بیٹھ کر

Marfat.com

ان کے ساتھ جاتے ہیں۔ وہ لوگ وہاں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوکر بت پرستی کرتے ہیں۔ وہ اس فتنہ میں اتنا غلو کرتے ہیں کہ دکاندار قسم قسم کی کھانے پینے کی اشیاء لے کر وہاں پہنچ جاتے ہیں اور دکانیں لگا کر فروخت کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا ایک بے دین طبقہ نفسانی خواہشات لے کر ان کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ جب یہ بات ہمارے کانوں تک پہنچی تو ہم نے، خدا کی توفیق اور مدد سے اس فساد کو، جس کی وجہ سے دین اسلام کو نقصان پہنچ رہا تھا، ختم کرنے کا عزم کر لیا۔ جس دن وہ لوگ وہاں جمع ہوتے ہیں ہم بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہم نے حکم دیا کہ ان کے گورنروں کو، جو انہیں ورغلاتے اور گمراہ کرتے ہیں، قتل کیا جائے اور عام ہندوؤں کو اذیت ناک سزائیں دے کر (وہاں جمع ہونے سے) منع کیا۔ ہم نے وہ بت خانہ برباد کر ڈالا اور اس جگہ ایک مسجد بنوائی اور (گرد و نواح میں مسلمانوں کے) قصبات آباد کئے، ان میں سے ایک کا نام تغلق پور اور دوسرے کا نام سالار پور رکھا۔ ان دنوں اس جگہ جہاں ناپاک کافروں نے بتخانہ بنایا ہوا تھا۔ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے مسلمان سچے معبود کے آگے سجدہ کرنے کے علاوہ، تکبیریں کہتے، اذانیں دیتے اور جماعت کے ساتھ نمازیں ادا کرتے ہیں۔ جس جگہ پہلے کافروں کے مسکن ہوا کرتے تھے اب وہاں مسلمان بستے ہیں جو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا ذکر اور ورد کرتے رہتے ہیں۔ اسلام کی (اس سربلندی) کے لئے اللہ ہی کی تعریف کرنی چاہیئے۔

علاوہ ازیں ہمیں یہ خبر ملی کہ موضع صالح پور میں بعض ہندوؤں نے ایک نیا شوالہ تعمیر کر لیا ہے اور بت پرستی میں مشغول ہیں۔ ہم نے وہاں

Marfat.com

بھی بت خانہ برباد کرنے کے لئے آدمی بھیجے اور جو لوگ گمراہی پر اصرار کر رہے تھے انہیں جلاوطن کر دیا۔

علاوہ ازیں یہ کہ گوھانہ نام کے ایک قصبہ میں ہندوؤں نے ایک نیا بتخانہ تعمیر کر لیا تھا اور مشرکوں کا ایک گروہ وہاں جمع ہو کر بت پرستی کیا کرتا تھا۔ انہیں گرفتار کر کے ہمارے پاس لائے۔ ہم نے حکم دیا کہ ان میں سے جو شخص مایۂ فساد ہیں ان کی گمراہی کا اعلان کیا جائے اور انہیں قصرِ شاہی کی ڈیوڑھی کے سامنے قتل کیا جائے۔ ہم نے یہ حکم دیا کہ کفر کی کتابیں، اور بُت پرستی کے جو لوازمات وہ اپنے ساتھ لائے تھے انھیں بھی عوام کے سامنے مقتل میں ہی جلایا جائے۔ باقی لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کے ساتھ (ان کاموں سے) منع کیا جائے تاکہ دوسروں کو تنبیہ ہو اور آئندہ دارالاسلام میں کوئی ذمی ایسی جرأت نہ کرے۔

۱۲۔ اس کے علاوہ یہ کہ زمانۂ ماضی میں یہ رواج تھا کہ دسترخوان پر طلائی اور نقرئی ظروف استعمال کئے جاتے تھے اور تلواروں کے دستوں اور ترکش پر سونے سے نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ ہم نے ایسا کرنے سے منع کیا اور اپنے اسلحہ کے نیام شکار شدہ جانوروں کی ہڈیوں سے بنوائے۔ ہم نے ان برتنوں کے استعمال کی عادت ڈالی جن کا استعمال شریعت کی رو سے جائز ہے۔

۱۳۔ علاوہ ازیں یہ کہ گذشتہ زمانے میں یہ رواج تھا کہ کپڑوں پر تصویریں بنائی جاتی تھیں اور یہ (کپڑے) شاہی دربار میں لوگوں کو خلعت کے طور پر پہنائے جاتے تھے۔ اسی طرح لگام، زین، سواری

Marfat.com

کے جانور کے طوق، عود جلانے والی انگیٹھی، مثقال، پیالہ، کوزہ، طشت، لوٹے، خیمے، پردے، تخت، کرسی، جملہ آلات اور ہتھیاروں پر تصویریں بنائی جاتی تھیں یا پھر مجسمے بنے ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور عنایت شامل حال ہوئی تو ہم نے حکم دیا کہ ان تمام اشیاء پر سے تصویریں اور مجسمے مٹا دیے جائیں اور (جو نقش و نگار) خلافِ شریعت نہیں اور ان کا بنانا جائز اور مباح ہے وہ بنائیں جائیں۔ جو مجسمے گھروں، دیواروں اور محلوں پر بنے ہوئے تھے، ان کے متعلق یہ حکم دیا کہ انہیں مٹا دیا جائے۔

۱۴۔ علاوہ ازیں یہ کہ اس سے پہلے اکثر بزرگوں کا لباس غیر شرعی یا ریشمی ہوتا تھا اور اس پر زردوزی کا کام کیا ہوا ہوتا تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی توفیق سے ہم نے ایسا لباس اختیار کیا جو شریعت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رُو سے مباح ہے۔ زردوزی والے کپڑے اور زربفت کی کلاہ کا استعمال شروع کیا جس میں (سنہری کام کی) چوڑائی چار انگشت سے زیادہ نہ ہو، اور جو کچھ غیر شرعی اور ناجائز تھا یا جس کا استعمال شریعت میں منع تھا، اُسے ترک کر دیا۔ اسلام پر (کاربند ہونے کے لئے) اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔

۱۵۔ اللہ تعالیٰ نے اس مسکین بندے پر جو عنایات کی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے ہمیں کارِ خیر کے لئے عمارات بنانے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ ہم نے بہت سی مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں اس غرض سے تعمیر کی ہیں کہ ان میں علماء، مشائخ، زاہد اور عابد معبودِ حقیقی کی عبادت کریں اور بنانے والے کو دُعائے خیر سے یاد کریں۔

Marfat.com

ہم نے نہریں بھی کھدوائی ہیں اور درخت بھی لگوائے ہیں ہم نے ایسی اراضی، جس کا حصول شریعت کے مطابق ہے اور اس پر سبھی کا اتفاق ہے، نیز اس پر علمائے شریعت کا اجماع ہو چکا ہے (کہ اس کا حصول) ہر طرح کے شک و شبہ سے بالا ہے ہم نے اس کا ذکر صراحت کے ساتھ دستاویز میں کر دیا ہے کہ اس کی آمدنی بندگانِ خدا تک پہنچا دی جائے۔

۱۶۔ اس کے علاوہ خدا کے عطیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم نے گذشتہ سلاطین اور سابقہ امرا کی تعمیر کردہ عمارات کی جو امتداد زمانہ سے ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں مرمت کرائی یا انہیں نئے سرے سے تعمیر کر دلکے ان کو رونق بخشی۔ ہم نے ان عمارات کے استحکام کو اپنی تعمیر کردہ عمارات پر مقدم جانا۔

دہلی کی پرانی جامع مسجد، جو سلطان معزالدین سام کی تعمیر کردہ ہے، قدامت کی وجہ سے مرمت طلب تھی، ہم نے اس کی اس طرح مرمت کروائی کہ اب اس میں نئے سرے سے جان پڑ گئی ہے۔

سلطان معزالدین سام کا مقبرہ، جس کی غربی دیوار اور پرانے دروازے کے تختے بالکل بیکار ہو چکے تھے، نئے سرے سے بنوایا۔ اس کے دروازوں، کھڑکیوں اور زینوں میں معمولی لکڑی کی بجائے صندل کی لکڑی استعمال کی گئی۔

سلطان معزالدین کا مینارہ، جو آسمانی بجلی کے حادثہ سے گر گیا تھا (ہم نے) اُسے اپنی اصل بلندی سے بھی بالا اور پہلے سے کہیں بہتر بنوا دیا۔

Marfat.com

حوض شمسی تک پانی لانے والی نالی کو بعض بددیانت لوگوں نے کہیں اُوپر ہی سے کاٹ کر پانی کی بہم رسانی روک دی تھی۔ ہم نے آب رسانی کی راہ میں حائل تمام رُکاوٹیں دُور کر دیں اور بیجا تجاوزوں کی سرزنش کی۔

حوض علاقۂ بے آب ہو کر مٹی سے اٹا پڑا تھا اور شہر کے لوگ اس میں کاشت کرنے لگے تھے۔ اُنھوں نے وہاں کنوئیں کھود لئے تھے اور ان کا پانی فروخت کرنے لگے تھے۔ ایک مدت کے بعد ہم نے اُسے (دوبارہ) کھدوایا۔ اب یہ عظیم حوض سال بھر پانی سے بھرا رہتا ہے۔

اسی طرح سلطان شمس الدنیا والدین ایلتتمش رضی اللہ عنہ کا مدرسہ جس کے کئی کمرے منہدم ہو چکے تھے انہیں پہلے سے بھی کہیں بہتر بنوایا۔ مقبرہ کی تعمیر کے وقت صحن میں گچ کا پلستر نہیں ہوا تھا، وہ بھی کروا دیا۔ گنبد میں پتھر سے تراشے ہوئے زینے کا اضافہ کیا اور چاروں برجوں کے جو پشتے ٹوٹ رہے تھے انہیں درست کروا دیا۔

سلطان شمس الدین کے فرزند سلطان معزالدین کا مقبرہ جو ملک پور میں واقع ہے، اس طرح منہدم ہوا تھا کہ گویا وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ اس جگہ نئے سرے سے گنبد، چبوترہ اور چار دیواری تعمیر کی۔

سلطان رکن الدین بن سلطان شمس الدین کا مقبرہ جو ملک پور میں واقع ہے اس کے گرد چار دیواری بنوائی۔ (اس کے علاوہ) وہاں ایک نیا گنبد بنوایا اور خانقاہ تعمیر کروائی۔

سلطان جلال الدین کے مقبرہ کی مرمت کروائی اور وہاں نیا دروازہ تعمیر کیا۔

Marfat.com

سلطان علاؤالدین کے مقبرہ کی مرمت کروائی اور اس میں صندل کے دروازے لگوائے (اس کے علاوہ) بیاؤ کی دیوار اور مدرسہ کے اندر جو مسجد ہے اس کی قبلہ رُخ دیوار کی نیو سے لے کر فرش تک مرمت کروائی۔

مقبرہ سلطان قطب الدین اور سلطان علاؤالدین کے فرزندوں خضر خان، شادی خان، فرید خان، سلطان شہاب الدین، سکندر خان، محمد خان، عثمان خان اور اس کے پوتوں اور پڑپوتوں کے مزاروں کی از سرنو مرمت کروائی۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الحق والدین محبوب الٰہی قدس اللہ سرہ کے مزار کی جالیاں اور دروازے صندل کی لکڑی سے بنوائے اور سونے کی قندیلیں، سنہری زنجیروں کے سہارے، گنبد کے چاروں گوشوں میں آویزاں کیں۔ جماعت خانہ (کے نام سے ایک) نئی عمارت تعمیر کی پہلے وہاں ایسی عمارت نہ تھی۔

سلطان علاؤالدین کا وزیر اعظم ملک تاج الدین کافوری، جو باون ہزار سواروں کا سردار تھا، بڑی عقل اور فراست کا مالک تھا۔ اس نے ایسے بہت سے ملک، جہاں گزشتہ سلاطین کے گھوڑوں کے قدم بھی نہ پہنچے تھے، فتح کر کے سلطان علاؤالدین کے نام کا خطبہ جاری کیا۔ اس کا مقبرہ ڈھہ چکا تھا اور اس کی قبر زمین کے برابر ہو گئی تھی۔ میں نے اس خیال سے کہ وہ حکومت کا خیر خواہ اور نمک حلال (ملازم) تھا۔ اس کا مقبرہ نئے سرے سے بنوا دیا۔

دارالامان میں، جہاں ہمارے مخادیم کے مزارات اور خوابگاہیں

Marfat.com

ہیں۔ صندل کے دروازے لگائے اور اپنے ان آقاؤں کی قبروں پہ خانہ کعبہ کے دروازہ کے پردوں کے شامیانے لگوائے۔ ان مقبروں اور مدرسوں کی عمارتوں اور ان کی مرمت کے مصارف ان کے پرانے اوقاف سے پورے کیے۔ اس سے قبل جہاں آنے جانے والوں، فرش، روشنی اور دوسرے لوازمات کے لیے، جو ایسی جگہوں کے شایانِ شان ہیں، رقم مقرر نہ تھی، گاؤں وقف کیے تاکہ ان کی آمدنی ہمیشہ وہاں خرچ ہوتی رہے

اسی طرح جہاں پناہ کو، جس کا بانی سلطان محمد شاہ مرحوم و مغفور میرا آقا اور ولی نعمت تھا اور جس کی خدمت میں رہ کر میں پلا اور بڑھا ہوں، آباد کیا۔ اسی طرح مملکت دہلی میں واقع گذشتہ سلاطین کے تعمیر کردہ تمام قلعوں کی مرمت کروائی۔

۱۷۔ اس کے علاوہ ہم نے مدرسوں اور مقبروں کے لیے، نیز گذشتہ سلاطین اور مشائخ عظام کے مزاروں پہ آنے جانے والوں کے لیے، اور ان بابرکت مقامات کے لیے ضروری سامان فراہم کرنے کی غرض سے ان کے پرانے وقف شدہ دیہات اور زمینوں کو بہ قرار رکھا، اور جن کے لیے اوقاف کی آمدنی یا اس کا کوئی حصہ مقرر نہ تھا، ان کے حصے مقرر کیے تاکہ ہمیشہ کے لیے وہاں کارِ خیر جاری ہو جائے تاکہ آنے جانے والوں، اہل علم اور اہلِ معرفت کو وہاں آرام ملے اور وہ ہمیں اور انہیں دعائے خیر سے یاد کرتے رہیں۔

۱۸۔ اس کے علاوہ حق تعالیٰ نے ہمیں توفیق بخشی اور ہم نے شفا خانہ قائم کیا تاکہ خاص و عام میں سے جسے کوئی مرض لاحق ہو یا کسی تکلیف میں بتلا ہو تو وہاں پہنچ جائے۔ وہاں طبیب موجود رہتے ہیں۔ دوا اور (پرہیزی)

Marfat.com

غذا کے مصارف اوقاف کی آمدنی) سے دیئے جاتے ہیں۔ مقیم اور مسافر، رذیل اور شریف، آزاد اور غلام، ہر طرح کے مریض وہاں آتے ہیں۔ (شفاخانہ میں) ان کا علاج ہوتا ہے اور خدا کے فضل و کرم سے وہ صحت یاب ہو جاتے ہیں۔

۱۹۔ اس کے علاوہ یہ کہ خدائے ذوالجلال اور قادرِ بے کمال نے اس بندۂ عاصی کو توفیق بخشی کہ وہ لوگ جو میرے آقا سلطان محمد شاہ مرحوم و مغفور، خدا اس کی قبر کو معطر کرے، کے عہدِ حکومت میں تقدیرِ الٰہی سے مارے گئے تھے، یا جن لوگوں کی آنکھیں، ناک، ہاتھ اور پاؤں جیسے اعضا ضائع ہو گئے تھے ان کے وارثوں کو شاہ مرحوم و مغفور سے راضی کیا۔ ان میں سے ہر ایک کو مال و زر دے کر رضامند کیا اور (ان سے) خوشنودی کے خطوط، جن پر مستند شہادتیں ثبت تھیں، لے کر ایک صندوق میں بند کر کے دار الامان میں سلطان مرحوم و مغفور، (خدا اس کی قبر کو روشن کرے) کی قبر کے سرہانے رکھوا دیا تاکہ خدا تعالیٰ اپنے کرم بے پایاں سے میرے اس آقا اور مربی کو غریق رحمت کرے اور انہیں بھی اپنے (خاص) خزانے سے خوشی عطا کر کے میرے ولی نعمت کی طرف سے خوش کر دے۔

۲۰۔ اس کے علاوہ ایک عطیۂ الٰہی یہ بھی ہے کہ وہ دیہات یا زمین (جو لوگوں کے پاس) زمانۂ قدیم سے چلے آتے تھے لیکن گذشتہ دورِ حکومت میں ان سے چھن گئے تھے اور سرکاری دفتر کے ریکارڈ کی رو سے ان کے قبضہ اور تصرف میں نہ رہے تھے (ان کے متعلق ہم نے یہ حکم دیا کہ) جو کوئی ان کی ملکیت کا ثبوت شرعی عدالت میں پیش کرے وہ دیہات اور زمینیں یا جو کچھ بھی اس کی ملک ہو، اس پر قابض ہو جائے۔ سب تعریفیں اللہ

Marfat.com

کے لئے ہیں اور اسی کی توفیق سے ہم اس فضیلت کے مقام پہ ہیں اور حقداروں کو ان کے حق مل گئے ہیں۔

۲۱۔ اس کے علاوہ ہمیں توفیق ملی کہ ذمیوں کو دین ہدیٰ کی طرف رغبت دلائیں۔ ہم نے یہ اعلان کیا کہ کافروں میں سے جو بھی کلمۂ توحید پڑھ کر دینِ اسلام قبول کرے گا، جیسا کہ شریعت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم میں آیا ہے، اس سے جزیہ ہٹا لیا جائے گا۔ یہ آواز سب کے کانوں تک پہنچا دی اور ہندوؤں نے فوج در فوج اور گروہ در گروہ آکر اسلام قبول کیا اور اسی طرح آج تک وہ ہر طرف سے آکر ایمان لاتے ہیں، ان سے جزیہ ہٹا لیا جاتا ہے اور وہ انعام اور خلعت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ الحمد للہ رب العالمین۔

۲۲۔ اس کے علاوہ یہ بھی خدا کی عنایت ہے کہ ہمارے عہد حکومت میں خدا کے بندوں کا مال و دولت ہر طرح سے محفوظ و مامون ہے اور ہم یہ روا نہیں رکھتے کہ کسی کی ملکیت سے تھوڑی سی بہت یا معمولی اور قلیل مقدار ہی چھین لی جائے، بہت سے بہکانے والے ہمارے پاس آکر چغلیاں لگاتے ہیں کہ فلاں تاجر کے پاس اتنے لاکھ اور فلاں عہدیدار کے پاس اتنے لاکھ کی رقم ہے۔ ہم نے سزا اور عقوبت سے چغلخوروں کی زبانیں بند کر دی ہیں تاکہ لوگ اس طبقہ کے شر سے محفوظ رہیں۔ بلاشبہ اب سبھی لوگ ہماری شفقت سے مجبور ہو کر ہمارے گرویدہ اور مخلص دوست بن گئے ہیں۔

قطعہ

نام نیکو طلب، کہ گنج سخا — بہتر از گنج خواستہ صد بار
یک تنا بہ کہ چند خرمن گنج — یک دعا بہ کہ مال صد خروار

Marfat.com

اس کے علاوہ یہ کہ خدا کی عنائت سے ہمارے دل میں فقیروں اور مسکینوں کی تواضع اور ان کی دلداری جاگزین ہو چکی ہے۔ ہم جہاں بھی کسی فقیر یا گوشہ نشین کو پاتے ہیں۔ اس سے ملنے کے لئے چل کر جاتے ہیں اور اس سے دُعا کی درخواست کرتے ہیں۔ (سنا ہے کہ) "سب سے اچھا امیر وہ ہوتا ہے جو فقیر کے دروازے پر جاتا ہے"۔ کیا عجب کہ ہمیں بھی یہ رُتبہ مل جائے۔

۲۴۔ اس کے علاوہ یہ کہ سرکاری ملازمین میں سے جو بھی عمر طبعی پاتا اور اور بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ہم اس کا وظیفہ مقرر کر کے اُسے سبکدوش کر دیتے ہیں۔ (وقتِ وداع) ہم اُسے یہ نصیحت کرتے ہیں کہ اب آخرت کی تیاری میں مشغول ہو جاؤ اور جن منکراتِ دین و شرع کا جوانی میں ارتکاب کیا تھا ان سے تائب ہو کر دنیا سے مُنہ موڑ لو اور آخرت کے معاملات کی طرف دھیان رکھو۔

رُباعی

چون پیر شدی، کار جوان نتوان کرد
پیرلیست نہ کافری، نہان نتوان کرد
در ظلمت شب ہر آنچہ کردی کردی
در روشنیٔ روز ہمان نتوان کرد،

۲۵۔ اس کے علاوہ

قطعہ

طریق درسلم صاحب دولت آنست کہ بنوازند مردان نکو را،
وگر چون عمر آمکس منقضی شد نکو دارند فرزندان او را،

Marfat.com

اشعار بالا کے مصداق جو بالا زمانِ (شاہی) جاہ و منصب رکھتے ہیں، جب تقدیرِ الٰہی سے وہ اس دارِ غرور سے دارِ سرور میں چلے جاتے ہیں، ان کا جاہ و منصب اِن کے فرزندوں کو اس طرح عطا کرتے ہیں کہ ان کے آباء کو جو عزت اور آسائش میسّر تھی اس میں کمی نہ ہو۔

قطعہ

رسم و آئین پادشاہان است — کہ خردمند را عزیز کنند

در پسِ عہدِ او، وفاداری — با خردمند زادہ نیز کنند

۲۶۔ مزید براں، سب سے بڑی اور بہتر نعمت جو خداوند کریم جل جلالہٗ وعم نوالہٗ نے اس بندے کو بخشی ہے وہ خلیفۂ وقت ابنِ عمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت، دوستی، خیرخواہی اور فرمانبرداری ہے، اور یہی (ہماری) حکومت کے قانونی ہونے کا ثبوت ہے۔ کسی (حاکم) کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ خلیفہ کا خادم ہونے کا شرف حاصل نہ کرے اور اس کے دربارِ عالیہ سے منشور حاصل نہ کرے۔ خدا نے (ہمیں) اس کی توفیق دی اور اس کے متعلق (ہمارا) عقیدہ بہت پختہ ہے۔ دربارِ خلافت سے ہمیں اذنِ مطلق اور خلیفہ کی نیابت کا منشور عطا ہوا ہے اور اعلحضرت امیرالمومنین نے جس منشور میں ہماری بیعت کی قبولیت کا ذکر کیا ہے اس میں ہمیں "سید السلاطین" کے خطاب سے بھی مشرف کیا ہے۔ اُنھوں نے دربارِ خلافت سے پے در پے ہم پر جو نوازشات کی ہیں ان میں خلعت، عمامہ، علم، خاتم، تلوار اور قدم شریف شامل ہیں، ان سے دنیا داول پر بزرگی اور شان ظاہر ہوتی ہے۔

یہ باتیں اس لئے لکھی ہیں کہ خدا تعالیٰ کی عنایات کا ذکر کیا جائے

Marfat.com

اور اس کے انعام و اکرام کے ہزارویں حصّے میں سے ایک حصّہ اور کثیر میں سے حقیر سی بات کا شکر ادا کیا جائے۔

اس کے علاوہ یہ کہ جو لوگ کارِ خیر اور نیکی کے خواہشمند ہیں، وہ اس کا مطالعہ کر کے یہ جان لیں کہ یہی مستحسن طریقہ ہے، اور پھر مروّت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اس پر کاربند ہونے کی سعادت حاصل کریں۔ انہیں اپنے اعمال کا ثواب اور ہمیں نیکی کی رغبت دلانے کا اجر ملے گا۔ نیکی کی طرف بلانا گویا نیکی کا کام کرنا ہے۔

تمام شد

Marfat.com

اِسلامی ہندوستان میں سکّوں پر شاعری

قرونِ وسطیٰ میں شعر و ادب اپنی منزلِ شباب پر تھے، فردوسی، عمر خیام، شیخ سعدی، خواجہ حافظ، انوری اور امیر خسرو اسی دور کی یادگار ہیں، شاعروں کا کلام آناً فاناً ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پھیل جاتا تھا، جب تجارتی قافلے ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے تو علم و ادب کی متاعِ گراں بہا بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ ان ایام میں علم و ادب کو جو ترقی نصیب ہوئی اس کی نظیر آج تک نہ مل سکی، شاعری کا اثر جہاں علوم و فنون پر ہوا وہاں معاشی زندگی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، برتنوں پر شعر، دسترخوانوں پر شعر، در و دیوار پر شعر، تلواروں کے دستوں پر شعر، کمربند پر شعر، قبروں پر شعر حتیٰ کہ سکّوں پر بھی شعر منقوش ہونے لگے۔

برِّصغیر ہند و پاکستان میں اسلامی شان و شوکت کا پرچم باقاعدہ طور پر سلطان شہاب الدین محمد غوری نے لہرایا، سکّہ و خطبہ اس کے نام کا جاری ہوا، سلطان نے جو سکے اس ملک میں جاری کئے ان پر سلطان کے نام نامی کے علاوہ ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق

Marfat.com

لیظھرہٗ علی الدین کلہ منقوش تھا۔[1] سبحان اللہ کیا پاک اور مقدس دین ہے جس میں شخصی اقتدار کی گنجائش ہی نہیں، اگر توصیف و تعریف ہے بھی، تو فقط اللہ تعالیٰ اور ہادیٔ برحق کی، حق تو یہ ہے کہ ہلالی نے یہ شعر کہہ کر خودستائی کے لئے جگہ ہی باقی نہیں چھوڑی۔

محمدؐ عربی کآبروئے ہر دو سراست
کسے کہ خاکِ درش نیست خاکِ برسرِ او

اس لئے کسی نے اپنی مدح میں کلمات سکوں پہ کندہ کروانے مناسب ہی نہیں سمجھے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام کا ہی سکہ چلتا رہا۔ جب سلطان محمد غوری نے پرتھوی راج کو ۱۱۹۲ء میں شکست دے کر دہلی اور اجمیر پر قبضہ کر کے باقاعدہ حکومتِ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی تو بعض خوشامدیوں نے سلطان کی خدمت میں عرض کی کہ قبلۂ عالم جو کام سلطان محمود غزنوی ترک حملوں میں سرانجام نہ دے سکا وہ حضورِ والا نے دوسرے ہی حملہ میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ اب اس فتح کی خوشی میں جشنِ شاہانہ منعقد کرنا چاہیئے، چنانچہ اس تجویز پر عمل ہوا، اس جشن پر جو یادگاری سکے رائج ہوئے ان پر یہ بیت کندہ تھی۔

تا بدار الضرب مہر و ماہ باد
سکۂ شہاب الدین محمد شاہ باد

مسٹر ٹائیلر نے سلطنتِ گجرات کے سکوں پر انگریزی میں ایک کتاب

---

[1] (i) ایڈورڈ تھامس، دی کرانیکلز آف دی پٹھان کنگز آف دہلی، مطبوعہ لندن ۱۸۷۱ء، ص ۱۲
(ii) نیلسن رائٹ، دی کوئن ایج اینڈ میٹرولوجی آف دی سلطانز آف دہلی، مطبوعہ دہلی ۱۹۳۶ء، ص ۵

Marfat.com

لکھی ہے جس میں آپ رقمطراز ہیں کہ غیاث الدین احمد شاہ والئے گجرات نے اول بار سرزمین ہند میں سکوں پر شعر مضروب کروائے تھے، ان کا یہ قول حقیقت سے بعید ہے، غیاث الدین محمد شاہ کا عہد حکومت ۸۴۶ھ سے ۸۵۵ھ تک ہے اور سلطان شہاب الدین کو انتقال کئے اس وقت ڈھائی سو سال گذر چکے تھے، میرے قول کی تصدیق تاریخ افغانان بستیات جالندھر سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں اس سکے کی عبارت مع شعر موجود ہے۔

سلطان محمد غوری کے بعد کسی سلطان نے اپنے سکوں پر شعر منقوش نہیں کروائے، محمد بن تغلق نے اپنے سکوں پر جو عبارات کندہ کروائی تھیں وہ بذات خود اشعار کا لطف دیتی ہیں[۲]

المجاھد فی سبیل اللہ	محمد بن تغلق شاہ
السلطان ظل اللہ	محمد بن تغلق شاہ
الواثق بنصر اللہ	محمد بن تغلق شاہ
الملك والعظمۃ للہ	محمد بن تغلق شاہ

سلطان محمد بن تغلق کے بعد سلاطین کے عہد حکومت میں اس کی نظیر نہیں ملتی، مغلوں کی آمد کے بعد برصغیر ہند و پاکستان کی تاریخ میں

۲۔ i۔ ایضاً، ص ۱۳۷،

ii۔ ابوالظفر ندوی، تاریخ گجرات، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء ص ۴۰۱

iii۔ ڈاکٹر مہدی حسین، تغلق ڈائی نسٹی، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۶۳ء ص ۵۰۹

iv۔ ڈاکٹر مہدی حسین، دی رائز اینڈ فال آف محمد بن تغلق، مطبوعہ لندن ۱۹۳۸ء ص ۲۳۲

v۔ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء ص ۳۸۲

Marfat.com

اب ایک نئے باب کا آغاز ہوا، بابر کی تخت نشینی سے قبل ہندوستان میں جو معیاری سکہ رائج تھا اُسے ٹنکہ کہتے تھے، اب بھی بنگالی زبان میں روپے کو ٹکہ کہتے ہیں جو ٹنکہ کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ تیموریوں کے ہاں "شاہرخی" مُروّج تھی، اس کی چاندی نسبتاً خالص تھی اس لئے بے حد مقبول ہوئی۔ جب بابر تختِ ہندوستان پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے اس خوشی میں اپنے دلِ پسند اور محبوب شہر کابل کے ہر چھوٹے بڑے فرد کو ایک ایک شاہرخی ارسال کی۔ اس کی تفصیل ابو القاسم ہندو شاہ فرشتہ کی زبانی سنیے:[۳۳]

"برائے ہر یک از مردم شہر کابل از مرد و زن و از بندہ و آزاد و خورد و بزرگ و از فقیر و غنی یک شاہرخی کہ یک مثقالِ نقرہ باشد بسر شماری فرستادہ۔"

بابر کو موت نے مہلت نہ دی کہ وہ سکوں میں کوئی اصلاح کر سکتا۔ اس کے جانشین اور تساہل پسند بیٹے ہمایوں نے شیر خان کے مقابلہ میں سلطنت کی بازی ہار دی، شیر خان، شیر شاہ کے لقب سے سریر آرائے مسند ہوا اور اپنی نیک اصلاحات کے لئے نیک نام ہوا۔ اس نے شاہرخی کی بجائے روپیہ جاری کیا۔ روپیہ کے متعلق علامی ابو الفضل، آئینِ اکبری میں رقمطراز ہے:[۳۴]

"در زمانِ شیر خان پدید آمد ---"

شیر شاہ، شاید کرنسی میں مزید اصلاحات کرتا لیکن اُسے بھی موت نے

---

[۳۳] فرشتہ، گلزارِ ابراہیمی، جلد اوّل، مطبوعہ بمبئی ۱۸۳۲ء، ص ۳۸۲

[۳۴] ابو الفضل، آئینِ اکبری، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۲ء، ص ۲۶

Marfat.com

مہلت نہ دی اور اس کے جانشینوں نے شیر شاہ کی جیتی ہوئی بازی ہمایوں کے مقابلہ میں ہار دی، ہمایوں بھی چند ماہ بعد پُرانے قلعہ کی مشہور عمارت شیر منڈل سے گر کر راہی ملک بقا ہوا اور اس کا بیٹا اکبر اس کا جانشین ہوا۔

مغلیہ حکومت کی نشاۃ ثانیہ دراصل اکبر کی تخت نشینی سے شروع ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس کے دربار میں ہر فن کے ارباب کمال اکٹھے ہو گئے تھے جو شاید ہی کسی دوسرے تاجدار کو میسّر آئے ہوں، ابوالفضل، فیضی، عرفی، نظیری اور خانخانان اسی دور کے آسمانِ ادب کے درخشندہ ستارے ہیں، دربار کا رنگ ہر چیز پہ غالب آگیا۔ کرنسی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، آئین اکبری میں ابوالفضل مغلیہ حکومت کی کرنسی کے ضمن میں رقمطراز ہے کہ بادشاہ کے حکم سے مولانا مقصود نامی ایک کاریگر نے ایک خاص وزن کی اشرفی تیار کی، اس کا نام "شاہنشاہ" تجویز ہوا۔ اس کا وزن ایک سو ایک تولہ نو ماشہ اور سات رتی تھا اس پہ اللّٰہ یرزق من یشاءُ بغیر حساب کے ساتھ خلفائے راشدین کے اسمائے مبارک اور السلطان المعظم الخاقان المعظم خلد اللّٰہ ملکہ و سلطنتہٗ کے شاہی القابات بھی منقوش تھے، بادشاہ کو یہ سکے کچھ اچھے نہ لگے چنانچہ اس کے ایما پہ ملا احمد علی نے نئے ڈیزائن کا "شاہنشاہ" بنا کر اس کی خدمت میں پیش کیا، اس پہ ملک الشعراء کی یہ دو رباعیاں منقوش تھیں[۵]

خورشید کہ ہفت بحر از و گوہر یافت   سنگِ سیہ از پرتو آن جوہر یافت
کان از نظر تربیت او زر یافت   و آن زر شرف از سکہ شاہ اکبر یافت

---

[۵] ایضاً، ص ۲۴

ایضاً

این سکہ پیرایۂ امید بود   بانقش دوام و نام جاوید بود
سیمائے سعادتش ہمین بس کہ بدہر   یک ذرہ نظر کردہ خورشید بود

"شاہنشاہ" سے نصف قیمت کا سکہ "رہاس" کہلاتا تھا، اس کے تمام نقش ونگار تو "شاہنشاہ" ہی کی مانند تھے لیکن اس پہ مندرجہ ذیل رباعی کندہ تھی[۶]

این نقد روان گنج شاہنشاہی   باکوکب اقبال کند ہمراہی
خورشید بہ پرورش ازآنرو کہ بدہر   یابد شرف از سکۂ اکبر شاہی

"رہاس" سے نصف قیمت کا سکہ "اُمۃ" کہلاتا تھا نقش ونگار تو اس کے بھی "شاہنشاہ" جیسے ہی تھے مگر اس پہ یہ رباعی منقوش تھی[۷]

این سکہ کہ دست بخت را زیور باد   پیرایۂ نُہ سپہر و ہفت اختر باد
زرین نقدیست کار ازو چون زر باد   در دہر روان نام شاہ اکبر باد

مسٹر ٹامیس نے اکبر کے ایک خاص سکے کا ذکر کیا ہے جو فقط برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے، اس پہ جو شعر منقوش ہے وہ مسٹر لین پول نے بدقت یوں پڑھا ہے۔

ز دست از مہر اکبر بادشاہ نور
بہ آن نام شہ نورٌ علیٰ نور

اکبر نے نصف صدی تک ہندوستان پہ حکومت کرنے کے

---

۶ ایضاً۔ ص ۲۴   ۷ ایضاً، ص ۲۴

بعد، ۱۷ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اس کی وفات کے وقت صرف آگرہ کی ٹکسال میں جو مال و دولت موجود تھا اس کی تفصیل جو خافی خان نے پیش کی ہے وہ یہاں لکھنی بے جا نہ ہو گی، خافی خان رقمطراز ہے[۵۸]:

"دہ کرور روپیہ را اشرفی یازدہ ماشہ و سیزدہ ماشہ و چہار دہ ماشہ سوائے اشرفیہائے کلان کہ از صد تولہ تا پانصد تولہ ہزار اشرفی در خزانہ موجود بود، و صد و ہفتاد و دو من طلائے غیر مسکوک و سہ صد و ہفتاد من نقرہ و یک من جواہر خاصہ کہ قیمت آن از سہ کرور روپیہ بود تجاوز نمودہ بود برآمد۔"

اس سے ملک کی اقتصادی حالت کا اچھا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جہانگیر ۲۴ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو سریر آرائے اورنگ ہوا۔ وہ مست الست بادشاہ تھا، فارسی ادب میں یوں تو سبھی تیموری حکمران بہت اونچا درجہ رکھتے تھے لیکن بقول علامہ شبلی مرحوم جہانگیر اجتہاد کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کی تزک فارسی ادب کی کتابوں میں سرفہرست شمار کی جاتی ہے، اس نے فن سکہ سازی میں اپنے باپ کو بھی مات کر دیا۔ تخت نشین ہوتے ہی بقول خافی خان اس نے یہ حکم صادر فرمایا[۵۹]:

شبیہ بادشاہ را بر پارچہ طلائے بوزن یک تولہ مسکوک ساختہ طرف دیگر صورت شیر کہ مرکوب آفتاب باشد نمایان نمودہ، با مرائے مقرب و فدویان خاص دہند کہ باعزاز بر سر دستار یا روئے سینہ بجائے حرز جان

---

۵۸ خافی خان، منتخب اللباب، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء، ص ۲۴۳

۵۹ ایضاً۔ ص ۲۷۲

نگاہ مے داشتہ باشند" ان پہ یہ بیت بھی منقوش ہوئی۔

قضا بہ سکّہ زر کرد تصویر

شبیہہ حضرت شاہ جہانگیر

جہانگیر نے ۱۰۲۳ھ میں آگرہ کی ٹکسال میں ایک نیا سکہ مضروب کروایا، اس پہ یہ شعر منقوش تھا۔

حروف جہانگیر و اللہ اکبر　　ز روز ازل در ابد شد برابر

اس کے کچھ عرصہ بعد ایک اور سکہ ڈھالا گیا۔ اس پہ یہ بیت کندہ تھی۔

شاہ سلطان سلیم شاہ اکبر

ملک الملوک سکہ زد بر زر

جہانگیر ۱۰۲۷ھ میں مانڈو سے ہوتا ہوا کھمبائت پہنچا تو گجرات کے صوبہ دار نے اس کی آمد کی خوشی میں نئے سکے ڈھلوائے جن پہ یہ بیت منقوش تھی۔

بزر این سکہ زد شاہ جہانگیر ظفر پرتو

پس از فتح دکن آمد چو در گجرات از مانڈو

اس واقعہ کے چھ سال بعد احمد آباد کی ٹکسال سے ایک اور سکہ جاری ہوا جس پہ یہ شعر کندہ تھا۔

الٰہی تا جہان باشد روان باد

بشرق و غرب مُہر احمد آباد

ایک بار جہانگیر اجمیر گیا تو وہاں کے صوبہ دار نے اس کی آمد پہ جو سکے جاری کیے ان پہ یہ بیت منقوش کروائی۔

جہان فروز باجمیر گشت سکہ زر　　ز نور نام جہانگیر شاہ، شاہ اکبر

Marfat.com

اس کے عہد میں الٰہ آباد سے جو سکے جاری ہوئے ان پر یہ شعر کندہ تھا۔

ہمیشہ زر زر سکہ الٰہ آباد
ز نام شاہ جہانگیر شاہ اکبر آباد

اسی طرح اس کے زمانے میں برہانپور سے جو سکے جاری ہوئے ان پر یہ بیت منقوش تھی۔

سکہ زد در شہر برہانپور شاہ دین پناہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابنِ اکبر بادشاہ

جہانگیر کے عہدِ حکومت میں اکبر نگر (موجودہ راج محل) میں بھی شاہی ٹکسال موجود تھی۔ وہاں سے جو سکے جاری ہوئے ان پر یہ شعر کندہ تھا۔

سکہ در اکبر نگر زد شاہ گردوں بارگاہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

اس ٹکسال سے ایک اور سکہ بھی جاری ہوا، اس پر یہ بیت منقوش تھی۔

روی زر را ساخت نورانی برنگ مہر و ماہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابنِ اکبر شاہ

۱۰۲۰ھ میں احمد آباد کی ٹکسال سے ایک سکہ جاری ہوا اس پر یہ بیت کندہ ہے:۔

زر احمد آباد را داد زیور
جہانگیر شاہِ شہنشاہ اکبر

اسی ٹکسال سے ایک اور سکہ جاری ہوا جس پر یہ بیت موجود ہے۔

سکہ زد در احمد آباد از عنایات الٰہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

Marfat.com

اسی ٹکسال کا ایک اور سکہ بھی ملتا ہے جس پہ یہ شعر موجود ہے۔

بہفت کشور این زر ہمیشہ باد روان
زنقشش نام جہانگیر بادشاہ جہان

اتفاق سے اسی ٹکسال میں ایک اور سکہ ڈھالا گیا جس پہ یہ شعر منقوش ہے۔

مالک الملک سکہ زد بہ زر
سلیم شاہ سلطان شاہ اکبر

جہانگیر کو نور جہاں کے ساتھ جو محبت تھی اس کا ثبوت اس نے اپنے سکہ پہ یہ شعر منقوش کروا کے رہتی دنیا تک باقی رکھا ہے[۱]

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور
بنام نور جہان بادشاہ بیگم زر

"نور جہانی" سکے اب نایاب ہو گئے ہیں، اس کے متعلق مؤرخین لکھتے ہیں کہ شاہ جہان نے تخت نشین ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ ایسے تمام روپے جن پہ نور جہاں کا نام کندہ تھا، جمع کر کے پگھلا ڈالے تھے۔

۱۰۱۹ھ میں جہانگیر نے آگرہ کی ٹکسال میں جو سکے ڈھلوائے ان پہ یہ بیت منقوش کروائی جو مشکل پڑھی گئی ہے۔

در اسفندار مر این سکہ را در آگرہ زد بر زر
شہنشاہ زمان شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

اسی ٹکسال سے ایک اور سکہ جاری ہوا جس پہ یہ بیت کندہ ہے۔

---

[۱] ا۔ ایضاً، ص ۲۶۸ ۱۱۔ وائٹ ہیڈ۔ کیٹلاگ آف دی کوئنز اِن دی پنجاب میوزیم لاہور، مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۱۴ء، ص ۱۲۸

Marfat.com

درمہر آبان بآگرہ سکہ زد ظل اللہ
شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر شاہ

آگرہ کی ٹکسال سے ۱۰۲۸ھ میں ایک اور سکہ جاری ہوا جس پہ یہ شعر منقوش ہے۔

یافت در آگرہ روئے زر زیور
از جہانگیر شاہ شاہ اکبر

جہانگیر کے عہد کا ایک نایاب سکہ ملا ہے جو ۱۰۱۱ھ میں آگرہ کی ٹکسال میں مضروب ہوا تھا، اس پہ یہ بیت کندہ ہے۔

سکہ زد در شہر آگرہ خسرو گیتی پناہ
شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

اسی طرح جہانگیر نے آگرہ کی ٹکسال سے ۱۰۲۰ھ میں ایک سکہ جاری کیا تھا، اس پہ جو شعر کندہ ہے وہ بارقت یوں پڑھا گیا ہے۔

بفروردین زر آگرہ فروزاں گشت چون اختر
ز نور سکہ شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

۱۰۲۶ھ میں مانڈو کے دارالضرب سے جو سکے ڈھل کر نکلے، ان پہ یہ بیت منقوش تھی۔

بنور جہانی دہد پہ تو چو مہر و ماہ
سکہ مندو زنام جہانگیر شاہ

جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ میں نے ایک خاص موقعہ پہ یہ حکم دیا کہ خاص اوزان کے سکے ڈھالے جائیں، ان کے نام بھی خود ہی تجویز کیے۔ صد تولہ کی اشرفی "نور شاہی" پچاس تولہ کی اشرفی "نور سلطانی"

Marfat.com

بیس تولہ کی اشرفی " نور دولت " دس تولہ کی اشرفی " نورِ کرم " پانچ تولہ کی اشرفی " رواجی " کے نام سے موسوم ہوئی ، اسی طرح چاندی کی صد تولہ کی مہر " کوکب طالع " پچاس تولہ کی مہر " کوکب اقبال " بیس تولہ کی مہر " کوکبِ مراد " دس تولہ کی مہر " کوکب بخت " پانچ تولہ کی مہر " کوکب سعد " اور ایک تولہ کی مہر " جہانگیری " کہلانے لگی ۔ دس تولہ اور اس سے بڑے سکوں پہ یہ بیت نقوش کروائی[11]

بخط نور بر زر کلکِ تقدیر
رقم زد شاہ نورالدین جہانگیر

دوسرے رخ پہ کلمہ طیبہ اور یہ بیت کندہ کروائی[12]

شد چو خورشید این سکہ نورانی جہان
آفتاب مملکت تاریخ آن

جہانگیر کے عہد میں لاہور کی دار الضرب سے جو سکے جاری ہوئے ان میں سے ایک پہ یہ شعر منقوش ہے ۔

ہمیشہ باد بر روئے سکہ لاہور
ز نام شاہ جہانگیر شاہ اکبر نور

اسی سال سے ۱۰۱۹ھ میں ایک سکہ جاری ہوا جس کی عبارت مسٹر وائٹ ہیڈ نے یوں پڑھی ہے ۔

در اسفندار مراین سکہ در لاہور زد بر زر
شہنشاہ امم شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

---

[11] جہانگیر ، تزک جہانگیری ، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء ۔ ص ۵ ،
[12] ایضاً ۔

Marfat.com

اسی سال کا اور اسی ٹکسال کا ڈھلا ہوا ایک اور سکہ بھی لاہور کے عجائب گھر میں موجود ہے جس پر یہ بیت منقوش ہے[۱۳]۔

در ماہ بہمن چو مہ الوزشد زر لاہور،
بدور شاہ نورالدین جہانگیر ابن شاہ اکبر

اسی ٹکسال کا بنا ہوا ایک اور سکہ دستیاب ہوا ہے جس پر یہ شعر کندہ ہے :-

بدھر باد روان تا فلک بود در دور
بنام شاہ جہانگیر سکہ لاہور

اسی ٹکسال سے سنہ ۱۰۲۰ھ میں ایک اور سکہ جاری کیا گیا۔ جس پر یہ بیت منقوش ہے۔

مہ اردی بہشت این سکہ در لاہور زد بہ زر
شہنشاہ زمان شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

لاہور کی ٹکسال سے سنہ ۱۰۳۰ھ ہجری میں ایک نیا سکہ جاری ہوا۔ اس پر جو بیت منقوش ہے وہ لاہور کے عجائب گھر کے فاضل کیٹیلاگر مسٹر وائٹ ہیڈ نے بدقت یوں پڑھی ہے۔

بماہ تیر در لاہور زد این سکہ را بر زر
ملک دین پناہ شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

۱۳۔ وائٹ ہیڈ، کیٹیلاگ آف دی کوئنز ان دی پنجاب میوزیم لاہور مطبوعہ آکسفورڈ سنہ ۱۹۱۴ء، ص ۱۵۶

Marfat.com

جہانگیر کے بعد اس کا بیٹا شاہجہان تخت نشین ہوا۔ یہ بڑے اچنبے کی بات ہے کہ اس کے سکوں پر شعر نہیں ملتے، شاہجہان کے بعد اورنگ زیب تخت نشین ہوا۔ اورنگ زیب کو شعر و شاعری سے فطرتاً نفرت تھی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس کے سکوں پر یہ شعر منقوش ہے۔[۱۴]

سکہ زد در جہان چو بدر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

منوچی اپنی شہرۂ آفاق تالیف "سٹوریا ڈو موگر" میں لکھتا ہے کہ جب شاہ ایران کو اس شعر کا پتہ چلا تو اس نے فی البدیہہ کہا۔[۱۵]

سکہ زد بر قرص پنیر
اورنگ زیب برادر کش پدر گیر

اورنگ زیب نے ۳ مارچ ۱۷۰۷ء کو وفات پائی، تو سب سے پہلے اس کے بیٹے کام بخش نے اپنی بادشاہت کا اعلان کرتے ہوئے جو سکے جاری کئے ان پر یہ بیت منقوش تھی۔

در دکن زد سکہ بر خورشید و ماہ
بادشاہِ کام بخش دین پناہ

اس کے بھائی محمد اعظم نے جو گجرات کا گورنر تھا ۱۵ مارچ ۱۷۰۷ء کو اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر اس نے جو سکے جاری کئے ان پر یہ شعر کندہ تھا۔[۱۶]

---

[۱۴] سکہ در ذاتی مجموعہ مسکوکات راقم الحروف

[۱۵] منوچی، سٹوریا ڈو موگر، جلد دوم، مطبوعہ لندن ۱۹۰۷ء۔ ص ۱۳۱

[۱۶] ایضاً، جلد چہارم، ص ۳۹۹

Marfat.com

سکہ زد در جہان بدولت وجاہ
بادشاہ ممالک اعظم شاہ

تیسرا بھائی محمد معظم کابل میں مقیم تھا۔ اس نے اپنے والد کی وفات کی خبر سنتے ہی دہلی کی جانب کوچ کیا، لاہور کے گورنر منعم خان نے معظم کی بروقت مدد کی۔ اسی اثنا میں معظم کا بیٹا عظیم الشان، جو بنگال کا صوبہ دار تھا، تیس ہزار فوج اور آٹھ کروڑ روپیہ لے کر باپ کی مدد کے لئے نکلا۔ دونوں نے ملکر اعظم کو آگرہ کے قریب شکست دی۔ اعظم مع اپنے دو بیٹوں، والاجاہ اور بیدار بخت کے میدان میں کام آیا۔ محمد معظم بہادر شاہ شاہِ عالم کے لقب سے تخت نشین ہوا، کام بخش کو بھی حیدر آباد کے قریب شکست ہوئی۔ شاہ عالم نے حکم دیا کہ آئندہ سکوں پر شعر کندہ نہ کئے جائیں۔

شاہ عالم تخت نشینی کے وقت بہت ضعیف ہو چکا تھا، پانچ سال حکومت کرنے کے بعد وہ ۲۷ فروری ۱۷۱۲ء کو راہی ملکِ بقا ہوا۔ اس کا بیٹا جہاندار شاہ، اپنے بھائیوں عظیم، خجستہ اختر اور رفیع الشان کو موت کے گھاٹ اتار کر تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے سکوں پر یہ بیت کندہ کروائی۔

در آفاق زد سکہ چون مہر و ماہ
ابو الفتح غازی جہاندار شاہ

اسے صرف گیارہ ماہ حکومت کی بہار دیکھنی نصیب ہوئی، بادشاہ گروں نے اس کی بجائے فرخ سیر کو بادشاہ بنایا۔ اس نے یہ بیت اپنے سکہ کی زینت بنائی۔

Marfat.com

سکہ زد از فضلِ حق بر سیم و زر
بادشاہ بحر و بر فرخ سیر

مسٹر اروِن لکھتے ہیں کہ میر جعفر زٹلی نے نارنول میں اس خبر کو سنتے ہی کہا؛[۱۱۰]

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ دانہ کش فرخ سیر

بعض روایتوں میں دانہ کش کی بجائے پشہ کش بھی دیکھنے میں آیا ہے، بادشاہ کو اس واقعہ کی خبر ملی تو اس نے فوراً میر جعفر زٹلی کی گرفتاری کے احکام صادر کیے، میر صاحب قبلہ دہلی لائے گئے جہاں انہیں تختہ دار پر چڑھایا گیا، بیچارے مذاق ہی مذاق میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

فرخ سیر کو بادشاہ گروں نے معزول کر کے نکو سیر کو سریر آرائے مسند کیا۔ اس نے جو روپے جاری کئے ان پر یہ شعر تھا۔

بزر زد سکہ صاحب قرانی
شہ نکو سیر تیمور ثانی

بادشاہ گروں کی اس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں مگر وہ پوری نہ ہو سکیں، اب ان کی نظر انتخاب رفیع الدرجات پر پڑی، اس نے تخت نشین ہوتے ہی جو روپے جاری کئے ان پر یہ شعر منقوش تھا؛[۱۱۱]

---

[۱۱۰] اروِن، لیٹر مغلز، مطبوعہ کلکتہ (سرکاری ایڈیشن)، ص ۳۹۹

[۱۱۱] وائٹ ہیڈ، ص ۳۱۱

سکہ زد بہند با ہزاران برکات
شاہنشہ بحر و بر رفیع الدرجات

بادشاہ نے اشرفیوں پہ کوئی دوسری بیت منقوش کروانا چاہی تو فتح خان افضل نے اس کی فرمائش پہ یہ بیت کہی جو پسند خاطر ہوئی۔

سکہ زد شاہ رفیع الدرجات
مہر بانند بایمین و برکات

رفیع الدرجات ابھی چند روز بہار جانفزا دکھا کر رخصت ہوا تو اس کی جگہ رفیع الدولہ شاہجہان ثانی کے لقب سے تخت طاؤس پہ بیٹھا۔ وہ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کی جگہ بادشاہ گردوں نے روشن اختر کو محمد شاہ کے لقب سے تخت ہندوستان پہ بٹھایا۔ اس نے اس موقع پر جو سکے جاری کئے ان پہ یہ شعر منقوش تھا۔

سکہ زد در جہان ز لطفِ الہ
بادشاہِ زمان محمد شاہ

محمد شاہ کے زمانے میں ہی ابراہیم نامی ایک غاصب نے چند روز کے لئے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اس موقع پہ اس نے جو سکے جاری کئے ان پہ یہ بیت کندہ کروائی۔

سکہ زد در جہان بفضلِ کریم،
شاہ شاہان محمد ابراہیم

۳۹ روز کی حکومت کے بعد اسے شکست فاش ہوئی، محمد شاہ حسبِ سابق حکومت کرنے لگا۔ اس نے بادشاہ گردوں کا زور توڑا اور ۱۷۴۸ء تک بلا شرکت غیرے ہندوستان پہ حکومت کرتا رہا۔

Marfat.com

محمد شاہ کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا، اس کا ایک سکہ لاہور کے عجائب گھر میں موجود ہے جس پر یہ بیت منقوش ہے۔

سکہ زد بر زر بفضل الہ
شاہ عالم پناہ احمد شاہ

۱۷۵۴ء میں عماد الملک نے مرہٹوں کی مدد سے عزیز الدولہ کو تخت پر بٹھایا، اس نے عالمگیر ثانی کا لقب اختیار کیا، اس کے عہد میں جو سکے مضروب ہوئے ان پر یہ شعر کندہ تھا۔

سکہ زد بہ ہفت کشور ہمچو تابان مہر و ماہ
شاہ عزیز الدین عالمگیر غازی بادشاہ

اس کے چند روز بعد ایک نیا سکہ مضروب ہوا جس پر یہ بیت منقوش تھی۔

بزر زد سکہ صاحب قرانی
عزیز الدین عالمگیر ثانی

شاہجہان آباد کی ٹکسال سے ۱۱۷۳ھ میں عالمگیر ثانی نے ایک سکہ جاری کیا جس پر یہ بیت منقوش تھی۔

سکہ زر یافت، روشن چو مہر و منیر
از نام شاہ جہان بادشاہ عالم گیر

اس کے عہد میں جودل کے ہندو راجہ نے بھی ایک سکہ جاری کیا، اس پر یہ شعر منقوش تھا۔[۱۹]

---

[۱۹] ایضاً، ص ۳۹۵

Marfat.com

خانہ رنجیت دیو آباد کرد
لچمی نرائن دل شاد کرد

عالمگیر ثانی کو اس کے وزیر غازی الدین نے کسی بات پہ ناراض ہوکر ۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء کو مروا ڈالا اور اس کی جگہ شہزادہ علی گوہر کو شاہ عالم ثانی کے لقب سے تخت ہندوستان پہ بٹھایا۔ وہ خود بھی شاعر تھا اور اس نے اپنے سکہ پہ جو بیت کندہ کروائی وہ اس کے ذوق شعری کی آئینہ دار ہے۔[۲۰]

سکہ زد بر ہفت کشور سایہ فضل الہ
حامی دین محمد شاہ عالم بادشاہ

شاہ عالم ثانی کے بعد بیدار بخت تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے سکوں کے لئے یہ شعر پسند کیا۔

سکہ زد بر زر وارث تاج و تخت
شاہ جہان محمد بیدار بخت

اس کے بعد اکبر شاہ ثانی نے عنان حکومت سنبھالی، وہ برائے نام بادشاہ تھا تمام ملک انگریزوں کے قبضہ میں آچکا تھا، صرف لال قلعہ کے اندر ہی اس کا حکم چلتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے سکوں پہ یہ شعر منقوش کرادیا۔

سکہ زد در جہان ز فضل الہ
حامی دین محمد اکبر شاہ

---

[۲۰] سکہ در ذاتی مجموعۂ مسکوکات راقم الحروف۔

Marfat.com

اکبر شاہ کا ایک اور سکہ بھی دستیاب ہوا ہے جس پر یہ بیت موجود ہے۔

بسیم و زر زدہ سکہ جہانبانی
چراغ دودۂ تیمور اکبر ثانی

اکبر شاہ کے جاتے ہی ۱۸۳۷ء میں عروسِ سخن کے گیسو سنوارتے ہوئے ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ ثانی تشریف لائے۔ اُنہوں نے اپنے نام سے جو روپے جاری کئے ان پر یہ شعر منقوش تھا۔

بسیم و زر زدہ شد سکہ بفضل الٰہ
سراج الدین ابوظفر شہ بہادر شاہ

ان کے زمانۂ حکومت میں انقلاب رونما ہوا اور انگریزوں نے مغلیہ حکومت کی بساط الٹ دی۔

مغلیہ حکومت کے زوال کے ساتھ ہی کابل اور اودھ میں دو نئی سلطنتیں قائم ہو گئیں جنہوں نے تادیر اس سرزمین پر پرچم اسلام کو سربلند رکھا۔ اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ نے ۱۲۶۴ھ میں جو روپے جاری کئے ان پر یہ بیت منقوش کروائی۔

سکہ زد بر سیم و زر از فضلِ تائید الٰہ
ظلِ حق واجد علی سلطان عالم بادشاہ

احمد شاہ ابدالی نے شاہ جہان آباد کی مہمات سے اپنے دوران قیام ہندوستان میں جو روپے جاری کئے ان پر یہ بیت منقوش تھی۔[۵۲۱]

۵۲۱۔ i۔ سکہ در ذاتی مجموعۂ مسکوکات راقم الحروف
ii۔ گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، مطبوعہ مدراس ۱۹۵۹ء ص ۳۶۵

Marfat.com

حکم شد از قادر بیچون با احمد پادشاہ
سکہ زن بر سیم و زر از اوج ماہی تا بماہ

میرے ذاتی مجموعہ میں احمد شاہ ابدالی کے جو سکے موجود ہیں ان میں سے ایک پر یہی شعر اور سنہ جلوس میمنت مانوس ۱۴ درج ہے۔ یہ سکہ آنولہ کی ٹکسال سے جاری ہوا تھا، ابدالی ۱۷۴۷ء میں تخت نشین ہوا تھا، اس میں ۱۴ جمع کئے جائیں تو ۱۷۶۱ء بنتا ہے اور یہ وہی سال ہے جس میں مرہٹوں کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر وہ دواب میں داخل ہوا تھا۔

احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی جنگ جیت کر خواجہ عبید اللہ کو لاہور کا گورنر مقرر کیا اور خود افغانستان لوٹ گیا۔ اس کے پنجاب سے جاتے ہی سکھوں نے لاہور پر یورش کر دی اور جسا سنگھ کی سرکردگی میں شہر فتح کر لیا۔ اس کی تفصیل ذرا میر غلام علی آزاد کی زبان سے سنئے ــ

"قوم سکھ بکسر سین مہملہ و تشدید کاف تازی ساکن صوبہ پنجاب کہ از قدیم الایام خمیر مایۂ فتنہ و فساد اند و با اسلامیان عداوت و تعصب شدید دارند تا آنکہ معائنہ کردہ بودند کہ شاہ چندین مرتبہ ہندوستان را پی سپر ساخت از راہ نا عاقبت اندیشی علم بغی و شورش افراشتہ نائب شاہ را در لاہور کشتند و جسا سنگھ نامی را از قوم خود بپادشاہی برداشتہ دلیرانہ بر مسند جم نشاندند و روپی سکہ را بنام او سیاہ کردند"[۲۲]

جسا سنگھ نے جو سکے مضروب کروائے ان پر یہ بیت منقوش تھی[۲۳]

۲۲۔ میر غلام علی آزاد، خزانۂ عامرہ، مطبوعہ نولکشور پریس کانپور، ص ۱۱۴

۲۳۔ i۔ کننگھم، ہسٹری آف دی سکھز، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۵ء، ص ۸۹

ii۔ خوشونت سنگھ، اے ہسٹری آف دی سکھز، جلد اول، مطبوعہ پرنسٹن ۱۹۶۶ء، ص ۵۲

Marfat.com

سکہ زد در جہاں بفضلِ اکال
تخت احمد گرفت جسا کلال

جسا سنگھ کے ساتھیوں میں سے جھنڈا سنگھ اور گنڈا سنگھ بگڑ بیٹھے کہ اس نے اپنا نام سکے پہ کیوں منقوش کروایا ہے حالانکہ وہ دونوں بھی لاہور کی فتح میں اس کے برابر کے شریک تھے، اس لئے فیصلہ ہوا کہ آئندہ سکوں پہ صرف گورو مہاراج کا نام کندہ ہوا کرے گا۔ اس فیصلہ کے بعد جو سکے جاری ہوئے ان پہ یہ بیت کندہ تھی[۲۴]

دیگ و تیغ و فتح و نصرت بیدرنگ،
یافت از نانک گورو گوبند سنگھ

احمد شاہ ابدالی کو خبر ملی کہ سکھوں نے اپنے سکوں پہ توہین آمیز کلمات منقوش کروائے ہیں تو اس نے برافروختہ ہو کر لاہور پہ حملہ کیا اور سکھ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۷۳ء میں انتقال کیا، اس کا بیٹا تیمور شاہ اس کا جانشین ہوا۔ اس کا ایک سکہ میرے پاس موجود ہے جس پہ یہ شعر منقوش ہے[۲۵]

چرخ می آرد طلاؔ و نقرہ از خورشید و ماہ
تا کند بر چہرہ نقش سکۂ تیمور شاہ

۲۴۔ سکہ در ذاتی مجموعہ مسکوکات راقم الحروف
از کننگھم، ہسٹری آف دی سکھز، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۵ء ص ۹۴
۲۵۔ سکہ در ذاتی مجموعہ مسکوکات راقم الحروف

اس کا ایک اور سکہ بھی دستیاب ہوا ہے جس پہ یہ بیت کندہ ہے[۲۶]

بعالم یافت سکہ تیمور شاہ نظام
بحکم خدا و رسول انام

تیمور شاہ نے بیس سال کی حکومت کے بعد ۱۷۹۳ء میں عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا اور اس کا بیٹا شاہ زمان تخت نشین ہوا۔ اس کا ایک درہم میرے ذاتی مجموعہ میں موجود ہے جس پہ یہ بیت کندہ ہے[۲۷]

قرار یافت بحکم خدائے ہر دو جہان
رواج سکہ دولت بنام شاہ زمان

سات سال بعد ۱۸۰۰ء میں اس نے وفات پائی اور اس کے نااہل جانشینوں نے بارک زئی امراء کے مقابلہ میں سلطنت کی بازی ہار دی اس کے بعد ایسی باتیں خواب وخیال بن کر رہ گئیں اور پھر کسی بھی حاکم کو اپنے سکوں پہ شعر مضروب کروانے کی توفیق نہ ہوئی۔

۲۶۔ گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی مطبوعہ مدراس ۱۹۵۹ء ص ۳۶۶

۲۷۔ از ہری رام گپتا ہسٹری آف دی سکھز، جلد سوم مطبوعہ لاہور ۱۹۴۴ء، ص ۴۔
از سکہ در ذاتی مجموعہ مسکوکات راقم الحروف۔

Marfat.com

اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی میں علما و مشائخ کا کردار

شاہ جہان کی تخت نشینی کے لئے اس کے بیٹوں میں جنگ ناگزیر تھی اس لئے وہ حصولِ تخت کے لئے علما اور عوام کی حمایت حاصل کرنے میں کوشاں تھے۔ تخت نشینی کے لئے جنگ اورنگ زیبؒ اور دارا شکوہ کے درمیان نہ تھی بلکہ اصل معرکہ راسخ العقیدہ اور آزاد خیال مسلمانوں، شریعت اور آزاد تصوف، وحدت الشہود اور وحدت الوجود، پابند شریعت نقشبندیوں اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ہردے رام کے نظریات کے درمیان تھا۔ اگر اورنگ زیبؒ اول الذکر گروہوں کا نمائندہ تھا تو دارا شکوہ موخر الذکر گروہوں کا علمبردار تھا۔ سامو گڑھ کی جنگ حصولِ تخت کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان کے آئندہ شاہنشاہ کی مذہبی حکمتِ عملی کا فیصلہ کرنے کے لئے لڑی گئی تھی۔

اورنگ زیب کے سوانح نگار ظہیر الدین فاروقی کے خیال میں ہندو اکبر جیسا بادشاہ تخت پہ دیکھنا چاہتے تھے اور مسلمان اس کوشش میں تھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ایسے حالات سے دوچار ہونے سے بچ جائیں۔[1]

---

[1] فاروقی، ظہیر الدین، اورنگ زیبؒ اینڈ ہز ٹائمز، مطبوعہ بمبئی ۱۹۳۵ء، ص ۲۸

Marfat.com

اس لئے فطری طور پر ہندوؤں نے داراشکوہ کی حمایت کی اور راسخ العقیدہ مسلمانوں نے اورنگ زیبؒ کا ساتھ دیا، کیونکہ "وہ راسخ العقیدہ اور پابند شریعت مسلمان تھا"[۲] مشہور مستشرق لین پول رقمطراز ہے کہ اسلام کی خدمت کے لئے اورنگ زیبؒ بڑا مستند اور سخت گیر نظر آتا ہے۔ اس نے بڑی سختی اور جرأت کے ساتھ اگر ایک طرف اکبر اور داراشکوہ کے وحدت الوجودی نظریات کے خلاف ردِ عمل شروع کیا تو دوسری طرف جہانگیر کی "نادر نوش" اور شاہجہان کی "عیش کوشی" پالیسی کے خلاف جنگ لڑی۔[۳]

جب داراشکوہ کے کفر و الحاد کی خبریں عوام کے کانوں تک پہنچیں تو قدرتی طور پر اس کا فائدہ اورنگ زیبؒ کو پہنچا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں کہ داراشکوہ میں ایسے آثار نظر آتے تھے کہ وہ بڑھ کر دوسرا اکبر ثابت ہوگا۔ اسے ولی عہد سلطنت سمجھا جاتا تھا اور امورِ سلطنت میں اسے اتنا دخل تھا کہ راسخ العقیدہ گروہ کی کوششیں اکثر اس کی وجہ سے کالعدم ہو جاتی تھیں۔ اس لئے وہ لوگ جو راسخ الاعتقادی کے مخالف تھے اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر سکتے تھے اور یہ امید بھی کر سکتے تھے کہ آئندہ کسی زمانے میں حکومت پر ان کا اقتدار قائم ہو جائے گا۔ راسخ الاعتقاد طبقے کی امیدیں اورنگ زیبؒ پر مرکوز تھیں جو اپنے عقائد و اعمال میں نہ صرف راسخ الاعتقاد تھا بلکہ زاہد و متقی بھی تھا۔ اس کی پارسائی اور اس کے کردار میں وہ تمام خوبیاں

---

[۲] لین پول، اسٹانلے، اے شارٹ ہسٹری آف انڈیا ان دی مڈل ایجز، مطبوعہ بمبئی ۱۹۱۷ء ص ۱۱۱

[۳] ایضاً۔

Marfat.com

موجود تھیں جو راسخ الاعتقادی کے خیر خواہوں کو اس کے گرد جمع کرنے کے لئے ضروری ہو سکتی تھیں۔[۴۷] شاہجہان کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خان نے بھی اورنگ زیبؒ کی حمایت پر کمر باندھی اور متعدد بار اس نے بھرے دربار میں اورنگ زیبؒ کی حمایت کی اور اسی وجہ سے اس نے دارا شکوہ کی ناراضگی مول لی۔ جب نواب موصوف نے اچانک وفات پائی تو بعض لوگوں نے دارا شکوہ پر زہر خورانی کا الزام بھی لگایا۔ شاہجہان کے راسخ العقیدہ درباری امراء نے بھی دارا شکوہ کے مقابلہ میں اورنگ زیبؒ کی حمایت کی۔[۴۸]

اورنگ زیبؒ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ کا بڑا معتقد تھا۔[۴۹] ان کے علاوہ وہ ان کے بھائیوں اور بیٹوں کا بھی بڑا لحاظ کرتا تھا۔ اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی کے فوراً بعد خواجہ محمد معصومؒ اور ان کے برادر بزرگ حضرت محمد سعیدؒ شاہی دربار میں باریاب ہوئے، اورنگ زیبؒ نے اس موقع پر تین سو طلائی مہریں پیش کیں۔[۵۰] اس کے بعد بھی اورنگ زیبؒ نے متعدد موقعوں پر خواجہ صاحبؒ کو اپنے دربار میں بلایا اور ہر بار ان سے بڑی عقیدت کے ساتھ پیش آیا۔[۵۱] ان کے صاحبزادوں کی بھی

۴۷۔ قریشی، اشتیاق حسین، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۷ء، ص ۲۰۵

۴۸۔ فاروقی، اورنگ زیبؒ اینڈ ہز ٹائمز، ص ۶

۴۹۔ زیڈ یوسف حسین، گلمپسز آف مڈیول انڈین کلچر، مطبوعہ بمبئی ۱۹۵۷ء، ص ۵۹

۵۰۔ مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد اول، مطبوعہ کانپور ۱۹۰۲ء، ص ۶۴۰

۵۱۔ الف۔ ابوالفتح، آداب عالمگیری، قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن، ایتھے ۳۱۷، ورق ۴۳۱ب

ب۔ محمد کاظم، عالمگیر نامہ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء، ص ۲۹۳

۵۲۔ محمد بقا، مرأت العالم، مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن، ایتھے ۱۲۴، ورق ۵۴۵ب

Marfat.com

شاہی دربار میں بڑی عزت کی جاتی تھی۔[۹] مرآت العالم کے مصنف کے بیان کے مطابق اورنگ زیبؒ نے اپنے چوتھے سال جلوس میں حضرت محمد سعیدؒ کو شاہی دربار میں بلایا اور ان کی بڑی تکریم کی۔[۱۰] ان کی باریابی کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ عبدالاحدؒ اور شیخ محمد فرخ اورنگ زیبؒ سے ملے اور رخصت کے وقت بادشاہ نے ان کی خدمت میں بڑے تحائف پیش کئے۔[۱۱] حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے شیخ محمد یحییٰؒ سے بھی اورنگ زیبؒ کی اکثر ملاقات رہتی تھی اور ہمیشہ انہیں نقد اور تحائف دیا کرتا تھا۔[۱۲]

اورنگ زیبؒ دہلی سے لاہور جاتے اور واپس آتے وقت سرہند میں خواجہ محمد معصومؒ اور خاندانِ مجددؒ کے دیگر افراد سے ملا کرتا تھا۔ عہدِ عالمگیر کے ایک ہندو مؤرخ ایشر داس نے اورنگ زیبؒ کے اٹھارویں سال جلوس کے واقعات میں خانقاہِ مجددیہ کے قریب لونکھا باغ میں بادشاہ کے قیام کا ذکر کیا ہے۔[۱۳] اورنگ زیبؒ نے خواجہ محمد معصومؒ سے متعدد بار استدعا کی کہ وہ سفر و حضر میں اس کے ساتھ رہا کریں، لیکن انہوں نے اپنے والدِ بزرگوار کی نصیحت کے مطابق بادشاہ کے ساتھ رہنا پسند نہیں فرمایا۔[۱۴] آپ نے اپنی جگہ اپنے فرزندِ پنجم حضرت سیف الدینؒ کو دہلی بھیج دیا جہاں وہ بقول محمد ساقی مستعد خان قلعہ کے اندر شاہی محل کے

---

۹ ایضاً، ۱۰ ایضاً، ۱۱ ایضاً، ۱۲ ایضاً۔ ۱۳ ایشر داس، فتوحات عالمگیری، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، ایڈیشنل ۲۳۸۸۴، ورق ۷۲ الف۔

۱۴ مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل، ص ۶۴۰

۱۵ محمد مراد، مناقب الحضرات، مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن، ایتھے ۶۵۲، ورق ۱۷۰ الف۔

Marfat.com

جوار میں رہنے لگے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ بادشاہ کاروبار سلطنت سے فارغ ہو کر رات گئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا۔[15] مآثر عالمگیری میں ایسی ہی ایک صحبت کی تفصیل درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیبؒ حضرت سیف الدینؒ سے توجہ لینے کے علاوہ ان کی نگرانی میں منازل سلوک بھی طے کیا کرتا تھا۔[16] تھوڑے ہی عرصہ میں بادشاہ نے سلوک کی کئی منازل طے کر لیں۔ حضرت سیف الدینؒ نے اپنے والد مکرم کے نام ایک خط میں بڑی مسرت کے ساتھ اس بات کا ذکر کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

> بادشاہ دین پناہ را در خدمتِ حضرت اخلاص بنوع دیگر است از ذکر لطائف و ذکر سلطانی گذشتہ بہ ذکر نفی و اثبات مقید است و ظاہر می سازد کہ بعضے اوقات خطرہ مطلقاً نمی آید و گاہے کہ می آید استقرار نمی کند۔ ازین راہ خیلے محفوظ است و می گوید کہ پیش ازین من از ہجوم خواطر دل تنگ بودم، و شکر این نعمت بجا می آرد۔[17]

حضرت سیف الدینؒ کے خط کے جواب میں خواجہ محمد معصومؒ نے جو خط تحریر فرمایا تھا وہ ان کے مکتوبات میں موجود ہے۔ خواجہ صاحبؒ نے اپنے مکتوب میں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا ہے۔ جس نے بادشاہ کو روحانی

---

[15] محمد ساقی مستعد خان، مآثر عالمگیری، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۱ء، ص ۸۴،

[16] ایضاً۔

[17] مکتوباتِ سیفیہ، مطبوعہ سعید آرٹ پریس حیدر آباد، مکتوب نمبر ۲، ص ۱۱۔

Marfat.com

مراتب عطا فرمائے ہیں ۔ اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کو ۔۔ فنا قلبی ۔۔ کا مقام حاصل ہو چکا تھا ، جو دلائت میں ایک اعلیٰ مقام سمجھا جاتا ہے ۔[۱۸]

اورنگ زیبؒ نے اپنے بارہویں سال جلوس میں اپنے بیٹے محمد اعظم کی شادی کی تو اس تقریب میں جو علماء و مشائخ موجود تھے ان میں حضرت سیف الدینؒ کا نام نامی بھی شامل ہے ۔[۱۹] اورنگ زیبؒ کے دل میں حضرت سیف الدینؒ کے برادر بزرگ اور خواجہ محمد معصومؒ کے جانشین خواجہ محمد نقشبندؒ کی بڑی عزت تھی ۔ ۱۰۹۰ھ میں آپ بادشاہ کے ساتھ موجود تھے ۔[۲۰] خواجہ محمد نقشبندؒ کے مکتوبات وسیلۃ القبول الی اللہ والرسول کے نام سے پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی سعی و کاوش سے دو جلدوں میں ۱۹۶۳ء میں حیدر آباد سے شائع ہو چکے ہیں ۔ اس مجموعہ میں خواجہ موصوف کے کئی خطوط بادشاہ کے نام موجود ہیں ، جن سے ان کے باہمی تعلقات پر کافی روشنی پڑتی ہے ۔ ۱۰۹۹ھ میں اورنگ زیبؒ کے حکم سے خواجہ موصوف کے صاحبزادے محمد عمرؒ کی شادی ابوالحسن تانا شاہ کی بیٹی کے ساتھ ہوئی ۔[۲۱] اگر روضۃ القیومیہ کی روایت پر اعتماد کیا جائے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ خواجہ محمد معصومؒ کے صاحبزادے حضرت محمد اشرفؒ اور بھتیجے

---

[۱۸] مکتوبات خواجہ محمد معصوم ، (اردو ترجمہ) مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۰ء ، مکتوب ۲۲۰ ، ص ۲۸۱ - ۲۸۰ ۔ [۱۹] محمد ساقی مستعد خان ، مآثر عالمگیری ، ۷۸ ۔

[۲۰] ایضاً ، ص ۲۷۶

[۲۱] ایضاً ، ص ۳۱۲

Marfat.com

شیخ سعد الدینؒ اورنگ زیبؒ کے زمانۂ شہزادگی میں اس کے ساتھ دکن میں مقیم تھے[۲۲] اور جب اورنگ زیبؒ دارا شکوہ کے مقابلہ پہ نکلا تو شیخ محمد اشرفؒ اس کی فوج میں موجود تھے۔[۲۳]

حضرت سیف الدینؒ نے بادشاہ کے ساتھ رہ کر ترویج شریعت اور احیائے سنت کے لئے بڑا کام کیا۔ موصوف کے خطوط کا مجموعہ مکتوبات سیفیہ کے نام سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی محنت اور کوشش سے حیدر آباد سے طبع ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ میں بادشاہ کے نام حضرت سیف الدینؒ کے دو درجن کے قریب مکتوبات موجود ہیں جن میں بادشاہ کی توجہ رفع بدعت اور احیائے سنت کی طرف مبذول کرائی گئی ہے۔ موصوف کی انہی خدمات کی بنا پر نقشبندی حلقوں میں آپ کو محی السنت کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔[۲۴] میری ناقص رائے میں یہ خاندانِ مجددؒ ہی تھا جس نے اورنگ زیبؒ کو محی الدین بنایا۔

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعد ان کے تیسرے صاحبزادے خواجہ محمد معصومؒ ان کے جانشین ہوئے۔ آپ اپنی علمیت، تقویٰ اور پرہیزگاری کی وجہ سے عوام میں بے حد مقبول تھے۔ اپنے والد کی طرح آپ بھی عمر بھر ترویج شریعت اور احیائے سنت کے لئے

۲۲۔ کمال الدین محمد احسان، روضۃ القیومیہ، رکن دوم، مطبوعہ لاہور ۱۳۳۵ھ، ص ۱۰۷

۲۳۔ ایضاً ۲۴۔ i۔ وکیل احمد، ہدیۂ مجددیہ، مطبوعہ دہلی ۱۳۰۹ھ، ص ۲۳۲

ii۔ مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد اول، ص ۶۴۶

iii۔ سید امام الدین۔ برکاتِ اولیاء، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۱۳۲

Marfat.com

کوشاں رہے۔ آپ کی اپنے مریدوں کو ہمیشہ یہی نصیحت ہوا کرتی تھی کہ وہ حتی الوسع سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلیں۔[۲۵] اپنے ایک مکتوب میں آپ اپنے ایک مخلص مرید مولانا محمد حنیفؒ کے نام تحریر فرماتے ہیں کہ ایک صوفی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کئے بغیر اپنے مقصود تک پہنچے۔[۲۶] اسی طرح آپ اپنے ایک دوسرے مرید محمد صدیقؒ کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مردہ سنت کو زندہ کرے تو اسے اُسے قیامت کے دن سو شہیدوں کا ثواب دیا جائے گا۔[۲۷] حضرت مجدد صاحبؒ کی طرح خواجہ محمد معصومؒ نے بھی اپنے مکتوبات میں ترویج شریعت اور احیائے سنت پر بہت زور دیا ہے۔

جب دارا شکوہ نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے اپنی دلچسپی ظاہر کی اور ان کے ترجمہ اور نشر و اشاعت میں سرگرمی دکھانے کے علاوہ اس نے ہندوؤں کے کئی عقائد بھی اپنا لئے تو مذہبی طبقوں میں اس کے خلاف ردِ عمل پیدا ہوا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تحریر فرماتے ہیں کہ دارا شکوہ کے تخت نشین ہونے کی صورت میں راسخ الاعتقاد گروہ کے لئے بہت خطرات درپیش تھے، کیونکہ اکبر کے آخری زمانے کے بعد سے اس گروہ کو جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی تھی وہ سب ملیامیٹ ہو جاتی۔ دارا شکوہ ہندو مت اور اسلام کے بالکل ایک ہونے پر پکا عقیدہ رکھتا تھا اور اس نے

---

[۲۵] مکتوبات حضرت معصومؒ (فارسی) مطبوعہ کانپور ۱۸۸۶ء مکتوب نمبر ۲۲، ۶۰، ۸۹، ۲۲۰۔

[۲۶] ایضاً، مکتوب نمبر ۲۲ [۲۷] ایضاً۔ مکتوب نمبر ۲۲۸

Marfat.com

اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی تھیں۔ اگر داراشکوہ بادشاہ ہو جاتا تو اس میں اور اکبر میں خاص فرق یہ ہوتا کہ اکبر کا دماغ تو رسمی تعلیم کے ذریعے تربیت یافتہ نہیں تھا اور داراشکوہ ایک لائق و فائق فاضل تھا اس طرح وہ راسخ الاعتقادی کے مفادات کو اور زیادہ نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ہمارے خیال میں اس موقع پر راسخ الاعتقاد مسلمان داراشکوہ کے اثر و رسوخ کو ختم کرنا اپنا فرضِ اوّلین سمجھنے لگے۔ انہی ایام میں خواجہ محمد معصومؒ اپنے ایک مرید حسن علیؒ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: "برادر عزیز! آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ان دنوں بدعات عام ہوتی جا رہی ہیں اور سنت پس پشت ڈالی جا رہی ہے۔ اس تاریک زمانے میں فوری اور اہم ترین کام، علومِ شریعت کی تحصیل اور ان کی نشر و اشاعت ہے۔ اسی طرح ترویجِ شریعت اور احیائے سنتِ نبویؐ بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کو چاہیئے کہ آپ علومِ شریعت کی نشر و اشاعت اور احیائے سنت کے لئے بڑھ چڑھ کر کوشش کریں"[۲۹] اسی طرح اپنے ایک مکتوب میں آپ مولانا جمال الدین کو نصیحت فرماتے ہیں کہ وہ پوری تندہی سے ترویجِ شریعت اور احیائے سنت کے لئے کام کریں[۳۰]۔

ان امثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خواجہ محمد معصومؒ ترویجِ شریعت اور احیائے سنت کے لئے کس قدر کوشاں رہتے تھے۔

---

[۲۸] برِ عظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۷ء، ص ۲۰۵

[۲۹] مکتوباتِ خواجہ محمد معصوم (فارسی) مطبوعہ کانپور ۱۸۸۷ء، مکتوب نمبر ۱۷۸

[۳۰] ایضاً، مکتوب نمبر ۱۷۷۔

Marfat.com

مفتی غلام سرور لاہوری کے قول کے مطابق آپ کے سات ہزار کے قریب خلفا اور نو لاکھ کے قریب مرید سلطنتِ مغلیہ کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے جو اپنے اپنے دائرۂ اثر میں اپنے پیر و مرشد کے مشن کی تکمیل میں دل و جان سے لگے رہتے تھے۔[۳۱] خواجہ محمد اعظم دیدہ مریؒ کی روایت کے مطابق عالمگیری فوج میں بھی آپ کے خلفا موجود تھے۔[۳۲] مناقب الحضرات کی روایت کے مطابق سینکڑوں کی تعداد میں خواتین اور امراء آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے جو گاہ گاہے آپ سے ملتے رہتے تھے۔[۳۳] علاوہ ازیں علما اور طلبا کا ایک جمِ غفیر ہمہ اوقات آپ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔[۳۴]

معتبر روایت کے مطابق خواجہ محمد معصوم کے نو لاکھ کے قریب مرید تھے جن میں سے سات ہزار کو خرقۂ خلافت عطا ہوا تھا۔[۳۵] شیخ محمد بقا رقمطراز ہیں کہ عہد جہانگیر میں ملک کے طول و عرض میں آپ کے بے شمار مرید پھیلے ہوئے تھے۔[۳۶] مغلیہ حکومت کے دائرہ اختیار سے باہر بھی آپ کے مریدوں کی کافی بڑی تعداد آباد تھی۔ جب آپ حجِ بیت اللہ کے لیے

---

۳۱ خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل، ص ۶۴۰۔

۳۲ تاریخ کشمیر اعظمی، مطبوعہ سری نگر ۱۸۸۶ء، ص ۱۶۲۔

۳۳ محمد مراد، مناقب الحضرات، (مائیکرو فلم عندی) ورق ۱۷۸ الف

۳۴ ایضاً۔

۳۵ رحمٰن علی تذکرۂ علمائے ہند، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۹۴ء ص ۶۱۲

۳۶ شیخ محمد بقا، مرآت العالم، ورق ۵۴ ب۔

Marfat.com

حجاز تشریف لے گئے تو وہاں بے شمار لوگوں نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔[۳۷] علاوہ ازیں آپ نے محمد صدیق بخاریؒ کو خرقۂ خلافت دے کر حرمین شریفین میں سلسلۂ عالیہ کی ترویج کے لئے بھیجا تھا۔[۳۸]

خواجہ محمد معصومؒ اور شیخ آدم بنوریؒ کے مریدوں کی اس قدر تعداد باعثِ تعجب نہیں، صرف اتنی سی بات ذہن میں رکھنی کافی ہے کہ حضرت مجددؒ الف ثانیؒ کی تعلیمات عام ہو رہی تھیں اور ان کا سلسلہ اندرون اور بیرونِ ملک آکاس بیل کی طرح پھیل رہا تھا۔ جن ایام میں ہندوستان کا شاہنشاہ اپنے دارالحکومت میں تختِ طاؤس پر بیٹھ کر وسطِ ایشیاء پر اپنا تسلط قائم رکھنے میں ناکام رہا، سرہند اور بنوڑ کے بوریہ نشین فقیر وسطِ ایشیاء کے باشندوں کے دلوں پر حکومت کر رہے تھے۔ اس کا اندازہ خواجہ محمد معصومؒ سرہندی اور شیخ آدم بنوریؒ کے خلفاء کی فہرستیں دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے جن میں اکثر و بیشتر نام ماوراء النہر والوں کے ہیں۔

اورنگ زیبؒ اپنے عنفوانِ شباب ہی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات سے متاثر ہو چکا تھا اور اس نے ان کے جانشین خواجہ محمد معصومؒ کے ساتھ تعلقات قائم کر لئے تھے۔ زمانہ شہزادگی میں اس کی خط و کتابت اکثر خواجہ صاحبؒ سے رہتی تھی۔ خواجہ صاحبؒ کے مکتوبات میں ایسے مکاتیب موجود ہیں جو "شاہزادۂ دین پناہ" کے نام لکھے گئے تھے۔[۳۹] جب خواجہ صاحب حجِ بیت اللہ کے ارادہ سے سورت

۳۷؎ مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل، ص ۶۴۰

۳۸؎ مکتوباتِ خواجہ محمد معصومؒ (اردو) مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۰ء، مکتوب نمبر ۶۴، ص ۲۲۷۔

۳۹؎ مکتوباتِ خواجہ محمد معصومؒ (فارسی) مکتوب ۴۰۶، ص ۱۱۳

Marfat.com

روانہ ہوئے تو اورنگ زیبؒ ان دنوں دکن میں مقیم تھا۔ اس نے اس موقعہ پر آپ کی ملاقات کو غنیمت جانا اور نربدا عبور کر کے آپ سے ملنے آیا اور آپ کی دعائیں حاصل کیں[۱۴۰]۔ مفتی غلام سرور لاہوری کی روایت کے مطابق آپ نے مدینہ منورہ میں روضہ رسولؐ پر اورنگ زیب کی کامیابی کے لئے دُعا کی تھی[۱۴۱]۔

"شہزادہ دین پناہ" کے نام ایک مکتوب میں خواجہ صاحبؒ اُسے جہاد شروع کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں ایک گھڑی کا جہاد حرم مکہ میں حجر اسود کے پاس لیلۃ القدر کے قیام سے افضل ہے[۱۴۲]۔

جب اورنگ زیبؒ برہانپور سے فوج لیکر نکلا تو خواجہ صاحب نے اُسے ایک خط ارسال کیا جس میں اُسے دار الحکومت پر فوج کشی پر تحسین پیش کی، اسی مکتوب میں آپ اُسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث یاد دلاتے ہیں جس میں اُنھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مجاہدوں کو اجرِ عظیم کی بشارت دی ہے[۱۴۳]۔ اس مکتوب سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ خواجہ محمد معصومؒ دارا شکوہ کے خلاف اورنگ زیبؒ کی یلغار کو محض تخت نشینی کے لئے شاہزادوں کی جنگ نہیں بلکہ جہاد سمجھتے تھے۔

---

۱۴۰ کمال الدین محمد احسان، روضۃ القیومیہ، رکن دوم، ص ۱۰۷

۱۴۱ خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل، ص ۶۴۰

۱۴۲ مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (فارسی) مکتوب نمبر ۶۴، ص ۱۱۲

۱۴۳

Marfat.com

سطورِ بالا سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ دارا شکوہ کے خلاف فوج کشی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خاندان اور ان کے عقیدتمندوں کی ہمدردیاں اورنگ زیبؒ کے ساتھ تھیں۔

دارا شکوہ، جسے اورنگ زیبؒ رئیس الملاحدہ، ملحدِ نامقبول اور ملحدِ نکو سیدہ فعال کہا کرتا تھا[۴۴]، کے مقابلہ پر نکلنے سے پہلے اورنگ زیبؒ نے ایک ماہ برہانپور میں فوجی تیاریوں میں بسر کیا[۴۵]۔ یہ شہر ان دنوں مغلیہ سلطنت کے آباد ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا اور عوام اُسے دار السرور کہا کرتے تھے[۴۶]۔ یہ شہر نقشبندیوں کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ حضرت مجددؒ الف ثانیؒ نے اپنے خلیفۂ اوّل میر محمد نعمانؒ کو نقشبندیہ سلسلہ کی ترویج کے لئے بُرہانپور بھیجا تھا[۴۷]۔ میر صاحبؒ ترکِ سکونت کر کے اکبر آباد چلے گئے تو ان کی جگہ حضرت مجددؒ نے خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ کو برہانپور بھیجا[۴۸]۔ خواجہ موصوف کے دو "شہزادہائے عالی مرتبہ" کے ساتھ بڑے خوشگوار تعلقات تھے اور ان کی فرمائش پر آپ نے متعدد غزلیں کہی تھیں جو ان کے دیوان میں موجود ہیں[۴۹]۔ مجدد الف ثانیؒ کے بعد یہ شہر خواجہ محمد معصومؒ

---

[۴۴] عنایت خان، عنایت نامہ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۴۱۰۔ ورق ۶۲ الف تا ۲۷ الف

[۴۵] محمد کاظم، عالمگیر نامہ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء، ص ۴۸۔

[۴۶] بھیم سین، نسخہ دلکشا، قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۲۳، ورق ۶ الف تا ب۔

[۴۷] محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات، مطبوعہ لاہور، ص ۲۱۹۔

[۴۸] ماہنامہ المعارف لاہور بابت ماہ مئی ۱۹۶۸ء ملاحظہ ہو راقم السطور کا مضمون بعنوان: خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ۔

[۴۹] این چار غزل را کہ در اول بیت بجان حرفِ آخر است در ردیف مشکل باشارہ شاہزادہائے عالی مرتبہ مدظلہم نظم نمودہ اند۔ دیوان خواجہ محمد ہاشم کشمی، مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن، مائیکرو فیلم عندی۔

Marfat.com

کی توجہ کا بھی مرکز رہا اور آپ نے اپنے متعدد خلفا کو عوام کی رشد و ہدایت کے لئے برہانپور روانہ کیا۔ ان خلفاء میں سے ابو المظفر صوفیؒ نے بڑا نام پایا۔ سید امام دین کے قول کے مطابق صوفی صاحبؒ برہانپور کے عوام میں بہت مقبول ہوئے اور بے شمار لوگ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔[۵۰] نقشبندیوں کے علاوہ دیگر سلاسل کے جو بزرگ برہانپور میں رہائش پذیر تھے انہوں نے بھی اورنگ زیبؒ کی حمایت کا اعلان کیا۔[۵۱]

اورنگ زیبؒ کی تعلیم و تربیت اس دور کے بڑے جیّد اور دیندار علما کی نگرانی میں ہوئی تھی اور وہ سب کے سب اپنے علم و تقویٰ کی بنا پر عوام میں بے حد مقبول تھے اور فطری طور پر انہوں نے داراشکوہ جیسے "رئیس الملاحدہ، ملحد نامقبول اور ملحد نکوسیدہ فعال" کے خلاف اورنگ زیبؒ کا ساتھ دیا تھا۔ منوچی لکھتا ہے کہ اورنگ زیبؒ کا ایک استاد شیخ میرک خوانی ۱۶۵۹ء میں اجمیر کے قریب داراشکوہ کے خلاف لڑتا ہوا میدانِ کارزار میں کام آیا۔[۵۲]

شیخ آدم بنوریؒ نے اپنی وفات سے کافی عرصہ پہلے اپنے مریدوں کو اورنگ زیبؒ کی حمایت کرنے کی نصیحت فرمائی تھی۔[۵۳] شاہ نعمت اللہ دہلویؒ کے اخلاف میں سے خلیل اللہ خان نے اپنے ساتھیوں سمیت جنگ تخت نشینی

---

۵۰ امام الدین، برکاتِ اولیا، مطبوعہ دہلی ۱۳۲۲ھ، ص ۱۳۸

۵۱ یوسف حسین، گلمپسز آف دی مڈیول انڈین کلچر، ص ۶۰ - ۵۹۔

۵۲ منوچی، سٹوریا ڈو موگر، مطبوعہ لندن ۱۹۰۷ء، ص ۲۳۰

۵۳ محمد مراد، مناقب الحضرات، ورق ۲۰۲ الف

Marfat.com

میں اورنگ زیبؒ کی حمایت کی[54]۔ قصور کے افغانوں نے شیخ آدم بنوریؒ کے خلیفہ شیخ عبدالخالقؒ کی خدمت میں استدعا کی کہ وہ اورنگ زیبؒ کی کامیابی کے لئے دعا فرمائیں[55]۔ ان امثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس جنگ میں نقشبندیوں کا عام رجحان اورنگ زیبؒ کی طرف تھا۔

شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کے اخلاف میں سے شیخ الاسلام خواجہ عابد، جن کا شمار ماوراء النہر کے جید علما میں ہوتا ہے، اورنگ زیبؒ کی حمایت میں دارا شکوہ کے خلاف لڑے۔ دارا شکوہ کی شکست کے فوراً بعد اورنگ زیبؒ نے انہیں سہ ہزاری ذات اور پانصد سوار کا منصب اور خان کا خطاب عطا کیا[56]۔ جب دوبارہ دارا شکوہ اور راجہ جسونت سنگھ اورنگ زیبؒ کے مقابلہ کو نکلے تو اس جنگ میں بھی خواجہ عابد نے اپنی بہادری کے جوہر دکھلائے۔ اورنگ زیبؒ نے اس بار انہیں ترقی دے کر چہار ہزاری ذات اور ہفت صد سوار کا منصب عطا کیا۔ چوتھے سال جلوس میں اورنگ زیبؒ نے انہیں صدر کے عہدہ پر فائز کیا۔ اس کے دو سال بعد آپ اجمیر کے گورنر بنے اور چند سال بعد آپ کا ملتان تبادلہ ہو گیا[57]۔ چوبیسویں سال جلوس میں اورنگ زیبؒ نے رضوی خاں کی جگہ خواجہ عابد کو "صدر کل ہندوستان" بنایا[58]۔

---

۵۴ محمد شفیع، مرأت واردات، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، ایڈیشنل ۶۵۷۹، ورق ۸۶ ب

۵۵ محمد مراد، مناقب الحضرات، ورق ۷۳ الف

۵۶ شاہنواز خاں، مآثر الامراء مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۸ء، جلد سوم ص ۱۲۰

۵۷ ایضاً، ص ۱۲۱

۵۸ ایضاً، ص ۱۲۲

Marfat.com

شہرۂ آفاق محدث شیخ طاہر پٹنیؒ کے پوتے شیخ عبدالوہاب سے زمانۂ شہزادگی میں اورنگ زیبؒ کی راہ و رسم تھی۔[۵۹] جب اورنگ زیبؒ برہان پور سے دارا شکوہ کے مقابلہ کے لئے نکلا تو شیخ عبدالوہاب نے فتویٰ جاری کیا کہ شاہجہان بیماری اور ضعف کی بنا پہ کاروبار سلطنت چلانے سے معذور ہے۔ اس لئے اورنگ زیبؒ کی دارالحکومت پہ فوج کشی شرعاً جائز ہے۔[۶۰] اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی کے فوراً بعد اس صلہ میں آپ کو قاضیٔ عسکر کے عہدے پہ فائز کیا گیا۔[۶۱]

اسی طرح برہان پور کے ملا قطب ہانس کے ساتھ بھی اورنگ زیبؒ کے بڑے عمدہ مراسم تھے۔ انھوں نے بھی اس مہم میں اورنگ زیبؒ کی دل و جان سے مدد کی جس کے صلہ میں اورنگ زیبؒ نے تخت نشین ہوتے ہی انہیں ایک گاؤں بطور جاگیر اور چار لاکھ دام نقد عطا کئے۔[۶۲]

مسلمانوں کے دیندار اور دینی حمیت رکھنے والے طبقہ نے دل و جان کے ساتھ اس جنگ میں اورنگ زیبؒ کا ساتھ دیا کیونکہ وہ حصول تخت کے لئے ان کا نمائندہ تھا۔ مشہور ہندو مؤرخ لکھی لال رائے چودھری رقمطراز ہے کہ اورنگ زیبؒ نے "مذہب خطرہ میں ہے" کا نعرہ[۶۳] باجو بڑا سود مند

---

[۵۹] ایضاً، جلد اوّل، ص ۲۳۵

[۶۰] ڈاکٹر پی سرن، دی پراونشل گورنمنٹ آف دی مغلز، مطبوعہ الٰہ آباد ۱۹۴۱ء، ص ۳۴۵

[۶۱] مآثر الامراء، جلد اوّل، ص ۲۳۶۔

[۶۲] محمد بقا، مرأت جہاں نما، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۹۹۸، ورق ۲۴۴ الف۔

Marfat.com

ثابت ہوا اور اس طرح اس نے اپنا سیاسی مقصد حاصل کیا۔[63] فاروقی صاحب کے خیال میں اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی پر دین دار طبقوں میں بڑی مسرت کا اظہار کیا گیا اور لوگ اسے نجات دہندہ سمجھنے لگے کیونکہ انھیں یہ اندیشہ دامنگیر تھا کہ دارا شکوہ کی کامیابی سے اکبر کا زمانہ واپس لوٹ آئے گا۔[64]

تخت نشینی کے بعد بھی اورنگ زیبؒ نے خواجہ محمد معصومؒ کے ساتھ اپنے تعلقات قائم رکھے[65] اور بسا اوقات وہ مذہبی امور میں ان سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ خواجہ صاحبؒ کے بعض مکتوبات سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ مذہبی امور میں ان کی ہدایات کا منتظر رہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحبؒ بھی اورنگ زیبؒ کی پالیسی سے متفق تھے اور اس کے لئے اکثر دعا کیا کرتے تھے۔[66] اورنگ زیبؒ نے اپنے دورِ حکومت میں اکبر اور دارا شکوہ کی جاری کردہ بدعات کو ختم کرنے کی دل و جان سے کوشش کی اور اس طرح اس نے حضرت مجدد الف ثانیؒ اور خواجہ محمد معصومؒ کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

۶۳۔ مکھن لال رائے چودھری، دی سٹیٹ اینڈ ریلیجن ان مغل انڈیا، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۵۱ء، ص ۲۱۹۔

۶۴۔ فاروقی، ظہیر الدین، اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز، مطبوعہ بمبئی ۱۹۳۵ء، ص ۵۶۴۔

۶۵۔ مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (اردو)، مکاتیب نمبر ۶، ۶۴، ۲۲۱، ۲۲۷۔

۶۶۔ ایضاً، مکتوب نمبر ۲۲۷ ص ۲۸۶ - ۲۸۵۔

Marfat.com

مسجدِ قبا سے تاج محل تک

دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف اقسام کا طرزِ تعمیر رائج ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر ممالک کی مذہبی اور تاریخی روایات، آب و ہوا اور جغرافیائی محلِ وقوع ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ان چیزوں کا طرزِ تعمیر پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر یورپی ممالک میں، جہاں برفباری کثرت سے ہوتی ہے، مکانات کی چھتیں ڈھلوان بنائی جاتی ہیں تاکہ برف گھر کے اسی چھت پر سے نیچے پھسل جائے۔ اگر وہاں چھتیں ہمارے ہاں کی چھتوں کی طرح ہموار ہوں تو وہ برف کے بوجھ سے نیچے گر پڑیں۔ مذہبی روایات بھی کافی حد تک طرزِ تعمیر میں دخیل ہیں، ہم ایک مسجد کو مندر یا کلیسا کی طرز پر تعمیر نہیں کر سکتے، علاوہ ازیں مسجد کا قبلہ رُخ ہونا بھی شرط ہے۔ اسی طرح یہ چیز بھی مدِ نظر رکھی جاتی ہے کہ وہاں سامانِ تعمیر کس قسم کا میسّر آسکتا ہے، مثلاً کشمیر میں عمارتی لکڑی کی افراط ہے اس لئے وہاں کی عمارتوں میں اس کا آزادانہ استعمال ہوتا ہے۔ سرینگر کے شاہی محلات اور شاہِ ہمدان کی مسجد میں اخروٹ کی لکڑی پر کھدائی کے نادر نمونے پائے جاتے ہیں۔ ٹنڈرا کے علاقے میں سوائے برف کے اور کچھ دستیاب نہیں ہو سکتا ہے

Marfat.com

اس لئے وہاں اینٹ پتھر کی عمارات بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ مختلف حالات کے تحت مختلف ممالک میں مخصوص طرز کی عمارات بنانے کا رواج ہے۔

اس وقت دنیا میں چینی، مصری، سومیری، یونانی، رومن، بازنطینی، گاتھک، ہندی، اسلامی اور مغل طرزِ تعمیر مشہور ہیں۔ چینی طرزِ تعمیر تا حال چین، جاپان، اور قریبی ممالک میں رائج ہے۔ گاتھک طرزِ تعمیر یورپ میں رائج تھا، مگر اب روز بروز ختم ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں کے گرجے اسی طرزِ تعمیر کے نمونے ہیں۔ رومن طرزِ تعمیر یونانی طرزِ تعمیر کا جانشین ہے، لاہور کی اسمبلی کا صدر دروازہ اسی طرزِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ رومن طرزِ تعمیر کی جگہ ترکی میں بازنطینی طرزِ تعمیر نے لی۔ استانبول کی مسجد آیا صوفیہ، جامع فاتح، جامع سلیمان اور جامع سلطان احمد اسی طرزِ تعمیر کی مظہر ہیں۔ اس طرزِ تعمیر کی خصوصیت بلند و بالا منار اور چپٹے گنبد ہیں۔ لاہور میں چوک ریگل کے قریب جو مسجد شہدا تعمیر ہو رہی ہے، اس کا گنبد بازنطینی طرزِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ بازنطینی طرزِ تعمیر نے اسلامی طرزِ تعمیر میں نئی روح پھونکی، اور یہی اسلامی طرزِ تعمیر ایرانی اور ہندی اختلاط سے مغل طرزِ تعمیر میں بدل گیا۔ آج تاج محل جیسی عجوبۂ روزگار عمارت ہمارے سامنے مغل طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔

عام عمارات دو مقاصد کے پیشِ نظر تعمیر کی جاتی ہیں۔ ایک تو عام رہائش یا اجتماعی استعمال کے لئے اور دوسری مذہبی نقطۂ نظر سے، مؤخر الذکر قسم میں، منادر، مساجد، مقابر اور گرجے آتے ہیں۔ عبادت گاہوں کی تعمیر اور ان کا وجود اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود حضرتِ انسان کا وجود ہے۔ خانۂ کعبہ دنیا بھر میں قدیم ترین عمارت ہے جس کی بنیاد خود حضرت آدم علیہ السلام نے

Marfat.com

رکھی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیرِ ثانی اسی بیت العتیق کی بنیادوں پر کی تھی۔ مقبرہ کی عمارت سب سے پہلے ترکی کے مغربی ساحل لیڈیا کے حاکم موسولس نے اپنی زندگی میں ہی تعمیر کروالی تھی، اُسی کے نام کی مناسبت سے انگریزی زبان میں مقبرہ کو موسولی ام کہتے ہیں۔

قرآن حکیم میں بھی ازمنہ قدیم کی عظیم الشان عمارات کا ذکر ملتا ہے بحضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں عمارات میں شیشہ بھی استعمال ہونے لگا تھا۔ حضرت سلیمانؑ اور فرعون کے دربار تا حال مشہور ہیں اور شدادی عمارات تو لطور محاورہ استعمال ہوتی ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود اسلام کا اپنا کوئی مخصوص طرزِ تعمیر نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ غرناطہ کا قصرِ الحمراء، اشبیلیہ کا دربار ہال، قرطبہ کی جامع مسجد، اصفہان کی مسجد شاہ، لاہور میں علی مردان خان کا مقبرہ، فتح پور سیکری کا بلند دروازہ، سہسرام میں شیرشاہ سوری کا مزار اور آگرہ کا تاج محل مسلمانوں کے تعمیر کردہ ہیں اور آج انہیں اسلامی طرزِ تعمیر کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

عہدِ اسلام میں سب سے اوّل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے فوراً بعد مدینہ کی نواحی بستی قباء میں ایک مسجد کی بنیاد رکھی جو چند دنوں میں ہی پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی۔ ان گھڑت پتھروں کو گارے کی مدد سے کھڑا کر کے ان پر کھجور کے پتوں کی چھت ڈال دی گئی۔ فی الحقیقت یہی وہ اسلامی طرزِ تعمیر تھا جس کی بنیاد پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔ خداوند قدوس و توانا نے کلامِ پاک میں اسی مسجدِ قباءُ کے متعلق فرمایا ہے۔

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی التَّقْوٰی مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ ط

(اس کی بنیاد محض خوشنودیٔ خدا کے لئے تقویٰ و پرہیز گاری پر رکھی گئی)

Marfat.com

مسجد قبا کی تعمیر کے چند روز بعد ہی مسجدِ نبوی بھی اسی اصول پہ تعمیر ہوئی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہٗ نے اپنے عہدِ خلافت میں اس کی کافی حد تک توسیع کروادی تھی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہٗ نے دمشق میں اپنے لئے ایک عالیشان محل تعمیر کروالیا تھا۔ اس محل کی دیواریں سبز رنگ کی تھیں اس لئے اسے قصر الخضرا کہتے تھے۔ یزید کے آخری ایّام حکومت میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہٗ کے خلاف حصین نے مکہ مکرّمہ پہ چڑھائی کی۔ ابنِ زبیر رضی اللہ عنہٗ حرمِ مکہ میں محصور ہو گئے۔ حصین نے مکہ مکرمہ پہ سنگ باری کی جس سے خانہ کعبہ کی عمارت کو کافی نقصان پہنچا۔ محاصرہ ختم ہوا تو ابنِ زبیر رضی اللہ عنہٗ نے کعبہ کی مرمت کے لئے یمن سے ابرہہ کے تعمیر کردہ کلیسا، جسے آباد کرنے کی خاطر وہ کعبہ کو برباد کرنے پہ تل گیا تھا، کے منقوش پتھر اور پچیکاری کے موزئے کعبہ میں لگوائے اور عمارت میں بھی کافی ردّ و بدل کیا۔ عبدالملک کے عہدِ خلافت میں حجاج بن یوسف نے ابنِ زبیر رضی اللہ عنہٗ کے تعمیر کردہ حصوں کو مسمار کر کے کعبہ کی عمارت کو قریش کی بنیادوں پہ از سرِ نو تعمیر کروایا۔

عبدالملک نے ہی بیت المقدس میں صخرۂ شریف پہ مثمن وضع کی عمارت تعمیر کی اور اس کے اوپر ایک گنبد بنوایا۔ اسی وقت سے مسلمانوں نے گنبد کو اپنا لیا۔ اس سے پہلے مصر میں فسطاط کے مقام پہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہٗ نے ایک مسجد تعمیر کروائی اور اس کے ساتھ ایک مینار بھی بنوایا۔ اسی دن سے مسجد کے ساتھ مینار تعمیر کرنے کا رواج پڑا۔

Marfat.com

خلیفہ ولید بن عبدالملک نے اپنے عہد خلافت میں مسجد نبوی کی تعمیر نو کا منصوبہ تیار کیا اور اسی سلسلہ میں قیصرِ روم کو خط لکھا کہ ہم اپنے نبی محترمؐ کی مسجد نئے سرے سے تعمیر کرنا چاہتے ہیں، تم کاریگر اور سامانِ تعمیر فراہم کردو۔ قیصر نے ایک لاکھ مثقال سونا، چالیس گٹھے سامان مدینت کاری اور بے شمار کاریگر اور دیگر ضروری سامان بھیج دیا۔ ایک روائت کے مطابق مدائن سے بھی کچھ سامان منگوایا گیا تھا۔ یہ شہر کسی زمانہ میں ایران کا پایۂ تخت رہ چکا تھا، اس لئے ایرانی اثرات بھی رومی اثرات کے ساتھ عرب میں آئے اور یہاں عربوں نے انہیں "مشرف باسلام" کر لیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اوّل بار مسجد میں محراب بنائی، اس کے بعد مسجد میں محراب بنانا ضروری ہو گیا۔

ایران میں دامغان کے مقام پہ جب مسجد تعمیر ہوئی تو اس کے ساتھ جو مینار تعمیر کئے گئے ان میں کٹہرے (گیلریاں) بھی بنائے گئے۔ عباسی خلیفہ المعتز باللہ (۲۵۲ - ۲۵۵ ہجری) کو عمارات بنانے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے سامرا میں جو محلات بنوائے ان کی دیواروں پہ خوبصورتی کے لئے خوشنما رنگوں میں بے جان اشیاء کی تصویریں اور قدرتی مناظر بنوائے اس طرح مسلمانوں نے ایک نئی جدّت اپنا لی۔ مندرجہ بالا مثالوں سے قارئین کرام کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اب تک کس قدر غیر ملکی اثرات اسلامی فنِ تعمیر پہ اثر انداز ہو چکے تھے۔ جامع مسجد دمشق ایک گرجا کی بنیادوں پہ تعمیر ہوئی۔ کرخ میں زبیدہ خاتون کا مقبرہ، بصرہ میں امام حسن بصریؒ کا روضہ اور بغداد میں حضرت شہاب الدین

Marfat.com

عمر سہروردیؒ کی درگاہ پر ارمنی طرز کے مندر نما قبے تعمیر ہوئے۔
مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر قابض ہوتے ہی وہاں کے سب سے بڑے گرجے، سینٹ صوفیہ کو بتوں اور تصویروں سے پاک کر کے اُسے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ ترکی کی دیگر مساجد مثلاً جامع فاتح، جامع سلیم، جامع سلیمان، جامع سلطان احمد، جامع یازید اور جامع ایوبؓ اسی طرز پر تعمیر ہوئیں۔ اس طرح مسلمانوں نے ترکی میں بازنطینی طرزِ تعمیر کو معمولی سے ردّ و بدل سے اپنا لیا۔

جس وقت مسلمانوں نے ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی تو اس وقت تک اسلامی طرزِ تعمیر میں وہ تمام عناصر شامل ہو چکے تھے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ سلطان قطب الدین ایبک نے ہندوؤں کی عالیشان عمارات کو ذہن میں رکھتے ہوئے دہلی میں اسلام کی عظمت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھانے کے لئے ایک عظیم الشان مسجد قوت الاسلام کی بنیاد رکھی۔ اس مسجد کی تعمیر میں ۲۷ مندروں کا پتھر استعمال ہوا تھا، تاحال مسجد کے ستونوں پر ٹوٹی پھوٹی مورتیوں کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھئے گا کہ مسلمانوں نے ان منادر کو فتح دہلی کے وقت گرایا ہوگا، ہمارے خیال کے مطابق فتح ہندوستان کے بعد جب غیر مسلموں نے کافی بڑی تعداد میں اسلام قبول کیا تو انہوں نے خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے مندر اور خود ساختہ معبود توڑ ڈالے۔ سلطان قطب الدین ایبک نے وہی پتھر خانۂ خدا میں لگوا دیئے۔ اگر ایک آدھ مثال مسلمانوں کے مندر گرانے کی مل جائے تو کوئی عجب بھی نہیں۔ آج بھی مہذب دنیا میں اپنے مخالفین کی عبادت گاہوں کو

Marfat.com

کو نذرِ آتش کرنے یا مسمار کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔

فتح ہندوستان کے بعد مسلمانوں نے ہندوؤں کے طرزِ تعمیر خصوصاً ان کے ستونوں کی ساخت اور اونچی کرسی پر عمارت بنانے کے طریقے کو اپنا لیا۔ اس کی واضح مثال اجمیر میں سلطان شمس الدین التمش کی تعمیر کردہ مسجد "اڑھائی دن کا جھونپڑا" ہے۔ اس مسجد کی محرابیں ہندوؤں کے طرزِ تعمیر سے کافی حد تک متاثر ہیں، نیز اس کے ستون ہندوؤں کے فنِ تعمیر کا مظہر ہیں، ان پر ٹوٹے پھوٹے بتوں کے نشانات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ میں نے آج تک اتنی بلند کرسی پر بنی ہوئی مسجد نہیں دیکھی۔ اس مسجد میں داخل ہونے کے لیے بیس پچیس کے قریب سیڑھیاں چڑھنا ہوتی ہیں۔

قطب منار کا شمار اِن عمارات میں ہوتا ہے جو مسلمانوں نے فتح دہلی کے فوراً بعد تعمیر کی تھیں۔ ان عمارات کی تعمیر میں مسلمان معماروں سے کہیں زیادہ ہندو معماروں نے حصّہ لیا تھا، اس لئے ان عمارات میں ہندوانہ رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اگر قطب منار کی ابتدائی منازل میں کوفی خط میں کتابت کندہ نہ ہوتے تو دیکھنے والے یہی تاثر لیتے کہ یہ منار ہندوؤں کے دورِ حکومت میں تیار ہوا تھا۔ یہ قطب مینار کا ہندوانہ رنگ ہی تھا کہ ہندوؤں نے اُسے "رائے پتھورا کی لاٹھ" مشہور کر دیا۔ قطب منار کے متعلق غالی ہندو اب تک یہی کہہ رہے ہیں کہ یہ مھتوی راج کی ماں جب تک جمنا جی کے درشن نہیں کر لیتی تھی اس وقت تک ناشتہ کو چھوتی تک نہ تھی۔ جب وہ کافی ضعیف ہو گئی اور سفر کے قابل نہ رہی تو یہ مھتوی راج نے یہ لاٹھ بنوا دی تاکہ وہ اس پر چڑھ کر جمنا جی کے درشن کر لیا کرے۔ ہمارے خیال میں قطب منار کے ہندوانہ طرزِ تعمیر نے

Marfat.com

ہندوؤں کو یہ روایت گھڑنے کا موقع دیا ہے۔

شمس الدین التمش کے عہد حکومت میں چنگیز خان کے حملوں کی وجہ سے ماوراء النہر، ترکستان، خراسان اور خوارزم سے عام لوگوں کے ساتھ ہر فن کے کاریگر بھی کافی بڑی تعداد میں ہندوستان چلے آئے۔ ان کے یہاں آنے سے ہمارے ہاں کے طرز تعمیر پر کافی اثر پڑا۔ مہرولی میں علاؤ الدین خلجی کا تعمیر کردہ علائی دروازہ گذشتہ تمام عمارات سے بالکل مختلف ہے۔ اس عمارت کو اگر باہر سے دیکھئے تو دو منزلیں نظر آتی ہیں، لیکن اندر جاکر دیکھیں تو ایک ہی منزل نظر آتی ہے۔ اس کا گنبد بھی مختلف طرز کا ہے، ماہرین فن تعمیر نے اسے اس زمانے کا شاہکار قرار دیا ہے۔

خلجیوں کی بساط سلطنت الٹی تو تغلق خاندان حکمران ہوا۔ ان کا طرز تعمیر منفرد رنگ لئے ہوئے ہے۔ سلطان غیاث الدین تغلق جن دنوں دیپال پور اور ملتان کا گورنر تھا، اس نے بہاؤ الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے قریب ہی اپنے لئے ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کروالیا تھا۔ جب وہ بادشاہ ہوا تو اس نے وہ مقبرہ حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے حضرت رکن عالم علیہ الرحمت کے حوالے کر دیا۔ حضرت رکنِ عالم نور اللہ مرقدہٗ اسی مقبرے میں محو خواب ابدی ہیں۔ اس مقبرے کی تین منزلیں ہیں اور جن دیواروں پر گنبد اٹھایا گیا ہے وہ سلامی دار ہیں۔ یہ تمام کی تمام عمارت اینٹوں سے بنائی گئی ہے اور اس میں زیبائش کے لئے کہیں کہیں منقش اینٹیں بھی لگائی ہوئی ہیں۔ دیواروں کو سہارا دینے کے لئے بڑے مضبوط ستون بنائے گئے ہیں۔ اس عمارت کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ گنبد کی تعمیر میں اینٹوں کے درمیان لکڑی

Marfat.com

کے شہتیر بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ ماہرینِ فن کا یہ کہنا ہے کہ زلزلہ کی صورت میں یہ شہتیر گنبد کو سنبھال لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ گنبد گذشتہ ساڑھے چھ سو سال میں ہر طرح کے حادثوں سے محفوظ رہا ہے۔ اس عمارت کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ صخرہ شریف کی طرح یہ عمارت بھی ہشت پہلو ہے۔ یہ چیز تغلقوں کے فنِ تعمیر کی نمایاں خصوصیت ہے۔ دہلی میں بھی اُنھوں نے جتنی عمارتیں بنوائی ہیں ان کی تعمیر کے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ عمارت کا بنیادی نقشہ مثمن ہو۔

تغلق خاندان کا خاتمہ امیر تیمور نے کیا اور ہندوستان میں اس کی طرف سے سادات حکمرانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ امیر تیمور نے مقبروں کی تعمیر میں ایک نئی جدت نکالی۔ جب اس کی ملکہ بی بی خانم کا انتقال ہوا تو امیر موصوف نے اس کی قبر ایک تہ خانہ میں بنوائی اور اس کے اوپر عالیشان مقبرہ تعمیر کیا۔ امیر تیمور کے عہد سے مغلوں میں اصل قبر تہ خانہ میں بنانے کا رواج پڑا۔ ہمایوں، اکبر، جہانگیر، نور جہاں اور ممتاز محل کے مقبروں کی تعمیر کے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔

خاندانِ سادات کے بعد ہندوستان کی حکومت لودھیوں کو ملی۔ سکندر لودھی نے آگرہ کی بنیاد رکھی اور وہاں متعدد عمارات بنوائیں۔ لودھیوں کے گنبد عجیب وضع کے تھے اس زمانے میں مربع عمارت پر بالکل گول گنبد بنانے کا رواج ہوا۔ لاہور میں نولکھا چرچ کی حدود میں حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ کے مقبرہ پر جو گنبد تھا اُسے دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے بہت بڑی گیند کو درمیان سے کاٹ کر دیواروں پر رکھ دیا ہے۔ اب ہماری غفلت کی وجہ سے یہ عمارت ڈھ گئی ہے سکندر لودھی کے نااہل جانشین نے

Marfat.com

بابر کے مقابلہ میں شکست کھائی اور مغلوں کی ہندوستان پر قبضہ کرنے کی صدیوں پرانی خواہش پوری ہوگئی۔

بابر کو قدرتی مناظر اور باغات سے بڑا اُنس تھا۔ اس نے اپنے عہد میں باغات تعمیر کروائے۔ مگر موت نے اُسے زیادہ مہلت نہ دی اور وہ ہمایوں کو تاج و تخت سونپ کر راہی ملک بقا ہوا۔ ہمایوں پٹھانوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ روک سکا اور جان بچا کر ایران کی جانب چلا گیا۔ شیر شاہ حکمران ہوا، لیکن اسے بھی موت نے مہلت نہ دی۔ اس کا مقبرہ اس کے عہد کی بہترین عمارت ہے شیر شاہ اپنے آبائی وطن سہسرام میں مدفون ہوا۔ مقبرہ ایک وسیع تالاب کے وسط میں کھڑا ہے۔ ایک پُل کے ذریعے وہاں جا سکتے ہیں۔ راقم الحروف سال گذشتہ اس کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہے[1]۔ مقبرہ کے اندر لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں مچھر موجود تھے، دُعائے مغفرت پڑھنی بھی دشوار ہو گئی تھی۔ یہ عمارت بھی ہشت پہلو ہے اور حضرت رکن عالمؒ کے مقبرہ کی طرح اس کی بھی تین منزلیں ہیں۔

شیر شاہ کے جانشین نالائق ثابت ہوئے، ہمایوں دوبارہ ۱۵۵۵ء میں بیرم خاں کی ہمت سے ہندوستان پہ قابض ہو گیا۔ لیکن چھ ماہ بعد ہی اس نے شیر منڈل کی عمارت سے گر کر وفات پائی۔ اس کی بیوی حاجی بیگم نے اس کے مقبرہ کی تعمیر اپنی نگرانی میں شروع کرائی۔ دس برس میں سولہ لاکھ کی لاگت سے یہ عمارت پایہ تکمیل تک پہنچی۔ ہمایوں کے ساتھ ایرانی صناع بھی ہندوستان آ گئے تھے اس لئے اس عمارت میں ایرانی فنِ تعمیر کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ مقبرہ ایک وسیع باغ کے وسط میں کھڑا ہے۔ اور یہی باغ اس کے حسن کو چار چاند لگا رہا ہے۔ مقبرہ کی عمارت

---

[1] یہ ۱۹۵۵ء کا ذکر ہے۔

Marfat.com

۲۲ فٹ بلند کرسی پر اُٹھائی گئی ہے۔ یہ بغدادی طرز کی ہشت پہلو عمارت ہے (بغدادی طرز میں آٹھوں پہلو برابر نہیں ہوتے۔ چار بڑے اور چار چھوٹے ہوتے ہیں) گنبد کی گردن بے حد چھوٹی ہے۔ گنبد سنگِ مرمر کا ہے لیکن باقی تمام عمارت سنگِ سُرخ سے بنی ہے۔ اس میں جا بجا رنگدار پتھر آرائش کی خاطر لگا دئے ہیں ایک بات قابلِ غور ہے کہ مقبرے کے ساتھ منارے نہیں بنائے گئے۔ باقی عمارت کو "بالکسٹر فلیچر" نے تاج محل کا پیش رو قرار دیا ہے۔ یہ عمارت ۱۵۶۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اسی زمانہ میں ۱۵۶۲ء میں گوالیار میں جناب محمد غوث کا مزار تعمیر ہوا، اس کی جالیاں قابلِ دید ہیں۔ ویسے احمد آباد میں سیدی سید کی مسجد کی جالی دنیا بھر میں بہترین جالی قرار دی گئی ہے۔ تاج محل کے اندر مزارات کے گرداگرد جو جالیاں بنی ہیں ان میں ایسی ہی نفاست برتی گئی ہے۔

اکبر نے فتح پور سیکری میں کافی عمارات بنوائیں۔ اس کی بیوی سلیمہ سلطان بیگم کے محل کی منبت کاری ایک لاثانی نمونہ ہے، لیکن یہ ہے سب سنگِ سُرخ پر۔ اکبر نے فتح پور سیکری میں ایک بلند دروازہ بنایا جو سڑک کی سطح سے ۱۷۲ فٹ بلند ہے اور ہندوستان میں سب سے زیادہ بلند دروازہ ہے۔ اس پر پرانچین کاری کے نمونہ پر قرآنی آیات اور نقش نگار کندہ ہیں۔ شیخ سلیم چشتی کا مقبرہ خالص سنگِ مرمر سے تعمیر ہوا اس کے ستون اور بریکٹ نفاست اور کاریگری کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ اکبر کے آخری ایامِ حکومت میں سنگِ سُرخ کی جگہ سنگِ مرمر نے لے لی تھی۔ اکبر نے اپنے لئے سکندرہ میں مقبرہ تعمیر کروانا شروع کر دیا تھا اور اس میں ہیسٹ آرٹ کو نمایاں دخل ہے۔ مقبرہ کا بیرونی دروازہ اور اس کے سنگِ مرمر کے

Marfat.com

مینار بے نظیر ہیں۔ تاج محل میں ان میناروں کی نفاست اور عمدگی مدِ نظر رہی ہو گی۔ تاج محل کے میناروں کے بعد خوبصورتی میں ان ہی کا نمبر ہے۔

اکبر اور جہانگیر کی ہندو بیویاں مخصوص طرز کے محلات میں رہتی تھیں، ان کی تعمیر میں ہندو طرزِ تعمیر کو خاص دخل تھا۔ اس طرح ہندو آرٹ زیادہ سے زیادہ مغل آرٹ میں داخل ہونے لگا۔ آگرہ میں جودھا بائی کے محل میں گھومتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کسی مندر میں گھوم رہے ہیں۔

اسی عہد میں عبدالرحیم خانخانان کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ یہ مقبرہ ہمایوں کے مقبرہ اور تاج محل کے درمیانی کڑی ہے، ان سب میں اندازاً نصف صدی کا فرق ہے۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقبرہ ہمایوں کا انداز تا حال جاری تھا۔ اس کے بعد ۱۶۲۶ء میں آگرہ میں نور جہاں نے اعتماد الدولہ غیاث بیگ کا مقبرہ تعمیر کروایا۔ عمارت دریا کے کنارے واقع ہے۔ تاج محل میں بھی یہی چیز مدِ نظر رکھی گئی ہے۔ تمام کی تمام عمارت سنگِ مرمر کی ہے پچی کاری کے نمونے بھی بہت عمدہ ہیں۔ چھت پر گنبد کی بجائے بنگالی وضع کی چھت بنائی گئی ہے۔ مگر چاروں کونوں پر مینار موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ نور جہاں نے خود اس عمارت کا نقشہ تیار کیا تھا۔ اگر آگرہ میں تاج محل نہ ہوتا تو یہی سب سے عمدہ عمارت ہوتی۔ تاج محل کی موجودگی میں اس کا حسن گہنا گیا ہے۔ پرسی براؤن نے اسے اکبر اور شاہ جہان کے طرزِ تعمیر کی درمیانی کڑی قرار دیا ہے۔

لاہور میں انارکلی کا مقبرہ بھی تاج محل کی وضع قطع لئے ہوئے ہے بلکہ اس کا بنیادی نقشہ تاج محل سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تاج محل کی طرز پر عمارات بننے لگ گئی تھیں اور مختلف طرز کے نمونے جن کی تاج میں پیروی کی گئی ہے، ملک کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے تھے۔

Marfat.com

شاہ جہان نے ان سب کو معمولی ردّ و بدل سے یکجا کر دیا ہے۔ شاہ جہان کے عہد میں لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ عمارت کے کونوں پہ چار مینار تعمیر ہوئے اور قبر کے تعویذ پہ بڑی عمدہ قسم کی پرچین کاری ہوئی۔ یہی فن دیوانِ عام کے شاہی جھروکہ میں اپنے جوبن پہ نظر آتا ہے۔ قلعہ لاہور میں احاطہ شیش محل میں نو لکھا بارہ دری پہ بھی اس فن کے باریک اور نفیس نمونے پائے جاتے ہیں۔ دو انچ مربعہ جگہ میں ۱۰۵ رنگ برنگے پتھر پھول پتیوں کی شکل میں سنگِ مرمر کھود کر بھرے گئے ہیں۔ تاج محل کے اندرونی حصہ میں جالی پہ بہت ہی عمدہ پرچین کاری ہوئی ہے۔

شاہ جہان نے لال قلعہ میں دیوانِ خاص میں بہترین قسم کے نقش و نگار کروائے اور اس پہ خود ہی یہ شعر بھی منقوش کروا دیا۔ ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمین است و ہمین است و ہمین است

اب اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ شاہ جہان کے عہد میں ہندو اثرات جو اکبر اور جہانگیر کے عہد حکومت میں عام ہو گئے تھے ختم ہو گئے اور ان کی جگہ ایرانی طرز تعمیر زیادہ مقبول ہو گیا۔ لاہور میں وزیر خان کی مسجد، گلابی باغ اور دائی انگا کی مسجد اس پہ شاہد ہیں۔

ممتاز الزمانی ملکہ ارجمند بانو نے ۱۶۳۰ء میں وفات پائی۔ اسی سال تاج محل کی بنیاد رکھی گئی۔ ۲۲ برس میں کروڑوں روپوں کی لاگت سے یہ عمارت تیار ہوئی۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا ہے "کہ تاج محل ایک اشک محبت ہے جو شاہ جہان کی چشم پرنم سے ٹپکا ہے"۔ اس کی تعمیر میں تمام خوبیاں صرف کر دی گئیں اور آج تک کوئی شخص بھی فنی غلطی نہ نکال سکا۔ تاج محل میں بی بی خانم کے مقبرہ

Marfat.com

کی پیروی میں تہ خانہ، جہانگیر کے مقبرہ کی طرز پہ کونوں پہ چار مینار، انار کلی کے مقبرہ کی طرح بنیادیں، اکبر کے مقبرہ کے دروازہ کی طرح میناروں میں نفاست، دیوانِ عام دہلی کی طرح پرا چین کاری، مقبرہ ہمایوں کی طرح بلند کرسی اور بغدادی مثمن، محمد غوث گوالیاریؒ کے مزار کی طرح جالیوں میں عمدگی اور نفاست مقبرہ اعتماد الدولہ کی طرح تمام کی تمام سنگِ مرمر، بلند دروازہ اور مقبرہ اکبر کے دروازہ کی طرح دروازوں پہ آیاتِ قرآنی، مغلیہ عمارات کی طرح باغات وانہار اور عمارات کا تقابل اور بلند و بالا دروازے اور دریا کا کنارہ، اور دوسری باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاج محل ۲۲ برس میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا بلکہ وہ مسلمانوں کے گیارہ صدیوں کے فنِ تعمیر کی فنی خصوصیات کا حامل ہے۔

Marfat.com

کو نذرِ آتش کرنے یا مسمار کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔

فتح ہندوستان کے بعد مسلمانوں نے ہندوؤں کے طرزِ تعمیر خصوصاً ان کے ستونوں کی ساخت اور اونچی کرسی پر عمارت بنانے کے طریقے کو اپنا لیا۔ اس کی واضح مثال اجمیر میں سلطان شمس الدین التمش کی تعمیر کردہ مسجد "اڑھائی دن کا جھونپڑا" ہے۔ اس مسجد کی محرابیں ہندوؤں کے طرزِ تعمیر سے کافی حد تک متاثر ہیں، نیز اس کے ستون ہندوؤں کے فنِ تعمیر کا مظہر ہیں، ان پر ٹوٹے پھوٹے بتوں کے نشانات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ میں نے آج تک اتنی بلند کرسی پر بنی ہوئی مسجد نہیں دیکھی۔ اس مسجد میں داخل ہونے کے لیے بیس پچیس کے قریب سیڑھیاں چڑھنا ہوتی ہیں۔

قطب منار کا شمار اِن عمارات میں ہوتا ہے جو مسلمانوں نے فتح دہلی کے فوراً بعد تعمیر کی تھیں۔ ان عمارات کی تعمیر میں مسلمان معماروں سے کہیں زیادہ ہندو معماروں نے حصّہ لیا تھا، اس لئے ان عمارات میں ہندوانہ رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اگر قطب منار کی ابتدائی منازل میں کوفی خط میں کتبات کندہ نہ ہوتے تو دیکھنے والے یہی تاثر لیتے کہ یہ منار ہندوؤں کے دورِ حکومت میں تیار ہوا تھا۔ یہ قطب مینار کا ہندوانہ رنگ ہی تھا کہ ہندوؤں نے اُسے "رائے پتھورا کی لاٹھ" مشہور کر دیا۔ قطب منار کے متعلق غالی ہندو اب تک یہی کہہ رہے ہیں کہ یہ بھوی راج کی ماں جب تک جمنا جی کے درشن نہیں کر لیتی تھی اس وقت تک ناشتہ کو چھوتی تک نہ تھی۔ جب وہ کافی ضعیف ہو گئی اور سفر کے قابل نہ رہی تو یہ بھوی راج نے یہ لاٹھ منوا دی تاکہ وہ اس پر چڑھ کر جمنا جی کے درشن کر لیا کرے۔ ہمارے خیال میں قطب منار کے ہندوانہ طرزِ تعمیر نے

Marfat.com

ہندوؤں کو یہ روایت گھڑنے کا موقع دیا ہے۔

شمس الدین التمش کے عہد حکومت میں چنگیز خان کے حملوں کی وجہ سے ماوراء النہر، ترکستان، خراسان اور خوارزم سے عام لوگوں کے ساتھ ہر فن کے کاریگر بھی کافی بڑی تعداد میں ہندوستان چلے آئے۔ ان کے یہاں آنے سے ہمارے ہاں کے طرز تعمیر پہ کافی اثر پڑا۔ مہرولی میں علاؤ الدین خلجی کا تعمیر کردہ علائی دروازہ گذشتہ تمام عمارات سے بالکل مختلف ہے۔ اس عمارت کو اگر باہر سے دیکھئے تو دو منزلیں نظر آتی ہیں، لیکن اندر جا کر دیکھیں تو ایک ہی منزل نظر آتی ہے۔ اس کا گنبد بھی مختلف طرز کا ہے، ماہرین فن تعمیر نے اسے اس زمانے کا شاہکار قرار دیا ہے۔

خلجیوں کی بساط سلطنت الٹی تو تغلق خاندان حکمران ہوا۔ ان کا طرز تعمیر منفرد رنگ لئے ہوئے ہے۔ سلطان غیاث الدین تغلق جن دنوں دیپال پور اور ملتان کا گورنر تھا، اس نے بہاؤ الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے قریب ہی اپنے لئے ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کروا لیا تھا۔ جب وہ بادشاہ ہوا تو اس نے وہ مقبرہ حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے حضرت رکن عالم علیہ الرحمت کے حوالے کر دیا۔ حضرت رکنِ عالم نور اللہ مرقدہٗ اسی مقبرے میں محو خواب ابدی ہیں۔ اس مقبرے کی تین منزلیں ہیں اور جن دیواروں پہ گنبد اٹھایا گیا ہے وہ سلامی دار ہیں۔ یہ تمام کی تمام عمارت اینٹوں سے بنائی گئی ہے اور اس میں زیبائش کے لئے کہیں کہیں منقش اینٹیں بھی لگائی ہوئی ہیں۔ دیواروں کو سہارا دینے کے لئے بڑے مضبوط ستون بنائے گئے ہیں۔ اس عمارت کی بڑی خصوصیت، یہ ہے کہ گنبد کی تعمیر میں اینٹوں کے درمیان لکڑی

Marfat.com

کے شہتیر بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ ماہرینِ فن کا یہ کہنا ہے کہ زلزلہ کی صورت میں یہ شہتیر گنبد کو سنبھال لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ گنبد گذشتہ ساڑھے چھ سو سال میں ہر طرح کے حادثوں سے محفوظ رہا ہے۔ اس عمارت کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ صخرہ شریف کی طرح یہ عمارت بھی ہشت پہلو ہے۔ یہ چیز تغلقوں کے فنِ تعمیر کی نمایاں خصوصیت ہے۔ دہلی میں بھی انھوں نے جتنی عمارتیں بنوائی ہیں ان کی تعمیر کے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ عمارت کا بنیادی نقشہ مثمن ہو۔

تغلق خاندان کا خاتمہ امیر تیمور نے کیا اور ہندوستان میں اس کی طرف سے سادات حکمرانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ امیر تیمور نے مقبروں کی تعمیر میں ایک نئی جدت نکالی۔ جب اس کی ملکہ بی بی خانم کا انتقال ہوا تو امیر موصوف نے اس کی قبر ایک تہ خانہ میں بنوائی اور اس کے اوپر عالیشان مقبرہ تعمیر کیا۔ امیر تیمور کے عہد سے مغلوں میں اصل قبر تہ خانہ میں بنانے کا رواج پڑا۔ ہمایوں، اکبر، جہانگیر، نور جہاں اور ممتاز محل کے مقبروں کی تعمیر کے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔

خاندانِ سادات کے بعد ہندوستان کی حکومت لودھیوں کو ملی۔ سکندر لودھی نے آگرہ کی بنیاد رکھی اور وہاں متعدد عمارات بنوائیں۔ لودھیوں کے گنبد عجیب وضع کے تھے اس زمانے میں مربع عمارت پر بالکل گول گنبد بنانے کا رواج ہوا۔ لاہور میں نولکھا چوک کی حدود میں حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ کے مقبرہ پر جو گنبد تھا اُسے دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے بہت بڑی گیند کو درمیان سے کاٹ کر دیواروں پر رکھ دیا ہے۔ اب ہماری غفلت کی وجہ سے یہ عمارت ڈھ گئی ہے سکندر لودھی کے نااہل جانشین نے

Marfat.com

بابر کے مقابلہ میں شکست کھائی اور مغلوں کی ہندوستان پر قبضہ کرنے کی صدیوں پرانی خواہش پوری ہوگئی۔

بابر کو قدرتی مناظر اور باغات سے بڑا اُنس تھا۔ اس نے اپنے عہد میں باغات تعمیر کروائے۔ مگر موت نے اُسے زیادہ مہلت نہ دی اور وہ ہمایوں کو تاج و تخت سونپ کر راہی ملک بقا ہوا۔ ہمایوں پٹھانوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ روک سکا اور جان بچا کر ایران کی جانب چلا گیا۔ شیر شاہ حکمران ہوا، لیکن اسے بھی موت نے مہلت نہ دی۔ اس کا مقبرہ اس کے عہد کی بہترین عمارت ہے شیر شاہ اپنے آبائی وطن سہسرام میں مدفون ہوا۔ مقبرہ ایک وسیع تالاب کے وسط میں کھڑا ہے۔ ایک پُل کے ذریعے وہاں جا سکتے ہیں۔ راقم الحروف سال گذشتہ اس کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہے[1]۔ مقبرہ کے اندر لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں مچھر موجود تھے، دُعائے مغفرت پڑھنی بھی دشوار ہو گئی تھی۔ یہ عمارت بھی ہشت پہلو ہے اور حضرت رکن عالمؒ کے مقبرہ کی طرح اس کی بھی تین منزلیں ہیں۔

شیر شاہ کے جانشین نالائق ثابت ہوئے، ہمایوں دوبارہ ۱۵۵۵ء میں بیرم خاں کی ہمت سے ہندوستان پر قابض ہو گیا۔ لیکن چھ ماہ بعد ہی اس نے شیر منڈل کی عمارت سے گر کر وفات پائی۔ اس کی بیوی حاجی بیگم نے اس کے مقبرہ کی تعمیر اپنی نگرانی میں شروع کرائی۔ دس برس میں سولہ لاکھ کی لاگت سے یہ عمارت پایہ تکمیل تک پہنچی۔ ہمایوں کے ساتھ ایرانی صناع بھی ہندوستان آ گئے تھے اس لئے اس عمارت میں ایرانی فنِ تعمیر کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ مقبرہ ایک وسیع باغ کے وسط میں کھڑا ہے۔ اور یہی باغ اس کے حسن کو چار چاند لگا رہا ہے۔ مقبرہ کی عمارت

---

[1] یہ ۱۹۵۵ء کا ذکر ہے۔

Marfat.com

۲۲ فٹ بلند کرسی پر اٹھائی گئی ہے۔ یہ بغدادی طرز کی ہشت پہلو عمارت ہے (بغدادی طرز میں آٹھوں پہلو برابر نہیں ہوتے۔ چار بڑے اور چار چھوٹے ہوتے ہیں) گنبد کی گردن بے حد چھوٹی ہے۔ گنبد سنگِ مرمر کا ہے لیکن باقی تمام عمارت سنگِ سرخ سے بنی ہے۔ اس میں جا بجا رنگدار پتھر آرائش کی خاطر لگا دیے ہیں ایک بات قابلِ غور ہے کہ مقبرے کے سامنے مینارے نہیں بنائے گئے۔ باقی عمارت کو " بانسٹر فلیچر" نے تاج محل کا پیش رو قرار دیا ہے۔ یہ عمارت ۱۵۶۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اسی زمانہ میں ۱۵۶۲ء میں گوالیار میں جناب محمد غوث کا مزار تعمیر ہوا، اس کی جالیاں قابلِ دید ہیں۔ ویسے احمد آباد میں سیدی سید کی مسجد کی جالی دنیا بھر میں بہترین جالی قرار دی گئی ہے۔ تاج محل کے اندر مزارات کے گرد اگرد جو جالیاں بنی ہیں ان میں ایسی ہی نفاست برتی گئی ہے۔

اکبر نے فتح پور سیکری میں کافی عمارات بنوائیں۔ اس کی بیوی سلیمہ سلطان بیگم کے محل کی منبت کاری ایک لاثانی نمونہ ہے، لیکن یہ ہے سب سنگِ سرخ پر۔ اکبر نے فتح پور سیکری میں ایک بلند دروازہ بنایا جو سڑک کی سطح سے ۱۷۶ فٹ بلند ہے اور ہندوستان میں سب سے زیادہ بلند دروازہ ہے۔ اس پر بہ پرا چین کاری کے نمونہ پر قرآنی آیات اور نقش نگار کندہ ہیں۔ شیخ سلیم چشتیؒ کا مقبرہ خالص سنگِ مرمر سے تعمیر ہوا اس کے ستون اور بریکٹ نفاست اور کاریگری کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ اکبر کے آخری ایام حکومت میں سنگِ سرخ کی جگہ سنگِ مرمر نے لے لی تھی۔ اکبر نے اپنے لئے سکندرہ میں مقبرہ تعمیر کروانا شروع کر دیا تھا اور اس میں بدھسٹ آرٹ کو نمایاں دخل ہے۔ مقبرہ کا بیرونی دروازہ اور اس کے سنگِ مرمر کے

Marfat.com

مینار بے نظیر ہیں۔ تاج محل میں ان میناروں کی نفاست اور عمدگی مدِ نظر رہی ہو گی۔ تاج محل کے میناروں کے بعد خوبصورتی میں ان ہی کا نمبر ہے۔

اکبر اور جہانگیر کی ہندو بیویاں مخصوص طرز کے محلات میں رہتی تھیں، ان کی تعمیر میں ہندو طرز تعمیر کو خاص دخل تھا۔ اس طرح ہندو آرٹ زیادہ سے زیادہ مغل آرٹ میں داخل ہونے لگا۔ آگرہ میں جودھا بائی کے محل میں گھومتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کسی مندر میں گھوم رہے ہیں۔

اسی عہد میں عبدالرحیم خانخانان کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ یہ مقبرہ ہمایوں کے مقبرہ اور تاج محل کے درمیانی کڑی ہے، ان سب میں اندازاً نصف صدی کا فرق ہے۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقبرہ ہمایوں کا انداز تا حال جاری تھا۔ اس کے بعد ۱۶۲۶ء میں آگرہ میں نور جہاں نے اعتماد الدولہ غیاث بیگ کا مقبرہ تعمیر کروایا۔ عمارت دریا کے کنارے واقع ہے۔ تاج محل میں بھی یہی چیز مدِ نظر رکھی گئی ہے۔ تمام کی تمام عمارت سنگ مرمر کی ہے۔ پچکاری کے نمونے بھی بہت عمدہ ہیں۔ چھت پر گنبد کی بجائے بنگالی وضع کی چھت بنائی گئی ہے۔ مگر چاروں کونوں پر مینار موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ نور جہاں نے خود اس عمارت کا نقشہ تیار کیا تھا۔ اگر آگرہ میں تاج محل نہ ہوتا تو یہی سب سے عمدہ عمارت ہوتی۔ تاج محل کی موجودگی میں اس کا حسن گہنا گیا ہے۔ پرسی براؤن نے اسے اکبر اور شاہ جہان کے طرزِ تعمیر کی درمیانی کڑی قرار دیا ہے۔

لاہور میں انارکلی کا مقبرہ بھی تاج محل کی وضع قطع لئے ہوئے ہے بلکہ اس کا بنیادی نقشہ تاج محل سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تاج محل کی طرز پر عمارات بننے لگ گئی تھیں اور مختلف طرز کے نمونے جن کی تاج میں پیروی کی گئی ہے، ملک کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے تھے۔

Marfat.com

شاہ جہاں نے ان سب کو معمولی ردّ و بدل سے یکجا کر دیا ہے۔ شاہ جہان کے عہد میں لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ عمارت کے کونوں پر چار مینار تعمیر ہوئے اور قبر کے تعویذ پر بڑی عمدہ قسم کی پراچین کاری ہوئی۔ یہی فن دیوانِ عام کے شاہی جھروکہ میں اپنے جوبن پر نظر آتا ہے۔ قلعہ لاہور میں احاطہ شیش محل میں نولکھا بارہ دری پر بھی اس فن کے باریک اور نفیس نمونے پائے جاتے ہیں۔ دو انچ مربعہ جگہ میں ۱۰۵ رنگ برنگے پتھر پھول پتیوں کی شکل میں سنگِ مرمر کھود کر بھرے گئے ہیں۔ تاج محل کے اندرونی حصہ میں جالی پر بہت ہی عمدہ پراچین کاری ہوئی ہے۔

شاہ جہان نے لال قلعہ میں دیوانِ خاص میں بہترین قسم کے نقش و نگار کروائے اور اس پر خود ہی یہ شعر بھی منقوش کرادیا۔ ع

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمین است و ہمین است و ہمین است

اب اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ شاہ جہان کے عہد میں ہندو اثرات جو اکبر اور جہانگیر کے عہد حکومت میں عام ہو گئے تھے ختم ہو گئے اور ان کی جگہ ایرانی طرز تعمیر زیادہ مقبول ہو گیا۔ لاہور میں وزیر خان کی مسجد، گلابی باغ اور دائی انگا کی مسجد اس پر شاہد ہیں۔

ممتاز الزمانی ملکہ ارجمند بانو نے ۱۶۳۰ء میں وفات پائی۔ اسی سال تاج محل کی بنیاد رکھی گئی۔ ۲۲ برس میں کروڑوں روپوں کی لاگت سے یہ عمارت تیار ہوئی۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا ہے "کہ تاج محل ایک اشک محبت ہے جو شاہ جہان کی چشم پرنم سے ٹپکا ہے۔" اس کی تعمیر میں تمام خوبیاں صرف کر دی گئیں اور آج تک کوئی شخص بھی فنی غلطی نہ نکال سکا۔ تاج محل میں بی بی خانم کے مقبرہ

Marfat.com

کی پیروی میں نہ خانہ، جہانگیر کے مقبرہ کی طرز پہ کونوں پہ چار مینار، انار کلی کے مقبرہ کی طرح بنیادیں، اکبر کے مقبرہ کے دروازہ کی طرح میناروں میں نفاست، دیوانِ عام دہلی کی طرح پہ اچین کاری، مقبرہ ہمایوں کی طرح بلند کرسی اور بغدادی مثمن، محمد غوث گوالیاری کے مزار کی طرح جالیوں میں عمدگی اور نفاست مقبرہ اعتماد الدولہ کی طرح تمام کی تمام سنگِ مرمر، بلند دروازہ اور مقبرۂ اکبر کے دروازہ کی طرح دروازوں پہ آیاتِ قرآنی، مغلیہ عمارات کی طرح باغات وانہار اور عمارات کا تقابل اور بلند و بالا دروازے اور دریا کا کنارہ، اور دوسری باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاج محل ۲۲ برس میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا بلکہ وہ مسلمانوں کے گیارہ صدیوں کے فنِ تعمیر کی فنی خصوصیات کا حامل ہے۔

Marfat.com

مُسلمانوں کی طبّی خدمات

انسانی معاشرہ میں ہر دور میں طبیب کا وجود بڑا ضروری ہے۔ انسان خواہ افریقہ کے گھنے جنگلوں میں رہتا ہو یا امریکہ اور سویڈن کے متمدن ترین شہروں میں، ہر جگہ طبیب کی ضرورت شدّت کے ساتھ محسوس کی گئی ہے مسلم سوسائٹی میں طبیب کو جو مقام حاصل ہے اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا شرف الدین العطائی نے فوائد فیروز شاہی میں ابواللیث فقیہہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جہاں یہ چھ چیزیں نہ ہوں وہاں رہائش اختیار نہ کرو۔

آبِ رواں، نقدِ رائج۔ قاضیٔ عالم۔ حاکمِ عادل۔ بازارِ آراستہ طبیبِ حاذق۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے:۔ علم دو ہیں، علمِ دین اور علمِ طب، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے علمِ دین کے ساتھ ساتھ علمِ طب کی طرف بھی توجہ دی اور اس فن میں وہ وہ کمالات دکھائے کہ اپنے اور بیگانے یہ کہہ اُٹھے کہ اگر آج ارسطو اور جالینوس زندہ ہوتے تو وہ بھی ان کی تصانیف کا احترام کرتے۔

Marfat.com

کتب احادیث میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات ملتے ہیں جن میں حضور نے بعض امراض کے لئے علاج تجویز فرمائے ہیں، مثلاً حضور کا ارشاد ہے کہ بخار کی تپش کو پانی ڈال کر ٹھنڈا کیا کرو۔ آج بھی جب بخار کا درجہ حرارت ایک خاص درجے سے بڑھ جاتا ہے تو ڈاکٹر مریض کے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھگو کر رکھتے اور درجۂ حرارت نیچے لاتے ہیں، شہد کے متعلق حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اس میں شفا ہے، بعض اہل علم نے اس طرف کافی توجہ دی ہے اور آج طبِ نبوی کے نام سے ایک کتاب ہمارے پاس موجود ہے۔

حضور سرورِ کائناتؐ کے شوق دلانے پر مسلمانوں میں علم طب کی تحصیل کا شوق پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ طبابت متقی اور دیندار مسلمانوں کا پیشہ بن گیا۔

عہد نبوی میں مدینہ طیبہ میں ام سلیمؓ، ام مطاعؓ، ام عطیہؓ، لیلیٰؓ، رفیدہ انصاریہؓ اور اسماء بنت ابوبکرؓ طبابت کے لئے مشہور تھیں۔

اموی عہد میں ابن آثال، تیاذوق، عیسیٰ بن حکم اور آخری دور میں جابر ابن حیان کا نام ملتا ہے جو اپنے دور میں طبابت اور حذاقت کے لئے مشہور تھے۔ عباسی حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی عباسی خلفاؑ نے علم طب کی طرف کافی توجہ دی اور ان کی قدردانی اور زر پاشیوں سے اس فن کو بڑی ترقی ہوئی۔ المنصور کے عہد میں جورجیس نامی ایک عیسائی طبیب کے کمالِ فن کا دُور دُور تک شہرہ تھا۔ اسی طرح ہارون الرشید کے عہد میں جبریل بن بختیشوع اپنے زمانے کا جالینوس مانا جاتا تھا، ہارون نے اُسے اپنا ندیم و مشیر بنا رکھا تھا اور شاہی دربا

Marfat.com

میں اس کی بڑی عزت اور تکریم کی جاتی تھی۔ ہارون نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ اگر کوئی شخص اُسے ملنا چاہے تو وہ پہلے جبریل سے ملے پھر اس کی وساطت سے مجھے ملے۔ جب جبریل کا انتقال ہوا تو مسلمان شعراء نے اُس کے مرثیے لکھے۔ اس سے اس کی عوام میں مقبولیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مامون الرشید کے عہد خلافت سے پہلے بھی کئی نامور طبیب، مثلاً جابر ابن حیان، جورجیس، جبریل بن بختیشوع اور تیاذوق ہو گذرے ہیں۔ لیکن اس چمن میں بہار اس وقت آئی جب ۸۳۳ء میں المامون نے بغداد میں بیت الحکمت قائم کیا اور وہاں ابوبکر محمد بن زکریا رازی، یوحنا بن ماسویہ اور حنین بن اسحٰق جیسے اطبا کو طبی تحقیق کے لئے مامور کیا۔

المعتصم کے عہد خلافت میں سلمویہ نامی ایک عیسائی طبیب کے کمالِ فن کا بڑا شہرہ تھا اور خلیفہ نے اُسے اپنا مشیر اور ندیم بنا لیا تھا۔ المعتصم کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ وہ یہ کہا کرتا تھا کہ میرے نزدیک سلمویہ کا مرتبہ قاضی القضاۃ سے کہیں زیادہ ہے۔ خلیفہ کی نظروں میں سلمویہ کا جو مقام تھا اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جب سلمویہ کا انتقال ہوا تو خلیفہ نے اپنے شاہی دربار میں اس کی میت کو لا کر رکھا اور پھر شاہی اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کا جنازہ اُٹھایا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عباسیوں کے ابتدائی دورِ حکومت میں جن غیر مسلم اطبا نے طبی خدمات انجام دی ہیں ان میں آلِ حنین،

Marfat.com

آل بختیشوع اور آل ماسرجویہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک طبّی کتابیں عموماً یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں، اس لئے وہ مسلمانوں کی دسترس سے باہر تھیں۔ عیسائی چونکہ یونانی زبان سے بخوبی واقف تھے اس لئے وہ بڑی آسانی کے ساتھ طبِ یونانی کا مطالعہ کرکے طبابت شروع کر دیتے تھے۔ جب المامون کے ایما پر بیت الحکمت میں یونانی کتابیں عربی میں ترجمہ ہونے لگیں تو پھر مسلمان اس فن میں غیر مسلموں کو کہیں پیچھے چھوڑ گئے۔ جس دور میں طب پر عیسائی اور صابی چھائے ہوئے تھے، اس دور میں جبریل بن بختیشوع، حنین، تیاذوق، یوحنا بن ماسویہ، ماسرجویہ، سلمویہ، قسطہ بن لوقا اور ابن البطریق نے بڑا نام پایا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بڑی ضروری ہے کہ قارئین کہیں سطور بالا سے یہ نتیجہ اخذ نہ کریں کہ مسلمانوں نے طب عیسائیوں سے سیکھی ہے یا پھر یونانیوں کی تحریروں سے۔ مسلمانوں نے ان سے یہ فن سیکھا ضرور ہے لیکن ان کی اندھی تقلید نہیں کی۔ مسلمانوں نے اپنے تجربات اور اجتہادات سے طب کے دامن کو مالا مال کر دیا ہے۔ مثلاً ابوالمنصور صاعد نے حکمائے یونان کے طریق علاج کے برعکس لقوہ اور فالج کا علاج ادویۂ باردہ سے کیا ہے۔ اسی طرح رضی الدین نے کثرت غذا سے علاج کیا ہے۔ اور ابن الوافد نے بھی علاج بالغذا پر زور دیا ہے۔ مسلمانوں نے جنون کے لئے افیون اور نکسیر کے لئے سرد پانی کا استعمال تجویز کیا ہے۔ ادحد الزمان ابوالبرکات نے ایک خاص دبائی مرض میں قطع انامل سے علاج کیا ہے چیچک کے مرض سے بچاؤ کی خاطر مسلمانوں نے ORAL VACCINATION کا طریقہ ایجاد

Marfat.com

نفسیاتی علاج بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اس موضوع پہ پورا ایک باب نظامی عروضی سمرقندی کے چہار مقالہ میں موجود ہے۔ ابن جلجل اور ابنِ البیطار نے نئی ادویہ دریافت کیں جن سے اطبائے یونان واقف نہیں تھے۔ اسی طرح مسلمانوں نے اوّل بار ریوند، کافور اور سنا کے خواص معلوم کئے اور جذام اور چیچک کے موضوع پہ رسالے لکھے۔ علم کیمیا تو خاص طور پہ مسلمانوں کا مرہونِ منت ہے۔ اگر کسی نے مسلمانوں کے اجتہادات کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کرنی ہوں تو اُسے التنوخی کی ــــ الفرج بعد الشدۃ ــــ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ آئندہ صفحات میں ہم چند نامور اطباء کا ذکر کریں گے، جن پہ طبِ اسلامی کو فخر ہے

جابر ابن حیان، جسے طبّی کتابوں میں بابائے کیمیا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، کا شمار ان اطباء میں ہوتا ہے جن پہ اُمت مرحومہ بجا طور پہ فخر کر سکتی ہے۔ جابر کے ہمعصروں میں کشتوں کی تیاری، تیزاب سازی اور معدنی نمکیات بنانے میں دنیا بھر میں اس کا کوئی مدِ مقابل نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس نے تصعید، ترشیح، تبخیر اور تقطیر کے فن کو ترقی دی اور تیزاب سے الکحل کو الگ کر کے اپنے ہمعصر اطباء سے خراجِ عقیدت وصول کیا۔ اسی طرح سنکھیا اور انٹی مونی کو دوسری دھاتوں سے الگ کر کے دنیا بھر کے اطبا سے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ عام طور پہ یہی مشہور ہے کہ نائٹرک ایسڈ، سلفیورک ایسڈ، نائیٹرو کلورک ایسڈ، لیبکر امیونیا، مرکری کلورائڈ، مرکری اوکسائڈ، پوٹاشیم نائٹریٹ، فرائی سلفاس اور الکحل اسی کی ایجاد ہیں۔۔

سنہ ۱۱۴۴ء میں ہی جابر کی کتابوں کے یورپی زبانوں میں ترجمے شروع

Marfat.com

ہو گئے تھے اور اسی زمانے میں رابرٹ چیٹر نامی ایک انگریز نے

THE BOOK OF THE COMPOSITION OF ALCHEMY

کے نام سے کتاب لکھ کر اہلِ انگلستان کو اس کے کارناموں سے روشناس کرایا۔

حنین بن اسحاق (۸۰۴ - ۸۷۴ء) کا شمار ان نامور عیسائی اطباء میں ہوتا ہے جو عہدِ اسلامی میں مسلمان حکمرانوں کی قدردانی اور زرپاشیوں کی بدولت مشہور ہوئے۔ حنین عربی زبان کے علاوہ یونانی اور سریانی زبانوں پر کامل دسترس رکھتا تھا، اس لئے اپنے معاصر مسلمان اطباء کی نسبت اُسے یونانی طبّی کتابوں سے استفادہ کرنے کا خوب موقع ملتا تھا۔ طبّی کتابوں کے حصول کی خاطر اس نے روم تک کا سفر بھی کیا تھا۔ اور اس سفر سے واپسی پر المامون نے اُسے دارالحکمت میں ملازم رکھ لیا، جہاں اس کا بیشتر وقت یونانی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کرنے پر صرف ہوتا تھا۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ ایک کتاب کا ترجمہ کر کے المامون کی خدمت میں پیش کرتا تھا تو وہ اُسے اس کتاب کے وزن کے برابر سونا عطا کرتا تھا۔

ابوبکر محمد بن زکریا رازی (۸۶۵ - ۹۲۵ء) جسے یورپ میں RHAZES کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کا شمار ان اطباء میں ہوتا ہے جن پر ملّتِ اسلامیہ کو بڑا ناز ہے۔ رازی ایک واسطے سے حنین بن اسحٰق کا شاگرد تھا اور اس کے استاد کے متعلق مشہور ہے کہ وہ یونانی، ایرانی اور ہندوستانی طب میں وقوف کامل رکھتا تھا۔ رازی کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی طبیعت جدّت پسند تھی اس لئے وہ نت نئے تجربے کرتا رہتا تھا۔

Marfat.com

رازی نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز رے کے ایک ہسپتال میں میں طبیب کی حیثیت سے کیا جہاں وہ تھوڑے ہی عرصہ میں افسر الاطباء بن گیا۔ کچھ عرصہ بعد اُسے بغداد کے ہسپتالوں کا افسر الاطباء مُقرر کیا گیا اور یہیں اس کی لیاقت کے اصلی جوہر کھلے۔ ایک کامیاب معالج کی حیثیت سے اس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی اور دنیا کے گوشے گوشے سے مایوس العلاج مریض اس کے پاس آنے لگے۔

رازی نے علمِ طب پر چھوٹی بڑی ۱۴۱ کتابیں لکھی ہیں، ان میں وہ ۱۲ رسالے بھی شامل ہیں جو اس نے علم کیمیا پہ لکھے ہیں۔ رازی کی سب سے اہم تصنیف الحاوی ہے جس کی بیس سے زیادہ جلدیں دریافت ہو چکی ہیں۔ ۱۴۸۶ء میں اس کتاب کا اوّل بار لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا اور اس کے بعد یہ کتاب یورپ میں بے حد مقبول ہوئی۔ اس کتاب میں رازی نے اپنا حاصل مطالعہ اور اپنے تجربات لکھ کر اپنے بعد آنے والے اطباء کے لئے ایک نئی شاہراہ کھول دی ہے۔

الحاوی کے علاوہ رازی نے جذام اور چیچک پہ دو الگ رسالے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک رسالے میں گردے اور مثانے سے پتھری نکالنے کے طریقے بتائے ہیں۔ ان کے علاوہ رازی نے علم تشریح البدن پہ بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ یورپ کے مستشرقین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یورپ میں میڈیکل سائنس کی ترقی میں الحاوی کو بڑا دخل حاصل ہے۔

علی بن عباس، جو یورپ میں HALY ABBAS کے نام سے مشہور ہے، دسویں صدی عیسوی کے نصفِ آخر میں بڑا نامور طبیب

Marfat.com

ہو گذرا ہے۔ وہ نسلاً ایرانی اور مذہباً مجوسی تھا، وہ چونکہ اسلامی عہد میں مسلمانوں کی معارف پروری کی وجہ سے مشہور ہوا اس لئے اس کی طبی خدمات کا ذکر بھی مسلمانوں کی طبی خدمات کے ضمن میں ہوتا ہے۔

اس نے علم طب پر۔ الملکی۔ کے نام سے ایک بلند پایہ کتاب لکھی جس پر مدتوں تک اس کے بعد آنے والے اطباء کا دارومدار رہا، لیکن جب بوعلی سینا نے۔ قانون۔ لکھی تو اس کے مقابلہ میں الملکی کی شہرت ماند پڑ گئی، الملکی کا ۱۵۲۳ء میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اور اس کے بعد یہ کتاب یورپ میں خوب مقبول ہوئی۔

علی بن عباس نے بڑے بڑے اطباء کے طریق علاج پر جی بھر کر تنقید کی ہے اور اس ضمن میں وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں کوئی طبیب اس وقت تک کامیاب طبیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ باقاعدہ ہسپتال جا کر مریضوں کا معائنہ نہ کرے، چنانچہ اس نے طبیب کیلئے ہسپتال کی حاضری لازمی قرار دی ہے۔

مسلمان اطبائیں ابن الجزار (م ۱۰۰۹ء) کا نام بڑے ادب واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس کی کتاب زاد المسافر عہد وسطیٰ میں ایشیا کے علاوہ یورپ میں بھی بڑی مقبول تھی۔ لاطینی زبان کے علاوہ اس کے عبرانی اور یونانی ترجمے بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ زاد المسافر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اندرونی امراض کی تشخیص اور ان کے طریق علاج پر بحث کی گئی ہے۔

شیخ الرئیس ابو علی حسین بن عبداللہ بن سینا، جو مغرب میں

Marfat.com

AVICENNA کے نام سے مشہور ہے، مسلمان اطباء میں امام کا درجہ رکھتا ہے خالقِ ارض وسماء نے اس کے ہاتھ میں ایسی شفا بخشی تھی کہ لوگ اُسے ایۃٌ مِنْ آیاتِ اللہ۔ کہتے تھے۔

بوعلی سینا سنہ ۹۸۰ء میں پیدا ہوا اس کا والد بلخ کا رہنے والا اور مذہباً اسمٰعیلی تھا۔ بوعلی نے جونہی ہوش سنبھالا اس کا والد بلخ سے ترک سکونت کر کے بخارا چلا گیا۔ اس زمانے میں بخارا کا شمار دنیائے اسلام کے بڑے بڑے علمی مراکز میں ہوتا تھا اور وہاں اس دور کے بہترین اساتذہ درس و تدریس میں مشغول تھے۔ بوعلی کی تعلیم و تربیت اسی مدینۃ العلم میں ہوئی اور اٹھارہ برس کی عمر میں اس کے فضل و کمال کا شہرہ دُور دُور تک پھیل گیا۔ سنہ ۹۹۷ء میں امیر بخارا ایک ایسی مرض میں مبتلا ہوا کہ اطباء اس کے علاج سے عاجز آ گئے۔ اس موقع پر بوعلی نے اس کا کامیاب علاج کر کے شاہی لائبریری سے استفادہ کرنے کی اجازت لے لی۔ سنہ ۱۰۰۴ء میں جب سلطان محمود غزنوی نے بخارا پر قبضہ کیا تو بوعلی کو غزنی آنے کی دعوت دی۔ بوعلی نے سلطان کی دعوت رد کر دی اور خیوہ میں شمس المعالی قابوس کے دربار میں پناہ لی۔ سنہ ۱۰۱۲ء میں قابوس نے وفات پائی تو بوعلی رے چلا گیا۔ بارہ برس بعد اس نے مستقل طور پر ہمدان میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں جون سنہ ۱۰۳۷ء میں درد قولنج سے اس کا انتقال ہوا۔

شیخ الرئیس کے متعلق مشہور ہے کہ سفر و حضر میں شاگردوں کا ایک جم غفیر اس کے ساتھ رہتا تھا اور وہ صبح و شام ان کو درس دیتا تھا۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ وہ لکھنے پڑھنے میں بھی کافی وقت صرف کرتا تھا۔ شیخ الرئیس نے طبی لٹریچر میں گراں قدر اضافہ کیا اور اس کی القانون

Marfat.com

کے مقابلہ میں میں رازی کی الحادی اور المجوسی کی الملکی کی شہرت ماند پڑ گئی القانون، جس کی وجہ سے بو علی سینا کا نام تا قیام قیامت زندہ رہے گا، کے پانچ حصّے ہیں۔ پہلے حصّے میں اس نے اصولِ طب کا ذکر کیا ہے، دوسرے حصّے میں مفردات سے بحث کی ہے۔ تیسرے حصّے میں سر سے پیر تک جسم کے ایک ایک حصّے کے امراض کا ذکر کیا ہے۔ چوتھے حصّے میں شیخ الرئیس نے امراضِ عامہ سے متعلق بحث کی ہے اور پانچویں حصّے میں مرکبات کا ذکر کیا ہے۔

القانون کا بارہویں صدی عیسوی میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا اور اس کے فوراً بعد یہ کتاب یورپ کے طبّی نصاب میں داخل ہو گئی۔ سنہ ۱۶۵۰ء تک القانون یورپ کی مشہور ترین یونیورسٹیوں LOUVAIN اور MONTPELLIER کے نصاب میں داخل رہی۔

یورپ میں اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۴۷۰ء سے لے کر سنہ ۱۵۰۰ء تک یہ کتاب سولہ بار طبع ہوئی سولھویں صدی میں اس کے بیس سے زائد ایڈیشن یورپ کے مختلف ممالک میں طبع ہوئے۔ اس کتاب کے متعلق ہمارے اطبا کا یہ قول ہے کہ اگر جالینوس اور بقراط زندہ ہو جائیں تو وہ بھی القانون کا احترام کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

ابوالقاسم الزہراوی، جس پر ملّتِ اسلامیہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے، قرطبہ کی ایک نواحی بستی مدینۃ الزہرا کا رہنے والا تھا۔ قرطبہ کا شمار اس زمانے میں دنیا کے بہترین علمی مراکز میں ہوتا تھا۔ الزہراوی نے اسی مدینۃ العلم میں اس عہد کے بہترین اساتذہ سے

Marfat.com

تعلیم پائی۔

الزہراوی ابھی نوعمر ہی تھا کہ اس کے کمالِ فن کا شہرہ پورے اندلس میں پھیل گیا۔ عبدالرحمٰن الثالث نے پہلے اُسے اپنا ذاتی معالج بنایا۔ بعدازاں اُسے شاہی ہسپتال کا ہاؤس سرجن مقرر کیا، اسی ہسپتال میں اُسے مختلف اقسام کے اپریشن کرنے کا موقع ملا۔ الزہراوی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ۔التصریف لمن عجز عن التالیف ۔ میں مختلف اقسام کے اپریشن کرنے کے طریقے بتانے کے علاوہ ان آلات کی تصویریں بھی دی ہیں جو اپریشن کے دوران استعمال ہوتے ہیں۔ الزہراوی کی اس کتاب کو پڑھ کر اور ان آلات کی تصویریں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں جراحی کا مکمل نظام موجود تھا۔

الزہراوی کا شمار ان نامور اطبا میں ہوتا ہے جنہوں نے امراضِ نسواں (GYNAECOLOGY) پہ کافی کچھ لکھا ہے۔ علم الولادت کا سرجری کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے اس لئے الزہراوی نے اپنی اس گراں قدر تصنیف میں دائیوں کو خاص ہدایات دی ہیں اس نے ان آلات کی تصویریں بھی دی ہیں جن سے مردہ بچے کو رحم سے باہر نکالا جاتا ہے۔ اسی ضمن میں الزہراوی نے تدابیر حوامل، منع اسقاط، عسر ولادت، تدبیر سلیان طمثِ حوامل اور اخراج جنین میت پہ بہت کچھ لکھا ہے۔ یورپ میں عہدِ جدید میں سائنس آف مڈوائفری نے جو ترقی کی ہے اس میں الزہراوی کے تجربات اور اس کی تحریروں کو بڑا دخل حاصل ہے۔

Marfat.com

امراضِ چشم (OPTHAL MOLOGY) پر بھی مسلمانوں نے کافی تحقیق کی ہے اور اس میدان میں وہ دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ عہد اموی میں زینب نامی ایک عورت ماہر امراض چشم تسلیم کی جاتی تھی اور دور دور سے لوگ اس سے علاج کرانے آتے تھے۔ تذکرۃ الکحالین میں ابن وصیف، جبریل کحال، شریف کحال اور علی بن عیسیٰ کحال کا ذکر موجود ہے۔ یہ لوگ اپنے دور میں اپنے فن میں اپنا مدِ مقابل نہیں رکھتے تھے۔ اسی ضمن میں علی ابن عیسیٰ بغدادی اور عمار موصلی نام کے دو ماہرین کا ذکر بیجا نہ ہوگا، جنہوں نے امراضِ چشم پر دو کتابیں قلمبند کیں۔ ان لوگوں نے اس فن پر یونانیوں سے کہیں زیادہ کام کیا۔ اور اپنے تجربے، مشاہدے اور حاصل مطالعہ ان کتابوں میں درج کیا۔ ان کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا اور ۱۷۵۰ء تک ان کی یہ کتابیں یورپ کے طبی نصاب میں شامل رہیں۔ جرجی زیدان نے اپنی مشہور تصنیف ۔ تاریخ التمدن الاسلامی۔ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ موتیا بند کا علاج اب بھی وہی ہے جو مسلمان اطباء اس دور میں کیا کرتے تھے۔

ابو علی الحسن ابن الحسن ابن الھیثم (۹۶۵ء - ۱۰۳۹) جو امام بصریات کے لقب سے مشہور ہیں، اپنے دور میں اپنے فن میں دنیا بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے اوّل بار اپنی تالیف ۔ کتاب المناظر۔ میں نظریۂ بصارت کی صحیح وضاحت کی۔ وہ پہلے مسلمان ماہر طبیعیات اور طبیب تھے جنہوں نے روشنی اور رنگ، اشعۂ نور کے انعکاس و انعطاف، اغلاط بصری، شفق اور قوس قزح کی حقیقت، ہالہ، مرایا،

Marfat.com

قوت ثقل، خلا اور تحرکات کے بارے میں توجیہہ کی۔ ان کی۔ کتاب المناظر۔ تو زمانے کے ظالم ہاتھوں سے محفوظ نہیں رہی تاہم اس کا ترجمہ (ON OPTICS) کے نام سے موجود ہے۔ اس کتاب میں ابن الھیثم نے اقلیدس اور بطلیموس کے اس نظریئے کی تردید کی ہے کہ نگاہ آنکھوں سے نکل کر مختلف چیزوں پہ پڑتی ہے اور انھیں دیکھتی ہے۔ ان کی تحقیق یہ تھی کہ خارجی چیزوں کا عکس آنکھ کی پتلی پہ پڑتا ہے جسے دماغ کا ایک عصب محسوس کرتا ہے۔ ابن الھیثم کو THEORY OF VISION کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور انہی کے نظریہ پہ تحقیق کر کے دورِ جدید کے سائنسدان کیمرہ، ٹیلی ویژن اور عینک بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ابوالمنصور صاعد بن بشر بن عبدوس کا شمار دنیائے اسلام کے نامور ترین اطباء میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے وقت کا بہترین فصّاد تھا اور دُور دور سے لوگ فصد کھلوانے کے لئے اس کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ المنصور کی طبیعت بڑی حد تک جدّت پسند تھی اور وہ مریضوں کا علاج کرتے ہوئے ان پہ نت نئے تجربے کرتا رہتا تھا۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ عام اطباء کے برعکس لقوہ اور فالج کا علاج ادویۂ باردہ سے کیا کرتا تھا۔

علاؤالدین ابوالحسن علی بن حازم قریشی، جنہیں طبی دنیا میں جالینوس ثانی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ عرب اطبا کے سرتاج مانے جاتے ہیں۔ وہ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے لیکن ان کی عمرِ عزیز کا بیشتر حصّہ دمشق میں گذرا اور وہیں ۷۷۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے شیخ الرئیس

Marfat.com

کی شہرۂ آفاق تالیف ۔ قانون ۔ کا خلاصہ ۔ قانونچہ ۔ کے نام سے تیار کیا۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے فصول لقراط کی دو شرحیں لکھ کر اپنے وقت کے اطبا سے خراجِ عقیدت وصول کیا۔

مسلمان اطبا میں قاضی عبداللطیف بغدادی علم التشریح البدن کے امام تسلیم کئے جاتے ہیں، وہ اپنی تحقیقات کے سلسلے میں بڑے طویل سفر کیا کرتے تھے۔ ایک بار وہ اسی سلسلے میں مصر گئے اور وہاں مقس کے ایک ٹیلے پر اُنھوں نے بیس ہزار کے قریب انسانی ڈھانچے دیکھے۔ اُنھوں نے ان ڈھانچوں کی ساخت کا بڑے غور سے مطالعہ کیا اور اس کی تفصیل اپنے سفرنامہ میں درج کی، اسی طرح اُنھوں نے بوصیر کے قبرستان میں خاص قسم کی انسانی ہڈیوں کا مشاہدہ کیا ان کا کہنا ہے کہ اس سے پہلے ایسی ہڈیاں ان کی نظر سے نہیں گزری تھیں۔ قاضیٔ موصوف یہ کہا کرتے تھے کہ اگر جالینوس نے بھی میری طرح انسانی ڈھانچوں پر تحقیق کی ہوتی تو پھر وہ اتنی غلطیاں نہ کرتا۔

منصور بن محمد نام کے ایک مسلمان طبیب کا ذکر بھی اکثر کتابوں میں دیکھنے میں آیا ہے، وہ بھی علم التشریح البدن کا بڑا ماہر تھا۔ اس نے ۱۳۹۶ء میں اپنا حاصل مطالعہ ۔ کتاب التشریح ۔ کے نام سے قلمبند کیا اور اس کتاب میں اُنھوں نے جا بجا مختلف اقسام کی ہڈیوں کی تصویریں بھی دی ہیں۔ اس کتاب کا ایک مصوّر نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔

جس طرح موجودہ زمانے میں بعض امراض کے SPECIALISTS

Marfat.com

موجود ہیں اسی طرح مسلمانوں کے ہاں بھی قرونِ وسطیٰ میں SPECIALISTS موجود تھے۔ ابن عکاشہ اپنے دور میں امراض مثانہ کا ماہر تسلیم کیا جاتا تھا اور ہارون بن موسیٰ الاشنبوتی سرجری کے فن میں اپنی نظیر آپ تھا۔ صاعد بن لبشر بن عبدوس فصد کھولنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اور دوا سازی میں ابن البذوخ، احمد بن یونس، التمیمی، عمر بن یونس، غافقی، ابن جلجل، رشید الدین اور ابن البیطار بڑے مشہور ہوئے ہیں اسی طرح بعض اطبا کے ناموں کے ساتھ فصّاد، اسنانی اور کحال کی نسبتیں پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے مخصوص فن میں بڑا نام پایا ہے۔

مسلمان اطباء کے زمرہ میں اگر ابو علی التنوخی (۹۹۴ - ۹۳۳ء) اور اس کی مشہور تالیف الفرج بعد الشدۃ کا ذکر نہ کیا جائے تو ان کا تذکرہ نامکمل رہے گا۔ اس کتاب کے چودہ ابواب ہیں اور ان میں بڑے مزے کی حکائتیں درج ہیں۔ التنوخی نے ان حکائتوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بعض اوقات بڑے بڑے اطباء بھی عام علاج کی بجائے محض ٹوٹکوں سے کامیاب علاج کرتے ہیں، یا اگر کبھی اطبا کسی مریض کے علاج سے عاجز ہو گئے ہیں تو اتفاقیہ مریض کے ہاتھ کوئی ایسی چیز لگ گئی جسے کھانے سے وہ صحت یاب ہو گیا۔ راقم الحروف نے تاریخ کے شہرۂ آفاق استاد پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب کو ایک نجی محفل میں فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بعض امراض کے علاج یونہی اتفاقیہ دریافت ہوئے ہیں۔

التنوخی لکھتا ہے کہ رازی کے پاس ایک مریض آیا جو استسقاء کے

Marfat.com

مرض میں مبتلا تھا۔ رازی نے اس کا معائنہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا مرض اتنا بڑھ چکا ہے کہ اب لا علاج ہو گیا ہے۔ رازی نے اس مریض کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ گھر جا کر آرام کرو اور جو چاہو کھاؤ پیو۔ تقریباً سال بھر کے بعد رازی کا اس طرف سے گذر ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ شخص نہ صرف یہ کہ تندرست ہو چکا ہے بلکہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ تنومند ہے۔ رازی نے بڑی حیرت سے اس سے حال دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ اپنی زندگی سے تنگ آ چکا تھا اور اسی سوچ میں تھا کہ کسی طرح اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے۔ ایک دن ایک سانپ ادھر آ نکلا اور اس نے چھاچھ کو دودھ سمجھ کر ایک پیالہ میں منہ ڈالا۔ جب سانپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے وہ چھاچھ پیالہ میں اگل دی جس سے چھاچھ کا رنگ بدل گیا۔ جب وہ سانپ وہاں سے چلا گیا تو اس شخص نے خودکشی کی نیت سے وہ چھاچھ پی لی۔ چھاچھ کا پینا تھا کہ اُسے نیند آ گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ پسینہ سے شرابور تھا اور اس کی بیماری جاتی رہی تھی۔

الفرج بعد الشدۃ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی علاج کارگر نہ ہوتا تھا تو بعض اطبا سکتے کے مریض کو کوڑے مارتے تھے۔ اسی طرح فالج کے مریض کو دودھ میں حنظل اُبال کر پلاتے تھے اور ذات الجنب کے مریض کے لئے بچھو کا ڈنک تجویز کرتے تھے، اس کتاب میں اس طرح کی درجنوں حکایات ہیں جن کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات ٹوٹکوں سے بھی کامیاب علاج ہو جاتا تھا۔

مسلمانوں نے امراضِ نسواں پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ ابو القاسم

Marfat.com

الزہراوی نے اس سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ شیخ الرئیس ابن سینا، یوحنا بن ماسویہ، ابوبکر محمد بن زکریا رازی اور عبداللطیف بغدادی نے بھی اس موضوع پہ کافی کچھ لکھا ہے۔ عہد نبوی میں اسماء بنت ابوبکرؓ، ام سلیمؓ، ام مطاعؓ، ام عطیہؓ، لیلیٰؓ اور رفیدہ انصاریہؓ عورتوں کے علاج کے لئے خاص طور پہ مشہور تھیں۔ اموی عہد میں زینب نامی ایک عورت امراض چشم کے علاج کے لئے مشہور تھی۔ خلیفہ منصور کے عہد میں حفید کی بہن اور بھانجی شاہی حرم میں بیگمات کا علاج کیا کرتی تھیں۔ ان میں ام الحسن بنت قاضی ابوجعفر اندلسی کی حذاقت کا دور دور تک شہرہ تھا۔ عہد شاہجہان میں ملک الشعرأ طالب آملی کی بہن ستی النسأ عورتوں کے علاج کیلئے خاص طور پہ مشہور تھی اور شاہی حرم میں اسی کا علاج ہوتا تھا۔

مسلمان اطباء نے جہاں نسوانی امراض کے بارے میں کافی کچھ لکھا ہے وہاں عورتوں کے لئے گلگونے اور غازے بھی تیار کئے ہیں۔ ان کے استعمال کے لئے عطریات اور خضاب بنائے ہیں۔ چہرے سے مہاسے اور چھائیاں دور کرنے کے لئے دوائیاں ایجاد کی ہیں۔ اسی طرح رنگ گورا کرنے کے لئے اُبٹن اور بال بڑھانے کے تیل تیار کئے ہیں۔

عباسی عہد میں اسکندریہ، رُہا اور جندی شاپور میں میڈیکل کالج موجود تھے جہاں طلبا کو باقاعدہ علم طب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ نظامی عروضی کی ایک تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کالجوں میں سات سال کا نصاب تھا۔ فاضل مصنف چہار مقالہ میں لکھتے ہیں کہ میرے زمانے

Marfat.com

میں میڈیکل کالجوں میں فصولِ بقراط، مسائل حنین بن اسحٰق، شرح نیلی، الحاوی، قانون، ذخیرۂ ثابت بن قرہ، منصوری، اغراض الطب، ذخیرہ خوارزم شاہی اور کامل الصناعۃ پڑھائی جاتی ہیں۔

ان طالب علموں کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ انسانی لاشوں کو چیر پھاڑ کر دیکھیں تاکہ وہ جان سکیں کہ قدرت نے انسانی ڈھانچہ کس طرح سے بنایا ہے اور انسان کے اندرونی اعضاء کی ساخت کیا ہے شیخ الرئیس ابن سینا کا قول ہے کہ جب تک کوئی طبیب انسانی لاشوں کو چیر پھاڑ کر نہ دیکھے اس وقت تک وہ کامیاب طبیب نہیں بن سکتا۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب طلباء اپنا کورس ختم کر لیتے تھے تو پھر باہر طبیب ان کا امتحان لیتے تھے اور امتحان میں کامیاب ہونے والے طلباء کو باقاعدہ سند دی جاتی تھی ایک دوسری روایت سے یہ معلوم ہوا ہے کہ خلیفہ المقتدر کے عہد میں کسی نیم حکیم نے ایک مریض کو غلط علاج سے مار ڈالا تو خلیفہ نے یہ حکم صادر کیا کہ سنان بن ثابت بغداد کے تمام اطباء کا انٹرویو لے اور جو طبیب اس کے معیار پر پورا نہ اترے اُسے طبابت سے روک دے مصر میں یہی کام مہذب الدین نے انجام دیا۔ ہمارے خیال میں یہ اطباء کی رجسٹریشن کی طرف پہلا قدم تھا۔

مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں دنیائے اسلام میں ہسپتالوں کا ایک جال بچھا دیا۔ عبدالملک بن مروان نے دماغی امراض کے علاج

Marfat.com

کے لئے دارالمجانین کے نام سے ایک ہسپتال قائم کیا۔ ہارون الرشید نے بغداد میں ایک عالیشان ہسپتال بنوایا۔ البرامکہ نے اپنے خرچ سے عوام کے فائدے کے لئے ایک ہسپتال قائم کیا۔ المتوکل کے وزیر فتح بن خاقان نے بیمارستان مغافر کے نام سے ایک ہسپتال بنوایا المقتدر کے عہد میں اس کے وزیر علی بن عیسٰی نے بیمارستان حربیہ کے نام سے ایک ہسپتال قائم کیا۔ ان کے علاوہ بغداد میں بیمارستان عضدی، بیمارستان السیّدہ، بیمارستان ابن الفرات اور بیمارستان مقتدری کے نام سے چار اور ہسپتال موجود تھے۔ عین ممکن ہے کہ آج کل بغداد میں اتنے ہسپتال نہ ہوں جتنے آج سے ہزار سال پہلے موجود تھے۔

مقریزی نے قاہرہ کے پانچ ہسپتالوں کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ ان میں سے اولین ہسپتال احمد بن طولون نے ۸۷۳ء میں قائم کیا تھا اور اس کی تعمیر پہ ساٹھ ہزار دینار خرچ ہوئے تھے۔ قاہرہ کا دوسرا اہم ہسپتال بیمارستان الکبیر تھا جو ملک المنصور نے ۱۲۸۵ء میں قائم کیا تھا۔ اس ہسپتال کا سالانہ خرچ دس لاکھ درہم کے لگ بھگ تھا۔ اس ہسپتال کی جو تفصیل مقریزی نے دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ہسپتال میں مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ وارڈ تھے۔ زنانہ وارڈوں میں نرسیں اور مردانہ وارڈوں میں خدام مریضوں کی خدمت پہ مامور تھے۔ اس کے علاوہ مختلف امراض کے مریضوں کے لئے الگ الگ وارڈ تھے۔ ایک وارڈ میں صرف بخار کے مریض رکھے جاتے تھے اور دوسرا وارڈ صرف بخار میں مبتلا مریضوں کیلئے

Marfat.com

مخصوص تھا۔ اسی طرح ایک وارڈ میں وہ مریض رکھے جاتے جن کے اپریشن کئے جاتے تھے اور ایک وارڈ آنکھوں کے علاج کے لئے وقف تھا۔ ہسپتال میں مریضوں کے لئے پرہیزی غذائیں تیار کرنے کے لئے باورچی خانے موجود تھے۔ ڈسپنسری اور اس کے ساتھ ادویہ کے لئے سٹور موجود تھے جہاں ہر وقت دوائیوں کا بڑا اسٹاک موجود رہتا تھا، ہسپتال کے سٹاف کے لئے رہائشی کوارٹرز بھی بنے ہوئے تھے مقریزی کے اس بیان کو پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ بیمارستان الکبیر کسی طرح بھی ہمارے عہد کے کسی ہسپتال سے پیچھے نہیں تھا۔

برِّ صغیر پاک و ہند میں محمد بن تغلق نے ہسپتال بنانے میں بڑی دلچسپی لی۔ ایک روائت کے مطابق اس کے عہد میں صرف دہلی میں ہی ستر کے قریب ہسپتال اور ڈسپنسریاں موجود تھیں۔ سلطان بذاتِ خود بڑا اچھا طبیب تھا اور وہ مریضوں کا معائنہ کر کے ان کے لئے نسخے تجویز کر دیتا تھا۔ اس کے جانشین فیروز تغلق نے اپنی تصنیف فتوحاتِ فیروز شاہی میں شفا خانے تعمیر کرنے کا ذکر کیا ہے۔ جہانگیر نے بھی تخت نشین ہوتے ہی اپنی قلمرو میں شفا خانے تعمیر کرنے کا حکم صادر کیا تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں بعض علاقوں میں شہروں سے دور دیہات میں رہنے والوں کی سہولت کے لئے سفری شفا خانے موجود تھے۔ عباسی خلیفہ المقتدر کے عہد خلافت میں سنان بن ثابت ایسے شفا خانوں کا انچارج تھا۔ اکثر کتابوں میں ایسے حوالے عام ملتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کے علاج کے لئے جیلوں میں بھی شفا خانے

Marfat.com

موجود تھے۔

سطورِ بالا کی روشنی میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں پوری دنیائے اسلام میں ہسپتالوں کا ایک جال بچھا دیا اور اپنے تجربات اور اجتہادات سے فنِ طب کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ یہ مسلمان ہی تھے جن کی وجہ سے جالینوس اور بقراط کو شہرتِ دوام ملی یہاں یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ طبِ اسلامی، طبِ یونانی کا ہی دوسرا نام ہے۔ آج جسے طبِ اسلامی کہتے ہیں وہ طبِ یونانی، طبِ ایرانی، طبِ ہندوستانی اور طبِ مصری کا حسین امتزاج ہے۔ یہاں بھی یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ مسلمانوں نے دوسری اقوام کے تجربات سے فائدہ ضرور اُٹھایا ہے۔ لیکن ان کی کورانہ تقلید نہیں کی، بلکہ اپنے اجتہادات اور تجربات سے طبِ اسلامی کے نام سے ایک الگ عمارت کھڑی کر دی ہے۔

موجودہ ایلوپیتھی کی ترقی میں مسلمانوں کی تصانیف اور ان کے لاطینی تراجم کو جو دخل حاصل ہے اس کا ذکر بھی گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ آج جدید میڈیکل سائنس کی کتابیں طبِ اسلامی کی اصطلاحات سے مملو ہیں۔ آج بھی یورپ کے میڈیکل کالجوں میں لیکچروں کے دوران اساتذہ بار بار AVICENNA، ALHAZEN، GABER، RHAZES، HALY ABBAS اور AVERROES کا حوالہ دیتے ہیں۔

اس ضمن میں ہم نے مسلمانوں کی طبی خدمات کا ایک بہت ہی مختصر سا جائزہ لیا ہے، اگر ان کی خدمات کا مفصل ذکر کرنا ہو تو۔

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

Marfat.com

داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد

تعمیر ملت کے اہم فریضہ کو جس انہماک، خلوص اور اہتمام سے صوفیائے کرام نے انجام دیا ہے اس کی مثال دوسرے مذاہب کی تاریخ میں مفقود ہے۔ یہ صوفیائے کرام ہی کی مساعی جمیلہ کا ثمرہ ہے کہ آج برّ صغیر پاک و ہند میں اسلام کے سولہ سترہ کروڑ نام لیوا موجود ہیں اور آج ان دونوں ملکوں کی لاکھوں مساجد سے روز و شب میں پانچ بار صدائے توحید بلند ہوتی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اگر آپ ان بزرگوں کے کارناموں، ان کی تعلیمی اور تبلیغی کوششوں اور سوانح حیات سے واقفیت پیدا کرنا چاہیں تو آپ کو صحیح اور مستند حالات نہ مل سکیں گے ان کے متعلق جس قدر لٹریچر ملتا ہے اس پر کشف و کرامات اور عقیدت کی کُہر چھائی ہوئی ہے اور جس قدر روایات ملتی ہیں ان سے ہم ان بزرگوں کی سیرت نگاری تو درکنار ان کی دھندلی سی تصویر بھی نہیں بنا سکتے۔ صوفیوں کے تذکروں کے متعلق عموماً اور خزینۃ الاصفیاء کے متعلق خصوصاً مشہور تاریخ دان پروفیسر محمد حبیب فرماتے ہیں، "اس کتاب کا بڑا نقص یہ تھا کہ مصنف نے عقاید کا سہارا لیکر ان تمام اصول اسناد کو یکسر نظرانداز کر دیا تھا جو علمائے اسلام

کی نظر میں صدیوں تک علم و حکمت کی روح سمجھے جاتے رہے ہیں، تنقیدی اصولوں سے چشم پوشی کر کے محض عقاید پر علم کی عمارت تعمیر کرنا نا سمجھی نہیں تو کیا ہے۔[1]

تاریخ مشائخ چشت کے دیباچہ میں موصوف لکھتے ہیں، اس قسم کی تحریریں متضاد افکار کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہیں اور بالآخر ان کا نتیجہ بدعقیدگی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیاء نے اپنی کتاب میں ہیبت ناک قسم کی ایسی کرامات کی تفصیل دی ہے جن کو پڑھ کر انسانی عقل و خرد کو شرم آجاتی ہے موجودہ نسلیں ان پر بحث و مباحثہ کرنے کی بجائے بے توجہی سے ان کو نظر انداز کرنا بہتر سمجھتی ہیں، ظاہر ہے کہ ان کشف و کرامات کے بے معنی قصوں کا تصوف سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ شیخ نظام الدین اولیا کا کہنا ہے کہ کرامات تصوف کے سلسلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔[2]

ہمارے سوانح نگاروں مثلاً علامہ فرید الدین عطارؒ، مفتی محمد سرور لاہوری، امیر حسن سجزیؒ، نور احمد چشتیؒ، شیخ الہدیہ اور صاحبزادہ کمال الدین محمد احسان نے محیر العقل روایات لکھ کر فن سوانح نگاری اور اصولِ تذکرہ نویسی سے انحراف کیا ہے۔ ان کی بدولت غلط روایات خاص و عام میں مشہور ہو گئیں، ان میں سے ایک حضرت داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد کے متعلق ہے۔

---

[1] خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۳ء ص ۲۰-۲۱

[2] ایضاً۔

Marfat.com

خواجہ حسن سجزیؒ فوائد الفواد میں داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد کے متعلق لکھتے ہیں :۔

شیخ حسین زنجانی و شیخ علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہما ہر دو مرید یک پیر بودہ اند و آن پیر قطبِ عہد بودہ است، شیخ حسین زنجانی از دیرباز ساکن لہاور بود، بعد از چند گاہ پیر ایشان خواجہ ہجویری را فرمودہ کہ در لہاور رَو و ساکن شو، شیخ علی ہجویری عرض داشت کرد کہ حسین زنجانی آنجا ہست، پیر فرمودہ کہ تو برو، و چوں علی ہجویری بحکم اشارت ایشاں در لہاور در آمد شب بود با مداد آں جنازہ شیخ حسین زنجانی را بیرون آوردند[۵۳]

شیخ حسین زنجانی اور شیخ علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہما دونوں ایک ہی پیر کے مرید تھے اور وہ پیر اپنے وقت کے قطب تھے۔ شیخ حسین زنجانی مدت سے لاہور میں قیام پذیر تھے۔ کچھ مدت بعد ان کے پیر نے خواجہ ہجویری سے فرمایا کہ لاہور جاؤ اور وہیں رہو۔ شیخ علی ہجویری نے عرض کی کہ حسین زنجانی جو وہاں ہیں۔ پیر نے فرمایا کہ تم جاؤ، جب علی ہجویری ان کے حکم کے مطابق لاہور پہنچے تو اس وقت رات ہو چکی تھی۔ اگلی صبح لوگ شیخ حسین زنجانی کا جنازہ اٹھائے باہر نکلے۔

یہ روائت کثرت سے تذکروں میں پائی جاتی ہے کہ اب ہر شخص بلا چون و چرا اسے تسلیم کر چکا ہے اور اس کا منکر بدعقیدہ اور بد مذہب ہونے کی تہمت سے نہیں بچ سکتا۔ ہمارے خیال میں یہ روایت سراسر غلط اور الحاقی معلوم ہوتی ہے۔ اس روائت کا تجزیہ کرنے کے لئے سب سے پہلے ہم اس روائت کے الفاظ پہ غور کریں گے اس کے بعد اسے تاریخ کی کسوٹی پر رکھیں گے۔

---

[۵۳] خواجہ حسن سجزی، فوائد الفواد، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۵۷

Marfat.com

اس روائت میں حضرت داتا گنج بخش کو ایک جگہ شیخ علی ہجویری، دوسری جگہ خواجہ ہجویری اور تیسری جگہ علی ہجویری لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت حسین زنجانیؒ کو ایک جگہ شیخ حسین زنجانیؒ، دوسری جگہ حسین زنجانیؒ اور تیسری جگہ پھر شیخ حسین زنجانی لکھا ہوا ہے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ خواجہ حسن سجزی جیسا ذمہ دار تذکرہ نویس اور فاضل اجل ایسی شتر گربگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ فوائد الفواد تو ایسی بلند پایہ اور مستند کتاب ہے کہ امیر خسرو اسے دیکھ کر اکثر فرمایا کرتے تھے۔

کاشکے تمام تصنیفات من بنام حسن بودی
و ایں کتاب از من بودی۔[1]

کاش میری تمام تصانیف حسن کے نام ہوتیں اور یہ کتاب میرے نام ہوتی۔

ہمارے خیال میں یہ روائت الحاقی ہونے کے ساتھ ساتھ کسی کم عقل کی گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ خواجہ حسن سجزی کو سید علی ہجویری کی بجائے گنج بخشؒ لکھنا چاہیے تھا، یہ خطاب سید علی ہجویری کو خواجہ موصوف کے پیر چہارم خواجہ معین الدین اجمیریؒ عطا فرما چکے تھے، اس لئے انھیں سنت شیخ کا ادب کرنا چاہیے تھا۔

فوائد الفواد کے متعلق علم تاریخ کے ممتاز عالم اور رائم الحروف کے استاد مرحوم پروفیسر محمد شجاع الدین ماہنامہ "دارالفرقان"، بابت ماہ جنوری ۱۹۵۵ء میں اپنے ایک مضمون بعنوان "حسن سجزی" میں تحریر فرماتے ہیں "کہ ان ملفوظات میں بہت سی الحاقی باتیں بھی شامل ہو چکی ہیں"۔ ہمارے بیشتر اکابر کی تصانیف میں تحریف ہو چکی ہے۔ بسا اوقات ایک ہی کتاب کے دو نسخے آپس میں نہیں ملتے۔ اسی طرح کئی فرضی کتابیں مثلاً شجاع حیدری، دیوان خواجہ معین الدین حسن اجمیریؒ، دیوان خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور دیوان زیب النساء وجود میں آچکی ہیں۔ شیخ عبدالحق

---

[1] شیخ عبدالحق محدثؒ، اخبار الاخیار، مطبوعہ، دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۱۰۱

Marfat.com

محدّث دہلویؒ کے زمانے تک شیخ بو علی قلندر پانی پتیؒ کی مثنویات اور رسائل عام ہو چکے تھے، شیخ محدثؒ نے انہیں مخترعات عوام بتایا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ تزک جہانگیری کے مختلف نسخوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے جب یار لوگوں نے حدیثیں گھڑ کر صحاح ستہ میں شامل کر دی ہیں تو پھر صوفیوں کے تذکروں کا کہنا۔ حقائق بالا کی روشنی میں فوائد الفواد کی روایات پر کیونکر اعتماد کیا جائے۔ ہمارے خیال میں جن کتابوں میں فوائد الفواد کے حوالے سے یہ روائت بیان کی گئی ہے وہ بھی پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہیں۔

اس روائت میں شیخ حسین زنجانیؒ اور سید علی ہجویریؒ کو ایک ہی پیر کا مرید ظاہر کیا گیا ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ ہم عصر تھے۔ جہاں تک تاریخی شواہد کا تعلق ہے شیخ حسین زنجانیؒ اور سیّد علی ہجویری ہم عصر نہیں بلکہ شیخ حسین زنجانیؒ اور خواجہ معین الدین حسن اجمیریؒ ہم عصر ہیں۔ سیر العارفین میں شیخ جمالی کنبوہؒ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

حضرت شیخ المشائخ حسین زنجانی کہ پیر حضرت شیخ سعد الدین حمویہ قدس روحہٗ است در صدر حیات بود میان حضرت زبدۃ المشائخ والاولیا معین الحق والدین قدس سرہٗ و حضرت شیخ المشائخ والاولیا شیخ حسین زنجانی قدس سرہٗ محبتے و اتحادی فوق الحد واقع شد[۶]

حضرت شیخ المشائخ حسین زنجانی جو حضرت شیخ سعد الدین قدس سرہٗ کے پیر ہیں، ان دنوں حیات تھے۔ حضرت زبدۃ المشائخ والاولیا معین الحق والدین قدس سرہٗ اور حضرت شیخ المشائخ والاولیا شیخ حسین زنجانی قدس سرہٗ کے درمیان بے حد محبت اور ربط و ضبط تھا۔

۶۔ شیخ جمالی، سیر العارفین، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری نمبر ۵ II ۲۴ ، ورق ۳ب۔

Marfat.com

عمل صالح کا مصنف محمد صالح کنبوہ بھی خواجہ صاحبؒ کے حالات کے ضمن میں رقمطراز ہے:۔

بالجملہ در لاہور بہ صحبت شیخ حسین زنجانی رسیدہ[۵۷]	مختصر یہ کہ انہیں لاہور میں شیخ حسین زنجانیؒ کی صحبت میسر آئی۔

دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیا میں اس بات کا ذکر بالصراحت کیا ہے کہ خواجہ اجمیریؒ کی لاہور میں شیخ حسین زنجانیؒ سے ملاقات رہی[۵۸]

ان روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ اور حضرت حسینؒ زنجانی ہم عصر تھے اور دونوں میں بڑی محبت تھی۔

خواجہ معین الدینؒ کے ایک ہم عصر مؤرخ منہاج سراج جوزجانی اپنی مشہور تصنیف طبقاتِ ناصری میں خواجہ صاحب کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایں داعی از ثقہ شنید کہ از معارف جبال بلاد تولک بود لقب او معین الدین او می گفت کہ من دراں لشکر با سلطان غازی می بودم[۵۹]	اس دعا گو نے قابل اعتبار لوگوں سے یہ سنا ہے کہ بلاد جبال کا ایک درویش جس کا لقب معین الدین تھا، یہ کہا کرتا تھا کہ میں سلطان (شہاب الدین غوری) کے لشکر میں غازی کی حیثیت سے شامل تھا۔

خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے جس جنگ میں شرکت فرمائی تھی وہ ترائن

---

۵۷ محمد صالح، عمل صالح، جلد اوّل، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء، ص ۵۰

۵۸ دارا شکوہ، سفینۃ اولیاء، (اردو ترجمہ) مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء، ص ۱۲۸

۵۹ جوزجانی، طبقات ناصری، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء، ص ۳۵

Marfat.com

کی دوسری جنگ تھی جو ۱۱۹۲ء میں لڑی گئی تھی۔ حضرت داتا گنج بخش رح نے ۱۰۷۶ء میں یا اس کے فوراً بعد وفات پائی ہے[۱۰]، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جن ایام میں خواجہ صاحب لاہور میں حسین زنجانی رح کے ساتھ مقیم تھے اس وقت حضرت داتا گنج بخش رح کو فوت ہوئے تقریباً ایک صدی گذر چکی تھی۔ اس لئے حضرت داتا گنج بخش اور حسین زنجانی ہم عصر نہیں ہو سکتے۔

تحقیقات چشتی کی روایت کے مطابق حضرت شیخ حسین زنجانی رح ۶۰۴ھ میں فوت ہوئے تھے[۱۱]۔ مفتی غلام سرور کی تحقیق کے مطابق ۶۰۰ھ ان کا سالِ وفات ہے[۱۲]۔ مولوی نور احمد چشتی اور مفتی غلام سرور لاہوری، دونوں نے حضرت داتا گنج بخش کا سالِ وفات ۴۶۵ھ تحریر کیا ہے۔ ان کے اس بیان کے مطابق جب حضرت حسین زنجانی رح فوت ہوئے اس وقت داتا گنج بخش رح کو انتقال کئے ۱۳۹ یا ۱۳۵ سال گذر چکے تھے۔ اب آپ یہ اندازہ لگائیے کہ صاحبِ فوائد الفواد کی یہ روائت کہ جب داتا گنج بخش رح لاہور پہنچے تو اس وقت رات تھی۔ اگلی صبح حضرت حسین زنجانی رح کا جنازہ اُٹھا، کہاں تک صحیح ہے؟۔

---

[۱۰] شیخ محمد اکرام نے آب کوثر مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۷۷، پر داتا صاحب رح کا سال وفات ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء بتایا ہے، جو غلط ہے۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب نے داتا گنج بخش کے حالات میں جو فاضلانہ کتاب تحریر فرمائی ہے اس میں وہ اس سن پر متفق نہیں ہیں۔ اور اورینٹل کالج میگزین میں آقا یحییٰ جیبی نے بھی داتا صاحب کے سن وفات پر فاضلانہ بحث کی ہے وہ بھی ۴۶۵ھ پر متفق نہیں ہیں۔

[۱۱] انوار احمد چشتی، تحقیقات چشتی، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۱۲۵

[۱۲] مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، مطبوعہ لاہور ۱۲۸۲ھ، ص ۹۰۵

Marfat.com

صاحبِ فوائد الفواد کی تحریر سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ سید علی ہجویریؒ کے پیر حضرت ابو الفضل محمد بن حسن ختلیؒ نے انہیں اپنی حیات ہی میں حضرت حسین زنجانیؒ کی جگہ لینے کے لئے لاہور بھیج دیا تھا، حالانکہ کشف المحجوب میں حضرت علی ہجویریؒ کی یہ تحریر موجود ہے۔

آن روز کہ وی را وفات آمد بہ بیت الجن بود و آں دہی ست بہ سر عقبہ میان بانیا رود دمشق، سر بہ کنار من داشت[۱۳]	جس دن ان کا انتقال ہوا وہ بیت الجن میں تھے۔ یہ ایک گاؤں ہے جو عقبہ جانے والی سڑک پر دمشق کے قریب بانیا ندی کے کنارے واقع ہے۔ (وفات کے وقت) ان کا سر میرے زانو پر تھا۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیاء میں حضرت ابو الفضل محمد بن حسن ختلیؒ کا سالِ وفات ۴۵۳ھ تحریر کیا ہے[۱۴] پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب علامہ ذہبی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انھوں نے ۴۶۰ھ میں انتقال فرمایا تھا۔[۱۵] نور احمد چشتی کی روایت کے مطابق حضرت حسین زنجانیؒ ۵۵۷ھ میں لاہور تشریف لائے تھے،[۱۶]

---

[۱۳] سید علی ہجویریؒ، کشف المحجوب، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۱۷۳

[۱۴] غلام سرور لاہوری، خزینۃ الاصفیاء، ص ۸۸۵

[۱۵] پروفیسر عبدالرشید، دی لائف اینڈ ٹیچنگز آف حضرت داتا گنج بخشؒ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۲۵

[۱۶] تحقیقات چشتی، ص ۲۱۳

Marfat.com

یعنی حضرت ختلیؒ کی وفات کے ۱۰۴ یا ۹۷ سال بعد، اور ان کا انتقال بقول چشتی ۶۰۴ھ میں یعنی حضرت ختلیؒ کی وفات کے ۱۵۱ یا ۱۴۴ سال بعد ہوا تھا۔ اب کہیے کہ داتا گنج بخش متوفی ۴۶۹ھ حضرت حسین زنجانیؒ کی وفات پر لاہور میں کیونکر وارد ہوئے تھے۔

مولوی نور احمد چشتی نے بھی داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد کے متعلق وہی واقعہ نقل کیا ہے جو خواجہ حسن سجزی نے فوائد الفواد میں بیان کیا ہے۔ مولوی صاحب کو اتنی بھی ہوش نہیں رہتی کہ وہ اپنی کتاب میں داتا صاحبؒ کی وفات ۴۶۵ھ اور حضرت حسین زنجانیؒ کی ۶۰۴ھ لکھ کر پھر بھی داتا صاحبؒ کو حضرت زنجانیؒ کے جنازہ میں شریک کر دیتے ہیں۔[۱۷]

مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد کا قصہ من وعن وہی تحریر کیا ہے جو صاحب فوائد الفواد نے نقل کیا ہے۔ اس کے بعد مفتی صاحب نے داتا صاحبؒ کا سال وفات ۴۶۵ھ لکھا ہے اور حضرت حسین زنجانیؒ کا ۶۰۰ھ، اس کے باوجود انھوں نے حضرت داتا گنج بخشؒ کو حضرت حسین زنجانیؒ کے جنازہ میں شریک کر کے داخل ثواب کر دیا ہے۔

جب تحقیقات چشتی اور خزینۃ الاصفیا میں اس طرح کی بے سر و پا باتیں درج ہوں تو پھر ان پر کس طرح اعتماد کیا جائے ہمارے خیال میں داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد کے متعلق جو روائت فوائد الفواد میں درج ہے وہ صحیح نہیں۔ ہمیں تو وہ روائت الحاقی

---

[۱۷] ایضاً، ص ۱۸۹۔

Marfat.com

معلوم ہوتی ہے فوائد الفواد ہی کے ایک اندراج سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ رحمۃ اللہ علیہ نے کشف المحجوب کا بغور مطالعہ فرمایا تھا۔[۱۵] جہاں داتا گنج بخشؒ نے اپنی اس تالیف میں یہ درج فرمایا ہے کہ جب حضرت ختلیؒ کا بیت الجن میں انتقال ہوا تو ان کا سر میرے زانو پر تھا، حضرت نظام الدین اولیاؒ کی نظر سے یہ تحریر ضرور گزری ہو گی۔ اس لئے حضرت سلطان المشائخ ایسی بے تحقیق بات نہیں کہہ سکتے تھے کہ حضرت ختلیؒ نے انہیں حضرت زنجانیؒ کی جگہ لینے کے لئے لاہور بھیجا۔ وہ رات کے وقت لاہور پہنچے اور اگلی صبح حضرت زنجانیؒ کا جنازہ اٹھا۔

ان تمام حقائق کے پیش نظر یہ بات واضح ہے کہ حضرت ختلیؒ نے ۴۵۳ھ یا ۴۶۰ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کی وفات کے بعد حضرت ہجویریؒ لاہور تشریف لائے اور انھوں نے ۴۶۹ھ یا اس کے فوراً بعد انتقال فرمایا۔ حضرت ہجویریؒ کے انتقال کے ۱۱۲ برس بعد حضرت زنجانیؒ لاہور تشریف لائے اور انھوں نے یہاں ۴۳ یا ۴۷ سال قیام کے بعد ۶۰۰ھ یا ۶۰۴ھ میں وفات پائی۔

---

[۱۵] امیر حسن سجزی، فوائد الفواد۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۷۶

Marfat.com

دین الٰہی اور اس کا پس منظر

محمد اسلم

استاذ شعبۂ تاریخ ، پنجاب یونیورسٹی

دین الٰہی کی اصل حقیقت اور اس کا پس منظر معلوم ہو جانے کے بعد حضرت مجدد الف ثانی رحمۃاللہ علیہ کی تحریک اور ان کے کام کی اہمیت دہ چند ہو جاتی ہے - اس بنا پر کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک اہم اور حد درجہ وقیع دستاویز ہے اور تاریخ کے اساتذہ اور طلبا کے لئے تحقیق کا ایک معیار پیش کرتی ہے -

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

مدیر ''برہان،، دہلی

قیمت سات روپے پچاس پیسے

★

۱ - ندوۃالمصنفین ، ۹۵۰ این سمن‌آباد ، لاہور

۲ - آئینۂ ادب ، چوک مینار انارکلی ، لاہور

Marfat.com

دین الٰہی اور اس کا پس منظر

محمد اسلم

استاذ شعبۂ تاریخ ، پنجاب یونیورسٹی

دین الٰہی کی اصل حقیقت اور اس کا پس منظر معلوم ہو جانے کے بعد حضرت مجدد الف ثانی رحمۃاللہ علیہ کی تحریک اور ان کے کام کی اہمیت دہ چند ہو جاتی ہے - اس بنا پر کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک اہم اور حد درجہ وقیع دستاویز ہے اور تاریخ کے اساتذہ اور طلبا کے لئے تحقیق کا ایک معیار پیش کرتی ہے -

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

مدیر ''برہان،، دہلی

قیمت سات روپے پچاس پیسے

★

۱ - ندوۃالمصنفین ، ۹۵۰ این سمن‌آباد ، لاہور

۲ - آئینۂ ادب ، چوک مینار انارکلی ، لاہور

Marfat.com